کلیات

دشتِ قیس میں لیلیٰ

کشور ناہید

دشتِ قیس میں لیلیٰ

کشور ناہید

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4391 Kishwar Naheed
Dusht-e-Qais Main Laila / Kishwar Naheed.- Lahore : Sang - e - Meel Publications, 2001.
1311p.
1. Urdu Adab - Shairi.
I. Title.

2001.
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

Sang-e-Meel Publications
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

جواں مرگ اعجاز احمد کے نام

جو ہم ادیبوں کے تعلق کا سنگ میل تھا

ترتیب

حرفِ دگر

رمز و ایما کی روایتوں کا ایک انبار ہے کہ اس میں بیان کا خلوص اور بات کا اثر، دونوں گھٹ کر رہ گئے ہیں۔ اور جب یہ دیکھیں کہ جو کچھ شعر جیسے نازک اور مؤثر پیرائے میں کہا جا رہا ہے، اس کا مرکز کون ہے، مخاطب کون ہے اور اس کا مقصد کیا ہے، تو پھر اردو غزل کے معتدبہ سرمائے کے سلسلے میں بڑی مشکل پڑتی ہے۔

اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ غزل کا بڑا سرمایہ ان تعینات سے عاری ہے۔

غزل کی سی صنف کا تقاضا یہ ہے کہ تعینات کی آئینہ گری پورے وثوق اور ذمے داری سے کی جائے، کیونکہ غزل کے شعر کو ایک مخصوص معنی کے علاوہ معانی کے کچھ اور افق بھی چمکاتے ہوتے ہیں۔ اور یہ افق، بدلتے رہتے ہیں، کبھی ہر قاری کے ساتھ، کبھی زندگی کے نئے تقاضوں کے ساتھ، کبھی انسانی الجھنوں کے نئے نئے موقع محل کے ساتھ۔ اگر یہ نہ ہو تو غزل کے اشعار ہر ہر عہد میں زندہ نہ رہیں۔

اصل یہ ہے کہ ان تعینات کی حدیں تو نہیں، البتہ ان کا سیاق و سباق ضرور متعین ہو سکتا ہے، یعنی سمجھنے سمجھانے کی خاطر، یہ متعین ہو سکتا ہے کہ ان تعینات ما لہ، اور ما علیہ کیا ہے۔

پہلی بات تو ہے کہ غزل کا شاعر، شعورِ خویشتن سے بہرہ ور ہو، وہ جان سکتا ہو کہ مجھے، جو غزل کا شعر کہنا ہے تو کیوں اور کس لیے کہنا ہے، اور غزل کے جملہ سرمائے کے حوالے سے میری ذات کا تعین کیسے ہو سکتا ہے، دوسرا شعور، شعورِ دیگرے کا ہے،

اس شعور کے کئی پہلو ہیں ——————

یعنی اس شخص کی پہچان کہ جس کی بدولت، دل میں جذبات کا کوئی ہیجان برپا ہوا، ان جذبات نے ایک خاص نہج اختیار کی، اور ان جذبات نے، کچھ تجربات، کچھ واقعات، کچھ معاملات اور پھر کچھ محاکات کے جامے پہنے۔ رمز و ایما کی روایتوں میں یہ شعورِ دیگرے، جاناں اور غمِ جاناں میں محدود کر دیا جاتا ہے۔

لیکن وہ مسائل اور وہ معاملات جن سے زندگی اور زمانہ عبارت ہیں وہ سوچ، جو زندگی کے ورا اور ماورا کے بارے میں، ہر ہر قرن، انسان کی صنم گری کا محور اور مسجود رہی ہے، وہ بھی تو اسی شعورِ دیگرے کے اس نور، اس اُجالے میں جب تک اپنے آپ کو دیکھا نہ جائے، اپنی ذات کا کو[illegible]ہیں سکتا۔ ماحول و فضا، نسل و ثقافت کے یہی حوالے ہیں جن کے ذریعے، ذات کا تعین ہوتا ہے، اور ہم ایک خاص زمانے میں رس بس کر، اس میں سانس لے کر، اپنے سے پہلوں کی اور اپنے معاصروں کی اور غالباً اپنے سے بعد میں آنے والوں کے شعر میں ماضی، حال اور آئندہ کے کوئی افق روشن کر سکتے ہیں۔

یہ ساری بات اس لیے کہی گئی ہے کہ "لبِ گویا" کی جب پہلی چھاپ سامنے آئی تھی، تو یہ "شعورِ خویشتن" لگ بھگ ہر غزل میں موجود تھا —————— لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ یہ تمنا کا صرف ایک قدم ہے، اور تمنا اگر شعورِ خویشتن کی منزل کو جان لے، تو پھر اس کا کوئی دوسرا قدم بھی ہوتا ہے۔ غالب نے شعورِ خویشتن کی اسی منزل کو، اپنے لازوال شعر میں ناپ لیا تھا، اور اسے "دشتِ امکان" کی اصطلاح میں قید کر دیا تھا، پھر یہ فریاد بھی کی تھی کہ

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب

تمنا کا دوسرا قدم یہ ہے:

شاہدِ ثانی، شعورِ دیگرے
خویش را دیدن، بنورِ دیگرے!

یعنی یہ اپنے ادراک کا دوسرا مرحلہ ہے، یہ اپنی ذات کے علاوہ ایک پورے مرحلۂ ادراک کا احاطہ ہے کہ اس مرحلے میں اپنے وجود کے [illegible] ساتھ کسی ایک وۃ کی ہمراہی اور اس کی حضوری

کا احساس ہوتا ہے، کبھی وہ کوئی ہم نفس ہوتا ہے۔ ان معنوں میں ہم نفس کہ جس کی آرزو ہر صاحبِ معنی کو رہی ہے، کبھی کوئی دوست اور ہم سخن کبھی محبوب، کہ ان احساسات کا وہی مرکز ہے، اور یہ احساسات کی جتنی بھی وابستگی ہے، وہ اسی کی بدولت ہے۔

ایک اور سطح پر شعورِ دیگر سے کہ اس مرحلے میں وہ سارا زمانہ، سارا ماحول اور روحِ عصر شامل ہے وہ ساری فضا اور اس کے ذہنی میلانات اور ہیجانات احاطہ گیر ہیں جو شاعر کے زمانے میں موجود ہوتے ہیں اس کا تہذیبی ورثہ اور پس منظر بنتے ہیں، اس کی اخلاقی اور سوشل روایات کہلاتے ہیں اور اس کی زندگی مخصوص دائرہ عمل اور دوسری زندگیوں کے متقابل اس کے [illegible] سے عبارت ہیں۔

"لبِ گویا" کی اس دوسری چھاپ میں جو نئی غزلیں شامل ہیں، وہ اسی شاہد ثانی، اسی شعورِ دیگر کے چند دیگوں کا آئینہ ہیں۔ اب جو بات کہی جاتی ہے، اس کے لہجے میں زیادہ وثوق اور تیقن ہی نہیں، بلکہ معنی کی تہوں کے اعتبار سے لہجہ اور (الفاظ کا مجموعہ یعنی لغت) اختیار کیے جاتے ہیں۔
اسی لیے آپ دیکھیں گے ایک طرف شاعرانہ بیان اتنا سادہ ہے کہ:

وہ شخص جس کی آنکھ ہے بے رنگ، بے طلب
پہلے پہل ملا، تو بہت مہرباں لگا!

اور ساتھ ہی ساتھ ساری توجہ اس بات پر ہے کہ اپنے شعور اور دیگراں کے شعور کے سلسلے میں جو کچھ واردات ہیں جو کچھ بھی دیکھا اور جھیلا ہے، جو کچھ بھی تفکرات یا تردد ہیں جو کچھ بھی دل و ذہن پر منتقل ہوا ہے اس کے لیے ایک مخصوص پیرایہ اختیار کیا جائے۔

مخصوص پیرایہ ان معنوں میں یہ نئی غزلیں، اپنی پیشرو غزلوں کے حوالے سے محض تسلسل روایت ہی نہیں، اپنی پہلی روایات ہیں، مزعومات ہیں، اور اندازوں میں کئی طرح سے اضافہ کرتی ہیں۔ ایک وجہ تو صاف ظاہر ہے کہ اب اپنی ذات کا تعین، دیگراں کے سیاق و سباق میں ہو رہا ہے، اس لیے مضامین کا دائرہ اور دائرہ کار دونوں وسیع تر ہو گئے ہیں۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ شخص اور شاعر اور عورت (کہ وہ خویشتن سے موسوم تھے) کو اب اتنا خیال اپنا نہیں، جتنا دیگراں کی ذیل میں شمار ہونے والوں کا ہے۔ چنانچہ اب امیجری کا دائرہ وسیع تر ہے، لفظوں اور ترکیبوں کی تراش پر توجہ زیادہ ہے، لہجے میں گھلاوٹ ہی نہیں، تفکر بھی ہے اور دل سوزی بھی۔ کیونکہ بات کا رس، بات کی تہ اور تہ آرائشِ لہجے کا تفکر اور دل سوزی اسی وقت آتی ہے، جب صرف اپنا ہی نہیں، دوسروں کا خیال رکھنا پڑے اور بالخصوص یہ فکری فرض بھی ادا کرنا ہو، سرِ دلبراں کو حدیثِ دیگراں کے پیرائے میں کہنا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اب فریاد صرف اتنی ہی نہیں رہی کہ:
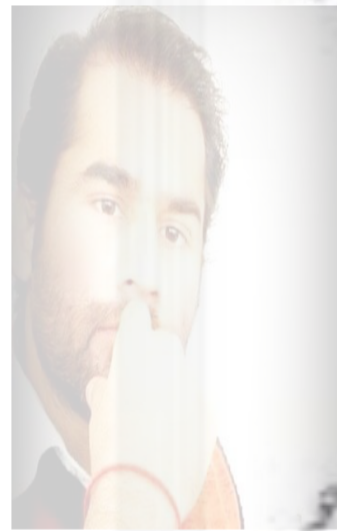
اہلِ دل آؤ سنو تو ہم بھی افسانہ کہیں
کچھ دہانِ زخم کھولیں، جورِ جاناں نہ کہیں

کی نئی نئی تہیں، ان غزلوں میں جلوہ گر ہوتی ہیں، مثلاً:

چشم سنگ آلود کو بھی واقفِ دید و شنید
جنگلوں سے جھانکتی پانی کی عریانی کرے

اندیشہ ہائے گفتنی، ناگفتنی کے بیچ
ہنستے ہیں جام قحطِ قدح خوار دیکھ کر

ہجومِ عکس میں چہرے تلاش کیسے کریں
ہر ایک شکل، اساسِ خلا نکلتی ہے

بیکار، شرحِ لفظ و معانی سے فائدہ
جب تو نہیں تو شہر میں تجھ سا کہاں سے آئے

آگہی کی ان راہوں سے کئی راہیں نکلتی ہیں، یہ شاعر کی شخصیت اور اس کے سرمایۂ فکر کی راہیں

ہیں لیکن بات اتنی ہی نہیں ہے، ان غزلوں کے تفکر اور تشخص پر، خود شناسی کے لیے ریاضت کی ایسی فضا چھائی ہے جس کا سرنامہ یہ ہے:

بہ وصولِ مقصدِ عافیت، نہ دلیل جُو، نہ عصا طلب
تو ز اشک آں ہمہ کم نۂ، قدمے ز آبلہ پا، طلب

مختار صدیقی

لبِ گویا

عمر در شعر بسر کردہ و در باختہ ام
عمر در باختہ را، بارِ دگر باختہ ام
عرفی

نہ کوئی ربط بجُز خامشی و نفرت کے
ملیں گے اب تو خلا سے یہی محبّت کے

مَیں قیدِ جسم میں رُسوا، تُو قید میں میری
بدن پہ داغ لیے قیدِ بے صعوبت کے

عجیب بات گریباں پہ ہاتھ اُن کا ہے
جو توشہ گیرِ تمنّا تھے حرفِ غیرت کے

بس اب تو حرفِ ندامت کو ثبتِ دائم دے
صبا صفت تھے رسالے غمِ محبّت کے

دُعا سے تزکیۂ نفس تک سفر ہے بہت
لباس بدلو گے کتنے بھی اب ضرورت کے

سیہ، سفید کے مالک کو فرقِ رنگ سے کیا
پڑے نہ اس پہ بھی صدمے کبھی ہزیمت کے

زمام کارِ جہاں کس کے ہاتھ ہے یارب
بدل گئے ہیں تقاضے بھی آدمیت کے

زمانہ درپئے آزار ہے تو کیا ناہید
بکھرتے آئے ہیں موتی سدا مشقت کے

✺

سنبھل ہی لیں گے، مسلسل تباہ ہوں توسہی
عذابِ زیست میں رشکِ گناہ ہوں توسہی

کہیں تو ساحلِ نایافت کا نشاں ہوگا
جَلا کے خود کو تقاضائے آہ ہوں توسہی

مجال کیا کہ نہ منزل بنے نشانِ وفا
سفیر خود نگراں، گردِ راہ ہوں توسہی

صدا بدشت بنے گی نہ یہ لہُو کی تپش
لہُو کے چھینٹے مگر گاہ گاہ ہوں توسہی
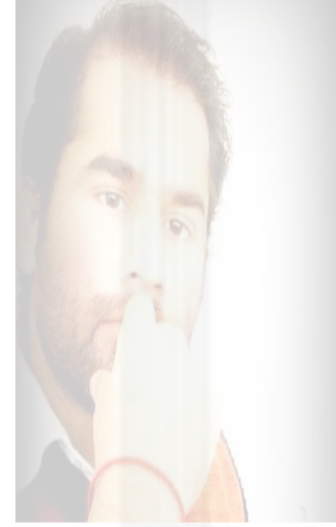
ہے رات کھولے ہوئے بالِ دلفگار کہ اب
طلوعِ صُبح کے آثارِ راہ ہوں تو سہی

خود اپنے عکس سے نالاں پھریں گے یہ خود بیں
فریب و مکر، مجسّم پناہ ہوں تو سہی

یہ خود فریبیٔ احساس دلبری ہے سُراب
مقامِ حشر ہو، باہم گواہ ہوں تو سہی

❋

اپنے لہُو سے نام لکھا، غیر کا بھی دیکھ
زندہ ہے تو شقاوتِ دشتِ بلا بھی دیکھ

آنکھوں کے آئینوں کا تو پانی اُتر گیا
اب جسمِ چوبِ خشک ہے یہ سانحہ بھی دیکھ

ہوتی ہے زندگی کی حرارت رگوں میں سرد
سُوکھے ہُوئے بدن پہ یہ چمڑا کسا بھی دیکھ

بے تابیوں کو سینے کے اندر سمیٹ لے
فتنے کو اپنی حد سے مسلسل بڑھا بھی دیکھ

ہر ذرّہ عبرتوں کے سمندر کی شکل ہے
صحرا نوردِ شوق کبھی نقشِ پا بھی دیکھ

پہچان اپنی ہو تو ملے منزلِ مُراد
ناہید گاہے گاہے سہی، آئینہ بھی دیکھ

✻

ٹھہرے تو ہر سفر، سفرِ رائیگاں لگا
ہر اختیار، حاصلِ وہم و گماں لگا

رنجِ طلب کی کوئی نشانی نہ بن سکی
ہر رشتۂ اُمید بھی آشوبِ جاں لگا

پھیلا کچھ اس طرح شفقِ شام کا فسوں
پُر ہول دشت، قریۂ بے آسماں لگا

آنکھوں میں سوئی خواہشیں جاگیں تو جسم بھی
ساکت سمندروں پہ کھُلا بادباں لگا

وہ شخص جس کی آنکھ ہے بے رنگ بے طلب
پہلے پہل ملا تو بہت مہرباں لگا

دیکھا اسے تو اپنی گلی بھی بھلی لگی
بے رنگ آئینوں کا سماں ارغواں لگا

اونچی چھتوں کے شوق نے توڑا فسونِ شوق
خاکستری زمیں کی طرح آسماں لگا

خواہش سکوں کی شوقِ جراحت مسل گئی
ہر شخص آئینے کی طرح بے زباں لگا

✻

صلیبِ درد، سخن دارِ جستجو بھی ہو
نگہ اُٹھے تو کوئی میرے رُوبرو بھی ہو

دلوں کا عقدہ کسی طور تو کھلے ہم پر
تعلقِ غمِ جاں، واقفِ عدو بھی ہو

چراغِ بزمِ شبِ ایجاد بجھ ہی جائے گا
دریدہ پیرہنی، واقفِ لہو بھی ہو

کبھی سفر تو کریں اپنی سمت دیوانے
یہ موجِ ساحلِ پایاب تُند خو بھی ہو

حساب لے مرا ہمزاد، قرضِ ناخن کا
پلٹ کے دیکھوں تو خود سے ہی گفتگو بھی ہو

مجالِ آئینہ، تابِ حریف پہچانے
ہو ہم کلامی خود ایسے جیسے تو بھی ہو

سروں پہ اوندھے توے کی طرح فلک وجود
کوئی الٹ کے یہ ترتیب سُرخرُو بھی ہو

خدا کرے کہ مرا لختِ دل جواں ہو کر
مزاجِ دہر سے واقف ہو جستجو بھی ہو

❁

دِل بجھ گیا ہے زِشت کو مختار دیکھ کر
لب سِل گئے سلاسِلِ اظہار دیکھ کر

شعلہ ہے دل تو جل بھی بجھے، سرد بھی تو ہو
پھونکے ہمیں نہ رونقِ عیّار دیکھ کر

رُکتی ہے سانس، قدغنِ اظہار کے سبب
بڑھتے ہیں دام، شوقِ خریدار دیکھ کر

اندیشہ ہائے گفتنی، ناگفتنی کے بیچ
ہنستے ہیں جام قحطِ قدح خوار دیکھ کر

لرزو نہ پانیوں میں پڑے عکس کی طرح
پیچھے ہٹو نہ سطوتِ آزار دیکھ کر

حدّتِ جوشش و طلب چہروں کی ویرانی کرے
خوف سے مبہوت، آنکھوں کی یزدانی کرے

حرف کی زنجیر میں بھی اب کھنک باقی نہیں
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

آنکھ کی پتلی میں ٹھہرے پانیوں کی بُو نہ ہو
یہ ستم ایجادِ حسرت، جلوہ سامانی کرے

رفتگاں کی یاد، منزل کے دلاسے کتنی دیر
کب تلک خوابِ وفا، جذبوں کی مہمانی کرے

آسماں کا زہر، تپتی دھوپ کی صورت بہے
خون کی کالی نسوں میں شعلہ سامانی کرے

چشمِ سنگ آلود کو بھی واقفِ دید و شنید
جنگلوں سے جھانکتی پانی کی عُریانی کرے

مثلِ برگِ خشک ہے آسیب آسا زندگی
اس طرح کوئی نہ جوشش و خوں کی اڑانی کرے

چمن کے پیرہنِ گُل صبا نکلتی ہے
سیاہیوں کے جگر سے ضیا نکلتی ہے

کبھی تو مجھ کو بھی احساسِ آشنائی دے
وہ روشنی جو کفِ گُل پہ جا نکلتی ہے

میں آنکھ بند کروں تو بھی ہے وُہی منظر
وہ ایک شکل ہر اک رہ پہ آ نکلتی ہے

سرابِ فہم سے آگے کہیں ہے بحرِ مُراد
ہر ایک منزلِ دل نقشِ پا نکلتی ہے

کبھی جو کھُل کے کروں بات اپنے آپ سے میں
ہر ایک آرزو غمِ آشنا نکلتی ہے

ہجومِ عکس میں چہرہ تلاش کیسے کریں
ہر ایک شکل اساسِ خلا نکلتی ہے

سرک رہے ہیں اندھیرے ہر ایک بستی سے
عذابِ ابر سے قرصِ وفا نکلتی ہے

مرے یقیں کی گھٹن اور بھی بڑھے ناہید
ہوا ہو بند تو موجِ بلا نکلتی ہے

بیمار ہیں تو اب دمِ عیسیٰ کہاں سے آئے
اُس دل میں دردِ شوق و تمنا کہاں سے آئے

بیکار شرحِ لفظ و معانی سے فائدہ
جب تُو نہیں تو شہر میں تجھ سا کہاں سے آئے

ہر چشمِ سنگِ کذب و عداوت سے سُرخ ہے
اب آدمی کو زندگی کرنا کہاں سے آئے

وحشت ہوس کی چاٹ گئی خاکِ جسم کو
بے در گھروں میں شکل کا سایہ کہاں سے آئے

جڑ سے اُکھڑ گئے تو بدلتی رُتوں سے کیا
بے آب آئینوں میں سراپا کہاں سے آئے

سایوں پہ اعتماد سے اکتا گیا ہے جی
طوفاں میں زندگی کا بھروسہ کہاں سے آئے

غم کے تھپیڑے لے گئے ناگن سے لمبے بال
راتوں میں جنگلوں کا وہ سایہ کہاں سے آئے

ناہید فیشنوں نے چھپائے ہیں عیب بھی
چشمے نہ ہوں تو آنکھ کا پردا کہاں سے آئے

سُرخی بدن میں رنگِ وفا کی تھی کچھ دنوں
تاثیر یہ بھی اُس کی دُعا کی تھی کچھ دنوں

ڈھونڈے سے اس کے نقش اُلجھتے تھے اور بھی
حالت تمام کرب و بلا کی تھی کچھ دنوں

کاغذ پہ تھا لکھا ہُوا ہر حرف، لب کُشا
تحریر، جسم، صوت و ادا کی تھی کچھ دنوں

شاخوں پہ کونپلوں کو زبانیں عطا ہُوئیں
یہ دلبری بھی دستِ صبا کی تھی کچھ دنوں

دِل سوزیٔ وفا کو شکیبائی کی عطا
شائستگی یہ رنگِ حنا کی تھی کچھ دنوں

اب ہے کدُورتوں کا کھُلا دشت اور مَیں
چاہت تمام تیری رضا کی تھی کچھ دنوں

کیفیتِ نشاط تھی خود ہی سے گفتگو
ناہید یہ رِدا بھی حیا کی تھی کچھ دنوں

✺

ہنستے چہروں کو بھی ڈس جاتی ہے اُلجھن کیسے
دیکھ لو ہو گئے ویراں، بھرے آنگن کیسے

موسمِ برگِ خزاں آئینہ دکھلاتا ہے
راکھ ہو جاتا ہے، ہر جسم کا ایندھن کیسے

پارۂ ابر سے سُورج کی کرن رُکتی نہیں
شوقِ بیتاب کو روکے گی یہ چلمن کیسے

آتے جاتے ہوئے بادل سے تو سایہ نہ بنے
کوئی ٹھہرے نہ تو چمکے بھلا آنگن کیسے

قہقہے، ضبط کی دیوار پر گُلکاری ہیں
داغ رکھے ہیں چھپا کے تہِ دامن کیسے

جب ٹھہرتا ہی نہیں، رنگ نہ موسم کوئی
عمر بھر کے لیے رکھیے بھی تو بندھن کیسے

دیکھ کے آئینہ ناہیدؔ یقین آتا ہے
حدتِ رنگ سے جل جاتے ہیں گلشن کیسے

✺

غموں کی جلتی چتا تھیں جوانیاں اپنی
بزعمِ خویش تھیں تازہ کہانیاں اپنی

خمارِ شوق نہ تھا شب کے گنبدوں پہ رقم
نژادِ شبنم و گُل تھیں نشانیاں اپنی

ملے جو تم سے مُلاقات ہو گئی خود سے
ستیزِ عجز تھیں، شعلہ فشانیاں اپنی

ہر ایک لفظ تھا منسوب جو کسی نے کہا
نہ کام آئیں کبھی بے زبانیاں اپنی

خمارِ رنج سے آتش زدہ تھے گیسو بھی
زوالِ شوق کی تھیں بدگمانیاں اپنی

یہ زعم تھا کہ چھپا لیں گے حالِ دل اس سے
ملے تو روئے، سنائیں کہانیاں اپنی

کہیں چراغ، کہیں گُل، کہیں پہ زُلف دوتا
تری گلی میں تھیں طُرفہ نشانیاں اپنی

وہ روشنی ہو، اماوس کی رات گھبرائے
ملا دو خاک میں ایسے جوانیاں اپنی

٭

سب شکلوں کی ایک ہی صورت، سب باتوں کا ایک ہی رنگ
دن رنگوں کے چولے بدلے پر راتوں کا ایک ہی رنگ

ہر آہٹ، ہر سایہ آخر ذہن کا پاگل پن نکلا
قریہ قریہ ویرانی ہے سب گھاتوں کا ایک ہی رنگ

خُون میں شُعلۂ غم کی حدت جسم میں چُھپ کر رہ نہ سکے
آنکھ سے ٹپکے لہُو کی صُورت، سوغاتوں کا ایک ہی رنگ

دو سائے جب آگے سرکیں، ایک ہی سایہ رہ جاتا ہے
سات رنگ سے دھنک بنے ہے برساتوں کا ایک ہی رنگ

میرے اندر کی تنہائی، میری ذات کا دُہرا پن
دیمک بن کر چاٹ رہا ہے، سب ذاتوں کا ایک ہی رنگ

دُھوپ چڑھی تو سونا چمکا، دُھوپ ڈھلی تو سرسوں بھتی
ہر اِک جانب جم گئی کائی، برساتوں کا ایک ہی رنگ

گھاس اُگی اس پگڈنڈی پر جس سے گزُر کے ہم مِلتے تھے
کُنجِ اماں بھی سڑکیں بن گئیں، سب ماتوں کا ایک ہی رنگ

ہنستے چہروں کی آنکھوں میں خُون جما ہے یادوں کا
سب شکلیں ہیں مُجملۂ حسرت باراتوں کا ایک ہی رنگ

حوصلہ ، شرطِ وفا ، کیا کرنا
بند مٹھی میں ہوا ، کیا کرنا

جب نہ سنتا ہو کوئی ، بولنا کیا
قبر میں شور بپا ، کیا کرنا

قہر ہے لطف کی صورت آباد
اپنی آنکھوں کو بھی وا ، کیا کرنا

درد ٹھہرے گا وفا کی منزل
عکس شیشے سے جدا ، کیا کرنا

شمعِ کشتہ کی طرح جی لیجے
دم گھٹے بھی تو گلہ کیا کرنا

دل کے زنداں میں ہے آرام بہت
وسعتِ دشت نما کیا کرنا

میرے پیچھے مرا سایہ ہوگا
پیچھے مڑ کر بھی بھلا کیا کرنا

کچھ کرو یوں کہ زمانہ دیکھے
شور گلیوں میں سدا کیا کرنا

حُسنِ دُنیا ہے خیالوں کا صدف
رنگ بھی آنکھ کا پردا ہی ہُوا

ہر ستم ہنس کے سہا ہے ناہید
دل بھی پتّھر کا نمونہ ہی ہُوا

✺

کُچھ نہ کہنے کا بھی چرچا ہی ہُوا
غم تعلق کا تماشا ہی ہُوا

ہر طلب ذِلتِ خود داری تھی
تم نہ تھے ساتھ، یہ اچھا ہی ہُوا

لوگ مل مل کے بچھڑ جاتے ہیں
ہمسفر ٹوٹتا پتّا ہی ہُوا

جب نہ آنکھوں سے لہُو بھی ٹپکے
درد ٹھہرا ہُوا دریا ہی ہُوا

✱

ہر قدم پر سائے ہیں، رنگت بھرو
ہر طلب کشکول ہے، چاہت بھرو

کب تلک لپٹو گے دیواروں کے ساتھ
قعرِ دل میں اک نئی وحشت بھرو

آنکھ رکھو رتجگوں سے آشنا
گود میں خُوں چاٹتی خلوت بھرو

مسخ ہیں چہرے، زباں خُوں آشنا
کاسۂ تعبیر میں حسرت بھرو

لاکھ ہو بیزاریٔ خود آگہی
اپنی بربادی میں بھی رنگت بھرو

بے سبب اچھی نہیں تشہیرِ غم
یُوں نہ آنکھوں میں مَئے حسرت بھرو

میرے ہنسنے پر نہ جاؤ دل زدو!
میرا چہرہ دیکھ کر رنگت بھرو

کچھ بول، گفتگو کا سلیقہ نہ بھول جائے
شیشے کے گھر میں تجھ کو بھی رہنا نہ بھول جائے

وا رکھ سدا دریچۂ خود آگہی کہ تو
اچھے تو کیا بروں کو پرکھنا نہ بھول جائے

زخمِ نہاں کو شوقِ طلب سے جدا نہ کر
ہوتا ہے روز و شب جو تماشا نہ بھول جائے

کر دیں نہ بے طلب یہ مسلسل اذیتیں
دل بھی کہیں وفا کا سلیقہ نہ بھول جائے

منزل کا نشہ، قربتِ منزل نہ چھین لے
اپنی گلی میں آکے ہی رستہ نہ بھول جائے
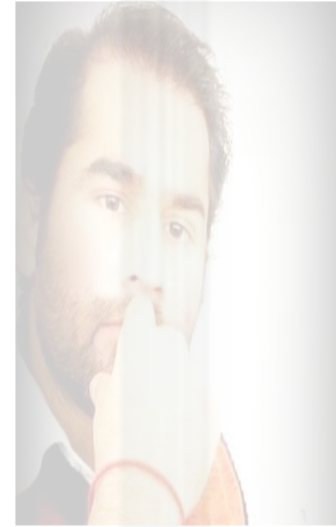
مت رکھ تضادِ ظاہر و باطن کہ آدمی
تجھ کو ترے عمل سے پرکھنا نہ بھول جائے

وہ بھیڑ ہے کہ شہر میں چلنا محال ہے
انگلی پکڑنا باپ کی بچہ نہ بھول جائے

ناہید، رفعتیں تو ملیں گی بہت مگر
آنکھوں کو اپنے شہر کا نقشہ نہ بھول جائے

یہ میری ذات تو مجھ میں سما کے رہ نہ سکے
وہ دشت ہُوں کہ سمندر چھپا کے رہ نہ سکے

وفورِ تشنہ لبی، خوں بھی سرد کر کے رہے
ہُوا ہے بند، کوئی گھر میں آ کے رہ نہ سکے

ہزار خواب کے پیوند، گفتگو کے طلسم
غموں کے زہر کو امرت بنا کے رہ نہ سکے

عذابِ نفس سے جُھلسا ہُوا ہے ہر پیکر
وہ آگ ہے کوئی دامن بچا کے رہ نہ سکے

زباں سِلی ہے تو آنکھوں سے گفتگو کر لے
جو غم کا زہر رگوں میں چھپا کے رہ نہ سکے

کبھی نظر تو آ، تسکینِ اضطراب تو دے
مری کُھلی ہُوئی آنکھوں کو کوئی خواب تو دے

جواز ڈھونڈ نہ برسوں کی رنجشوں کا مگر
قریب آ کے تماشائے اجتناب تو دے

کبھی تو سنگِ صدا توڑ دے سکوتِ وفا
کبھی وہ خواب میں آ کر دمِ سراب تو دے

مَیں زخمِ تشنہ لبی سے لپٹ کے رولوں گی
نہ دے سکونِ وفا، قہرِ اضطراب تو دے

نہ چھین ہم سے ہی یک گونہ لذتِ تدبیر
نسیمِ مسندِ گل، عرصۂ حباب تو دے

بچھڑ کے ملنے میں لذت سہی مگر ناہید
کبھی تو وصلِ مسلسل کا ہی عذاب تو دے

✺

آنکھ میں رات کے منظر ٹھہرے
راکھ میں جیسے گُلِ زر ٹھہرے

فتنہ ساماں دلِ کم خوش ہوگا
وہ ستمگر کبھی دم بھر ٹھہرے

جانکنی، زادِ سفر گردا تو
رہزنی، شوخیٔ رہبر ٹھہرے

ہم طلب کس کی کریں کیسے کریں
کنکری قیمتِ جوہر ٹھہرے

دستکوں پر نگراں ہو ہر سانس
سلوٹوں سے مرا بستر ٹھہرے

ہر قدم پر نئی تعزیریں ہیں
کوئی بھی گھر سے نہ باہر ٹھہرے

مَیں کہ ہوں شوخ طبیعت ناہید
کتنے طوفاں مرے اندر ٹھہرے

٭

اُترا غبارِ درد و الم مُدتوں کے بعد
آئی ہے موجِ بادِ کرم مُدتوں کے بعد

پھر دل کو ہوگئی ہے وہی رہگزر عزیز
پھر آگئے فریب میں ہم مُدتوں کے بعد

پھیلی ہے سطحِ ذہن پہ ہلکی سی چاندنی
پلٹے ہیں تیری یاد سے ہم مُدتوں کے بعد

دل میں رکھیں کہ سر سے لگائیں کہ چوم لیں
دیکھا ہے ایک نقشِ قدم مُدتوں کے بعد
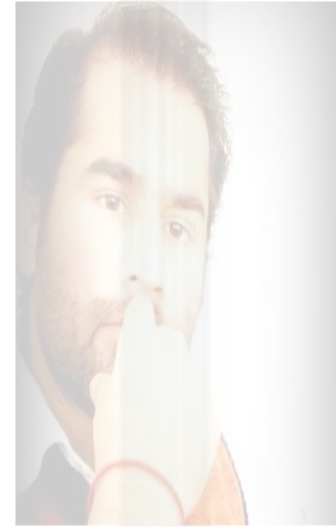
ہم تو وفا شعار رہے ہیں تمام عمر
تم نے جفا بھی کی تو ستم مدتوں کے بعد

ناہید خونِ دل میں قلم کو ڈبو کے آج
لکھی ہے داستانِ الم مدتوں کے بعد

✺

تشنگی اچھی نہیں رکھنا بہت
روزنِ گُل سے اُسے تکنا بہت

دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہت
سر کو اُس کے سامنے ڈھکنا بہت

خوب ہے آرائشِ غم کا سفر
خوش نہیں پر تلخیاں رکھتا بہت

جس کی آنکھوں میں نہ جھانکا جائے گا
اس کی ہی تحریر کو پڑھنا بہت

عمر بھر کی بندشیں خواب و خیال
دو قدم بھی ساتھ ہے چلنا بہت

موجۂ ریگِ رواں ہے زیرِ آب
اپنی ہستی دیکھ کر بڑھنا بہت

زرد رُو تنہائیوں کے شہر میں
بجھتے دیپوں کی طرح جلنا بہت

گھر کے اندر کاٹتی ہے تیرگی
گھر سے باہر رہ کے بھی ڈرنا بہت

برف کی مانند جینا عمر بھر
ریت کی صورت مگر تپنا بہت

خستگی ناپید بن جائے نہ جرم
کچھ نہ ہو لیکن بھرم رکھنا بہت

خیالِ طوقِ تعلق کو ٹالتے رہیے
ہوا میں کوئی ہیولا اُچھالتے رہیے

پرانے آشنا چہروں کو یاد کر کر کے
ہجوم غم میں بھی دل کو سنبھالتے رہیے

تمام عمر یونہی کیجے حسرتوں کا شمار
تمام عمر یونہی دکھ سنبھالتے رہیے

سجا کے روز نئی محفلیں، نئے چہرے
زرِ فسردہ دلی کو اچھالتے رہیے

رہیں نہ دشت جو صحرا نوردیوں کے لیے
تو اپنے صحن میں پتھر اُچھالتے رہیے

نہ مل سکیں جو وہ یارانِ گُل صفت ناہید
تو اپنے آپ کو سانچوں میں ڈھالتے رہیے

✺

خوشبو کو رنگتوں پہ اُبھرتا ہُوا بھی دیکھ
نقشِ زرِ بہار چمکتا ہُوا بھی دیکھ

رکھ کے مدارِ شوق کسی آفتاب پر
تُو، سنگِ انتظار پگھلتا ہُوا بھی دیکھ

آنکھوں کے گرد جھانکتے حلقے نہ دیکھ تو
سَیلِ خجستہ خُو کو اُترتا ہُوا بھی دیکھ

بے فیض دشتِ درد میں آہستگی کے ساتھ
آہُو سرشت لوگوں کو چلتا ہُوا بھی دیکھ

رنگِ حنا کو نقشِ قدم سے جُدا بھی کر
صحرا میں رخشِ شوق کو گرتا ہُوا بھی دیکھ
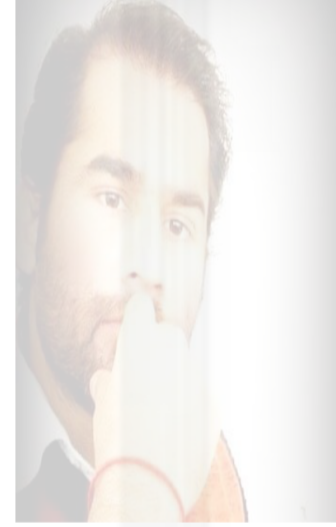
محسوس کر چھلکتے ہوئے شوق کی جلن
یخ چاندنی میں جسم کو جلتا ہُوا بھی دیکھ

ہر چیز دے کے جاتی ہے اپنی نشانیاں
ہر گُل میں رنگِ صبح جھلکتا ہُوا بھی دیکھ

ناہید چہرہ دستیٔ یاراں عزیز رکھ
موقع کے ساتھ اُن کو بدلتا ہُوا بھی دیکھ

✹

بیٹھی ہوں راہ میں کسی تصویر کی طرح
وہ بھی کبھی تو آئے گا رہگیر کی طرح

چلتے ہیں بے سبب کہ کوئی روکتا نہیں
تخریبِ خواہشات ہے تعمیر کی طرح

آنکھوں میں ہے سوادِ تمنا کی داستاں
ریگِ رواں ہے موجۂ تنویر کی طرح

گر تُو نہیں تو تیری شباہت کہیں تو ہو
پڑھتی ہوں ہر نظر تری تحریر کی طرح

ملتی نہیں ہے قیدِ وفا سے رہائی بھی
اٹکی ہے سانس سینے میں زنجیر کی طرح

بھرتے ہیں جو شریکِ سفر ہمرہی کا دم
چلتے ہیں ساتھ ساتھ عناں گیر کی طرح

ناہید اپنے اپنے سلیقے کی بات ہے
کرتے ہیں وہ کرم بھی تو تعزیر کی طرح

✺

سُلگ رہی ہے ان آنکھوں میں دیکھنے کی لگن
ترے فراق کی شدّت سے پھُنک رہا ہے بدن

یہ شورِ بند و سلاسل، یہ ذکرِ دار و رسن
بدل سکے نہ کبھی خُوگرِ وفا کا چلن

یہ چارہ ساز، یہ واعظ، یہ ناصحِ مشفق
ملا نہ ان کی خُدائی میں اہلِ دل کو کفن

تمہارے درد کے مارے تمہیں سے کیا کہتے
کہ ٹوٹتا ہے جُدائی میں کس طرح سے بدن

جہاں بھی عشق نے ڈالی ہے آرزو کی کمند
وہیں پڑی ہے جبینِ ہوس پہ اور شکن

نئے مگر، دلِ خوش فہم کے طریقے ہیں
ہنسا ہے جب بھی ہُوا ہے وفورِ رنج و محن

نظر میں آج بھی پھیلا ہُوا ہے دُور تلک
وہ بہتا نیلا سمندر وہ ہنستا نیل گگن

کبھی تو جھانکیے اُس خواہشوں کے پیکر میں
ہجومِ رنگ سے جنگل بنا ہُوا ہے چمن

حیا سے سُرخ ہُوا رنگ، تو کھلے گُل بھی
دکھا گئی تری صُورت حجاب کی چلمن

سُنی ہے ایک زمانے کے بعد سرگوشی
مہک اٹھی ہے تمنا، چمک اٹھی دھڑکن

کھلونا ٹوٹتے دیکھوں تو آنکھ بھر آئے
ابھی تلک نہیں بھُولی ہے زندگی بچپن

---

*

شمیمِ صبح سے میرے بدن کی آنچ نہ پُوچھ
صباحتِ چمن اندر چمن کی آنچ نہ پُوچھ[1]

تمام عمر رہے خشت کوبیِ جاں میں
تمام عمر، سفالِ دہن کی آنچ نہ پُوچھ

شفق کے رنگ میں ڈوبے ہیں دشت و صحرا بھی
چمن میں شعلہ رُخانِ چمن کی آنچ نہ پُوچھ

ابھی تلک مرے کانوں پہ آگ رقصاں ہے
ابھی تلک ہے اسی انجمن کی آنچ نہ پُوچھ

1۔ مصحفی
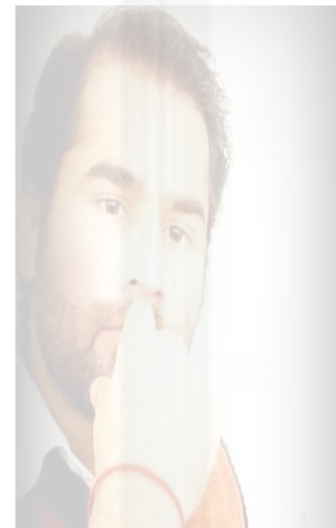
اندھیری رات عزیزوں کے غم سے روشن ہے
غریبِ شہر سے سوزِ وطن کی آنچ نہ پُوچھ

کریدتا ہے تعلق کی گرم بھوبھل کو
بدن سے چمٹے ہُوئے پیرہن کی آنچ نہ پُوچھ

ہر ایک آنکھ بُلاوا ہے اُڑتے لمحوں کا
عروسِ حجلۂ غم، انجمن کی آنچ نہ پُوچھ

---

*

ضبط اتنا بھی نہ کر، احساس مُرجھا جائے گا
سُرخ گالوں کا چمکتا رنگ زردا جائے گا

مَیں کبھی جذبہ، کبھی وعدہ، کبھی خمیازہ ہُوں
تُو مرے وجہِ تعلق سے نکھرتا جائے گا

رُوح بھی تشنہ رہے گی ریگِ ساحل کی طرح
جسم بھی شوقِ تعلق میں اُجڑتا جائے گا

تشنۂ گریہ ہُوں مُدت سے، تماشا ہُوں ترا
تُو کہاں تک اپنے سائے سے اُلجھتا جائے گا

اَن گنت لوگوں کی چاہت نے اسے دُھندلا دیا
وہ کہاں تک اپنی صُورت کو بدلتا جائے گا

برف آنکھوں پر کوئی حِدّت اثر کرتی نہیں
ہاں مگر ہر فردِ غم سے دل پگھلتا جائے گا

شامِ غم جس سے ملو، پہروں وہ یاد آئے گا پھر
ہاں مگر کُچھ دن میں وہ چہرہ بھی دُھندلا جائے گا

ڈھیر ہو جائے گا سُورج ایک دن جل جل کے آپ
چاند پتّوں کی طرح آخر کو مُرجھا جائے گا

مَیں تری خُوئے تلوّن کے کھُلے صحرا میں ہوں
مُجھ سے ہی کب تیرے گھر کا رستہ ڈھونڈا جائے گا

زعم ہے اس سے بچھڑ کر، بھُول جائیں گے اسے
کب مگر اپنی طبیعت ہی کو بدلا جائے گا

رنگ دکھلائے گا کچھ، آخر شکستوں کا شمار
ہونٹ سی لو گی تو آنکھوں میں اُبھرتا جائے گا

اندمالِ غم بھی ہے ناہید طرحِ تازہ غم
تشنگی جتنی بڑھے، شعلہ بھڑکتا جائے گا

میں نظر آؤں ہر اک سمت جدھر سے چاہوں
یہ گواہی میں ہر اک آئینہ گر سے چاہوں

میں ترا رنگ ہر اک مطلعِ در سے مانگوں
میں ترا سایہ ہر اک رہگزر سے چاہوں

صحبتیں خوب ہیں خوش وقتیِ غم کی خاطر
کوئی ایسا ہو جسے جان و جگر سے چاہوں

میں بدل ڈالوں وفاؤں کی جنوں سامانی
میں اُسے چاہوں تو خود اپنی خبر سے چاہوں

آنکھ جب تک ہے نظارے کی طلب ہے باقی،
تیری خوشبو کو میں کس ذوقِ نظر سے چاہوں

گھر کے دھندے کہ نمٹتے ہی نہیں ہیں ناہید
میں نکلنا بھی اگر شام کو گھر سے چاہوں

کبھی تو آ مری آنکھوں کی روشنی بن کر
زمینِ خشک کو سیراب کر نمی بن کر

رچا ہُوا ہے تری کم نگاہیوں کا کرم
نشے کی طرح مرے دل میں سرخوشی بن کر

کبھی تو آ تپشِ جاں گسل ہی دینے کو
کبھی گزر انہی راہوں سے اجنبی بن کر

خوشا کہ اور بلا غم کا تازیانہ نہیں
خوشا وہ درد جو چھایا ہے نغمگی بن کر

تمہیں عزیز نہیں ہے تو ہو عزیز کسے
نہ مل سکے گا کوئی وجہِ زندگی بن کر

پلٹ کے دیکھ نہ اس کو وہ خاک کر دے گا
ترے غرور کو زہراب کی انی بن کر

ہُوئی نہ ان سے وفا تم سے کیا ہُوا ناہید
ابھی تلک جیے جاتی ہو باولی بن کر

دب نہ رہیں آلام تلے ، صبر کرو
آگ بجھاتے دیر لگے ، صبر کرو

بن دیکھے بھی سامنے اس کی صورت ہے
بن بولے بھی بات بڑھے ، صبر کرو

زلفِ تمنا کھنچتی گئی ، پُر پیچ ہوئی
شانۂ تسکیں خواب رہے ، صبر کرو

کب پھر بولیں پتھر بھی اس وادی کے
کب پھر رات کا ایک بجے ، صبر کرو

پھر رکھے گا ہاتھ تمہاری آنکھوں پر
پھر آئے گا پاؤں دبے ، صبر کرو

تھمتے تھمتے اشک تھمیں، دل ٹھہرے
ڈوبتی ناؤ پار لگے ، صبر کرو

پچھلی رات وہ آئے گا مغموم نہ ہو
پو نہ پھٹے گی ایسے سمے، صبر کرو

جی بھر کر کب دیکھ سکو گے تم اس کو
آ جاؤ گے پاؤں تلے ، صبر کرو

تم بھی آخر چین کی نیندیں سوؤ گے
تم پر دن آئیں گے بھلے ، صبر کرو

یوں ہی رہو ناہید الجھتی کانٹوں سے
وقت کی ندی یوں ہی بہے ، صبر کرو

ہر مرحلہ پہ شوق تماشائی چاہے ہے
عشقِ نمود پیشہ بھی رسوائی چاہے ہے

گھُلنے لگا ہواؤں میں مایوسیوں کا زہر
پھر جی اُداس ہے وُہی پُروائی چاہے ہے

ڈھونڈے ہے اپنی ضد کے مقابل کی کوئی شے
شوقِ جنوں شعار تو رسوائی چاہے ہے

خوبی ہے لاکھ وصفِ تحمل شکیب و ضبط
لیکن نگارِ شوق پذیرائی چاہے ہے

یہ دل نہ چل سکا کبھی اُڑتی ہوا کے ساتھ
یہ دل تعلقات کی گہرائی چاہے ہے

جلوہ نہ ہو تو موجِ جنوں تیز کیسے ہو
آنکھیں نہ ہوں تو کون تماشائی چاہے ہے

وہ کون ہے جو ساتھ ہمارے بھی چل سکے
وہ کون ہے جو غم سے شناسائی چاہے ہے

رکھو تو زندگی میں شریکِ الم کوئی
ناہید، عرضِ حال بھی شنوائی چاہے ہے

اپنی ہی بات نبھانی سیکھو
پھر مجھی شمع جلانی سیکھو

مَل کے آنکھیں اُسے دیکھو پھر سے
بہتے دریا سے روانی سیکھو

اُس کو چاہو تو اُسی کو چاہو
پیار کی ریت نبھانی سیکھو

خواہشِ دید فروزاں رکھو
صبح تک شمع جلانی سیکھو

رمزِ خود سوختنی ، بے طلبی
ہر گُلِ تر کی زبانی سیکھو

یہ بھی کیا ایک خیال ، ایک ہی خواب
تم بھی تو نقلِ مکانی سیکھو

اُس کی باتیں ہی سہی، وہ نہ سہی
دولتِ درد بڑھانی سیکھو

اُس کی یادوں کے اُجالے لے کر
غم کی محراب سجانی سیکھو

عمر بھر ساتھ چلے گا نہ کوئی
وقت کے ساتھ نبھانی سیکھو

ہر تمنّا کو بدل کر دیکھو
کچھ محبت میں گرانی سیکھو

منتشر دل کے حوالے کب تھے
ہم تجھے بھولنے والے کب تھے

ہر طلب تازہ جراحت تھی مگر
خارِ غم دل سے نکالے کب تھے

ہم کہ محرومِ لبِ گویا تھے
داغِ دل ہم نے اُچھالے کب تھے

اب تو وحشت سے ہیں آنکھیں گلرنگ
یُوں چھلکتے ہُوئے پیالے کب تھے

رچ گئیں یادیں سویرے بن کر
تجھ سے پہلے یہ اُجالے کب تھے

بچھڑے جاتے ہیں رفیقوں کی طرح
میرے ہمدم مرے چھالے کب تھے

ہُن برستا ہے تری یادوں کا
خانہ ویراں یہ شوالے کب تھے

وضعِ غم، جبرِ مسلسل، یعنی
جانکنی کے بھی ازالے کب تھے

ساتھ تھے بس کہ ہمیں چلنا تھا
آشنا قافلے والے کب تھے

ہم تو تھے کھو کھلے خود ہی ناہید
دل کی دیوار سنبھالے کب تھے

کچھ اس قدر تھی گرمیٔ بازارِ آرزو
دل جو خریدتا تھا اسے دیکھتا نہ تھا

کیسے کریں گے ذکرِ حبیبِ جفا پسند
جب نام دوستوں میں بھی لینا روا نہ تھا

کچھ یُوں ہی زرد زرد سی ناہیدؔ آج تھی
کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھِلتا ہُوا نہ تھا

٭

وہ اجنبی تھا، غیر تھا، کس نے کہا نہ تھا
دل کو مگر یقین کسی پر ہُوا نہ تھا

ہم کو تو احتیاطِ غمِ دل عزیز تھی
کچھ اس لیے بھی کم نگہی کا گلہ نہ تھا

دستِ خیالِ یار سے پھُوٹے شفق کے رنگ
نقشِ قدم بھی رنگِ حنا کے سوا نہ تھا

ڈھونڈا اُسے بہت کہ بُلایا تھا جس نے پاس
جلوہ مگر کہیں بھی صدا کے سوا نہ تھا

*

انھیں یہ ضد کہ ملاقات کا فسوں نہ رہے
وہ انتظار رہے آنکھ میں بھی خوں نہ رہے

سیہ رات کے سینے سے لگ کے بیٹھے رہو
تمہیں بھی حسرتِ دریوزۂ جنوں نہ رہے

پھر ایک بار جمالِ نگارِ شب نکھرے
وہ برہمی ہو کہ پھر حسرتِ سکوں نہ رہے

چلو کہ سلسلۂ روز و شب مٹا ڈالیں
اُداسیوں کا سبب چرخِ نیلگوں نہ رہے

دُرست ہے کہ زمیں آسمان ملتے ہیں
زمیں کی خاک تری بندگی میں کیوں نہ رہے

کبھی تو سچ ہو مرے خوابِ دید کی تعبیر
کبھی تو کاسۂ تسکین، واژگوں نہ رہے

یہ جانکنی کا کٹھن طوق توڑ دے کوئی
خوشا کہ سلسلۂ زندگی بھی یوں نہ رہے

مَیں شاعرہ نہ رہوں مُشتِ خاک رہ جاؤں
مرا حریف اگر جذبِ اندروں نہ رہے

٭

ایک ہی آواز پر واپس پلٹ آئیں گے لوگ
تجھ کو پھر اپنے گھروں میں ڈھونڈنے جائیں گے لوگ

ڈوبتے سورج کی صورت میرا چہرہ دیکھ لو
پھر کہاں بابِ معانی ڈھونڈنے جائیں گے لوگ

مت کہو قسمت ہے اپنی بے دلی، ناگفتنی
پھر سحر ہو گی درخشاں پھر بھلے آئیں گے لوگ

پل جھپکنے تک ہے یہ ہنگامۂ وارفتگی
جب نظر سے دور ہو گے بھولتے جائیں گے لوگ

پھر نئی خواہش کے ذروں سے بنائیں گے نگر
پھر نئی رسمِ طلب، رسمِ وفا لائیں گے لوگ

منحصر رنگوں کی آتش پر نہیں ہے دلکشی
میلے کپڑوں میں بھی تجھ کو دیکھنے آئیں گے لوگ

✺

گریہ، مایوسی، غمِ ترکِ وفا کچھ نہ رہا
زندگی رہ گئی جینے کا مزا کچھ نہ رہا

روشنی تھی تو ہر اک شے کی حقیقت تھی عیاں
تیرگی میں مری آنکھوں کے سوا کچھ نہ رہا

پیرہن رنگ برنگے نکل آئے اتنے
نو دمیدہ گلِ شبو میں چھپا کچھ نہ رہا

کھا گئی خاک ہی کو خاک کریں کس سے گلہ
کیا کریدیں کہ تہِ خاک چھپا کچھ نہ رہا

تیرے ملنے کے نئے ڈھنگ بھی تسلیم مگر
ذائقہ اس طرح بدلا کہ مزا کچھ نہ رہا

کیوں نہ ہو حشر بپا دادِ وفا کیوں نہ ملے
جب ترے چاہنے والوں کے سوا کچھ نہ رہا

خوشبوئے وصل، توجہ کا وہ عالم، وہ خلوص
ڈوبتے چاند کی آغوش میں کیا کچھ نہ رہا

ترے قریب پہنچنے کے ڈھنگ آتے تھے
یہ خود فریب مگر راہ بھول جاتے تھے

ہمیں عزیز ہیں اُن بستیوں کی دیواریں
کہ جن کے سائے بھی دیوار بنتے جاتے تھے

ستیزِ نقشِ وفا تھا تعلقِ یاراں
وہ زخمۂ رگِ جاں چھیڑ چھیڑ جاتے تھے

وہ اور کون ترے قُرب کو ترستا تھا
فریب خوردہ ہی تیرا فریب کھاتے تھے

چھپا کے رکھ دیا پھر آگہی کے شیشے کو
اس آئینے میں تو چہرے بگڑتے جاتے تھے

اب ایک عمر سے دُکھ بھی کوئی نہیں دیتا
وہ لوگ کیا تھے جو آٹھوں پہر رُلاتے تھے

وہ لوگ کیا ہوئے جو اونگھتی ہوئی شب میں
درِ فراق کی زنجیر سی ہلاتے تھے

جب مَیں نہ ہُوں تو شہر میں مجھ سا کوئی تو ہو
دیوارِ زندگی میں دریچہ کوئی تو ہو

اک پل کسی درخت کے سائے میں سانس لے
سارے نگر میں جاننے والا کوئی تو ہو

اے خوئے اجتناب تعلق کہیں تو رکھ
بے چارگی میں پُوچھنے والا کوئی تو ہو

دیکھے عجیب رنگ میں تنہا ہر ایک ذات
ان گہرے پانیوں میں اُترتا کوئی تو ہو

ڈھونڈو گے جس کو دل سے وہ مل جائے گا ضرور
آئیں گے لوگ آپ، تماشا کوئی تو ہو

پھر کوئی شکل بام پہ آئے نظر کہیں
پھر رہگزارِ عام میں رُسوا کوئی تو ہو

کوئی تو آرزوئے فروزاں سنبھال رکھ
ہاں اپنے سر پہ قرضِ تمنا کوئی تو ہو

ہر دم علاجِ مہر و وفا ڈھونڈتے رہو
اس تیرگی میں گھر کا اُجالا کوئی تو ہو

ناہید بندشوں میں مقید ہے زندگی
جائیں ہزار بار، بُلاوا کوئی تو ہو

✺

اب تم بھی چھپاؤ نہ یہ داغ اور زیادہ
لگتا ہے حقیقت کا سراغ اور زیادہ

جھلاتے ہیں جتنا بھی گرانباری دل کو
ملتا ہے نگاہوں سے سراغ اور زیادہ

مٹ جاتے اسی قتل گہ دل میں بھی ہم لوگ
بھرتے جو ترے غم کے ایاغ اور زیادہ

یہ کاسۂ دریوزۂ غم بھر نہیں پاتا
مٹ جائے زمانے سے فراغ اور زیادہ

جب دل میں شرم ہی پڑتی ہے گرہ سی
جلتے ہیں نگاہوں میں چراغ اور زیادہ

ناہید کوئی آ کے ستائے بھی تو ہم کو
مہکائیں کے زخموں کے یہ باغ اور زیادہ

اب تم بھی چھپاؤ نہ یہ داغ اور زیادہ
لگتا ہے حقیقت کا سراغ اور زیادہ

جھٹلاتے ہیں جتنا بھی گرانباریٔ دِل کو
ملتا ہے نگاہوں سے سراغ اور زیادہ

مٹ جاتے اسی قتل گہِ دل میں بھی ہم لوگ
بھرتے جو ترے غم کے ایاغ اور زیادہ

یہ کاسۂ دریوزۂ غم بھر نہیں پاتا
مٹ جائے زمانے سے فراغ اور زیادہ

جب دِل میں سرِ شام ہی پڑتی ہے گرہ سی
جلتے ہیں نگاہوں میں چراغ اور زیادہ

ناہید کوئی آ کے ستائے بھی تو ہم کو
مہکائیں کے زخموں کے یہ باغ اور زیادہ

کوئی بھولا ہُوا گھر آئے گا
آج اِک بُلبُلہ آٹے میں اُٹھا

دل بھی تصویر کی صُورت ناہید
عمر بھر یُوں ہی رہے گا تنہا

✱

جس نے بھی حالِ غمِ دل پُوچھا
ہم نے اُس کو ہی مسیحا سمجھا

بُھول بچپن کی ہمیں یاد آئی
چاند جب قوس کی صُورت دیکھا

جیسے جاذب پہ سیاہی پھیلے
یُوں تری یاد کا دریا اُمڈا

شہر میں یُوں تو نہ رُسوا ہوتے
نام جو اُس کا نہ پُوچھا ہوتا

✺

تمہاری یاد میں ہم جشنِ غم منائیں بھی
کسی طرح سے مگر تم کو یاد آئیں بھی

چھلک ہی پڑتے ہیں خود ہی گلاب آنکھوں کے
وہ پاس آئیں تو یہ داستاں سُنائیں بھی

ہر ایک لمحہ یہی بے کلی سی ہے دل میں
کہ اُن کو یاد کریں، اُن کو بھول جائیں بھی

جوان گیہوں کے کھیتوں کو دیکھ کر رو دیں
وہ لڑکیاں کہ جنہیں بھول بیٹھیں مائیں بھی

تمام عمر یونہی رتجگوں سے کیا حاصل
اُنہیں بھلائیں ذرا نیند کو بُلائیں بھی

سکون ملتا ہے جلتی ہوئی دوپہروں میں
بنی ہیں مرہمِ دل دھوپ کی شعاعیں بھی

روا روی میں ہے ہر ایک صحبتِ یاراں
ملیں سکوں سے تو قصّے ترے سُنائیں بھی

وہ جن کے ذکر سے ناہید زندگی ہے حسیں
وہ لوگ آئیں تو آنکھوں پہ ہم بٹھائیں بھی

✺

بگڑی بات بنانا مشکل ، بگڑی بات بنائے کون
کُنجِ تمنّا ویرانہ ہے ، آ کر پھول کھلائے کون

تن کی دولت، من کی دولت، سب خوابوں کی باتیں ہیں
نو من تیل نہ ہو تو گھر میں رادھا کو نچوائے کون

اپنا غم اب خود ہی اُٹھا لے ورنہ رُسوائی ہو گی
تیرا بھید چھپا کر دل میں ناحق بوجھ اُٹھائے کون

چلتی گاڑی، نام کا رشتہ، کیا موہن کیا رادھا آج
بَن کے سنور کے، راس رچا کے، موہن آج منائے کون

ساگر پار کی خبریں دیکھے ہمسائے کا پتا نہیں
آج کا انسان عالم فاضل، اس کو اب سمجھائے کون

نا اُمیدی نام تمنّا، اپنا مُقدر، ہجرِ مسلسل
درد کے خارستان میں آ کے دامن دل اُلجھائے کون

رات بھی کالی چادر اوڑھے آ پہنچی ہے زینے میں
مہندی لگائے بیٹھی سوچے لٹ اُلجھی سُلجھائے کون

آنکھ میں چبھتی ہے جب ٹھہری ہوئی برسے گھٹا
مختلف لگتی نہیں صحرا کے منظر سے گھٹا

کھینچ رکھا ہے حصارِ نامرادی ہر طرف
لگ کے بیٹھی ہے مری دیوار سے در سے گھٹا

راکھ کر ڈالا شبستانِ اُمید و آرزو
آگ ہیں اندر سے آنسو اور باہر سے گھٹا

جانے کب ہوں گے حنائی آس کی دیوی کے ہاتھ
جانے کب گزرے گی کشتِ دل کے اُوپر سے گھٹا

اور بھی بھڑکا گئی ناہید غم کی آگ کو
جب کبھی اٹھی ترے غم کے سمندر سے گھٹا

لگ گیا غم کی دیوار میں آئینہ
اب نہیں کوئی موجود تیرے سوا

شہر کے سارے دروازے کیوں بند ہیں
خونِ موجِ صبا دے رہا ہے صدا

ہونٹ بھی سل گئے آنکھ بھی جھک گئی
آپ کو جاننا کچھ بھلا نہ ہوا

ڈھونڈنے اس کو کس دیس میں جاؤ گے
اپنے ہی مُلک میں فاصلہ ہے بڑا

تشنگی، جانکنی، بر بھی کچھ نہیں
یعنی یہ کہ سمندر ہے ٹھہرا ہُوا

اِک سمندر تھا یادوں کا پیشِ نظر
جب سفینہ کنارے کنارے چلا

تُو نہیں ہے تو کس سے کریں بات ہم
جب تجھی سے کبھی حوصلہ نہ ہُوا

ٹیلی فونوں پہ کس سے تعارف ہُوئی
نامۂ دوستی فائلوں میں کُھلا

گو ہیں مشہور چہرہ شناسی میں ہم
آپ کو دیکھ کر کھا گئے ہیں خطا

ٹھہر جاتے وہ اِمشب اسی دیس میں
کوئی تو روکتا چاند کا راستہ

✺

حسرت ہے تجھے سامنے بیٹھے کبھی دیکھوں
مَیں تجھ سے مخاطب ہوں ترا حال بھی پُوچھوں

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں

جس نام سے تُو نے مجھے بچپن میں پکارا
اِک عُمر گزرنے پہ بھی وہ نام نہ بھُولوں

تُو اشک ہی بن کے مری آنکھوں میں سما جا
مَیں آئینہ دیکھوں تو ترا عکس بھی دیکھوں
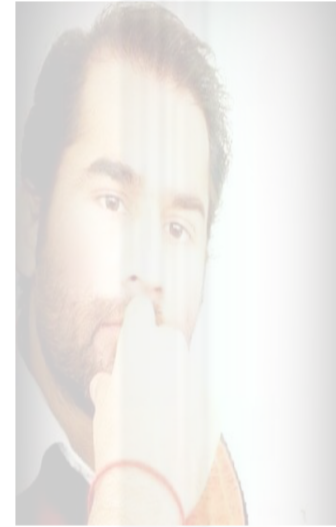
پُوچھوں کبھی غنچوں سے، ستاروں سے، ہَوا سے
تُجھ سے ہی مگر آ کے ترا نام نہ پُوچھوں

جو شخص کہ ہے خواب میں آنے سے بھی خائف
آئینۂ دل میں اسے موجود ہی دیکھوں

اے میری تمنّا کے ستارے تُو کہاں ہے
تُو آئے تو یہ جسمِ شبِ غم کو نہ سونپوں

وُہ اجنبی تھا پھر بھی لگا آشنا مجھے
کس سمت لے چلا ہے نیا حادثہ مجھے

واماندگیٔ شوق خلش بن کے رہ گئی
کیوں راستے میں چھوڑ گیا راہنما مجھے

مُجھ کو بھی ڈھونڈتی رمِ ایّام کی چمک
رکھتا عزیز گر کبھی میرا خُدا مجھے

مُجھ خستہ تن کو گھر میں کہاں ڈھونڈتے ہو آپ
دو، وحشتِ نامرادیٔ دل میں صدا مجھے

واقف نہیں ہوں شکل سے، اطوار سے مگر
لگتا ہے اس کا نام ہی اکثر بھلا مجھے

مَیں گھر کی روشنی ہُوں مجھے محفلوں سے کیا
پھروں کے میکدے میں نہ تو دے صدا مجھے

اے کاش تُو بھی سُنتا کبھی آہٹوں کی گونج
تُو بھی مری طرح سے کبھی ڈھونڈتا مجھے

پیروں کے آبلے نہ مرا ساتھ دے سکے
جب رہنما بھی راہ کا پتھر لگا مجھے

ناہید اُس کی یاد کا آنچل بھی آج تو
اُڑتا ہُوا، ہَوا میں بگولہ لگا مجھے

دوستی زود رنج نکلی ہے
آگ تنکوں میں جلد پھیلی ہے

لَب پہ ہیں مُسکراہٹیں لیکن
دل کی چادر ہنوز مَیلی ہے

ہے سرِ شام، ماہتاب اُداس
کوئی لڑکی کہیں اکیلی ہے

ایک تیری رضا کی چاہت میں
دل نے ہر واردات سہہ لی ہے

دل کو دی ہیں تسلّیاں ہم نے
عمر بھر غم سے دوستی کی ہے

حوصلوں کی حکایتیں مت پُوچھ
شوق کی ہر کمند ٹُوٹی ہے

٭
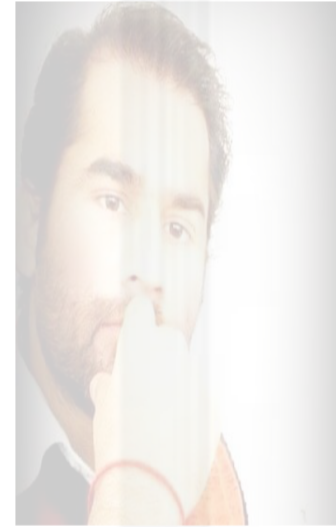
درد کی لو بھی مدھم ہو گئی
محفلِ حسرت برہم ہو گئی

دیکھ کے گھر کی ویرانی کو
چشمِ ستم گر پُر نم ہو گئی

غم کی فصیلیں اونچی ہو گئیں
خواہشِ دل بھی محکم ہو گئی

جاگ اُٹھے خوابوں کے جزیرے
اُن کی توجّہ جس دم ہو گئی

جب جب یاد نے ڈیرے ڈالے
دل کی خلش کم کم ہو گئی

گیلی سُلگتی لکڑی عورت
سیلِ زماں میں مدغم ہو گئی

خیر ہو یا رب دشت و دمن کی
آنکھ جنوں کی پُر نم ہو گئی

ہم سے ہی ناہید جہاں میں
بھول وفا کی پیہم ہو گئی

❋

ہم سفر راستے، راہبر راستے
آج تو بن گئے چارہ گر راستے

دیکھ کر چُپ رہے کُشتۂ شوق کو
جان کر بن گئے بے خبر راستے

پھر جلے گی نگاہوں میں شمعِ الم
پھر دکھاتے ہیں سُونے نگر راستے

ناشناسائے قلب و جگر تھے مگر
بن گئے محرمِ چشمِ تر راستے
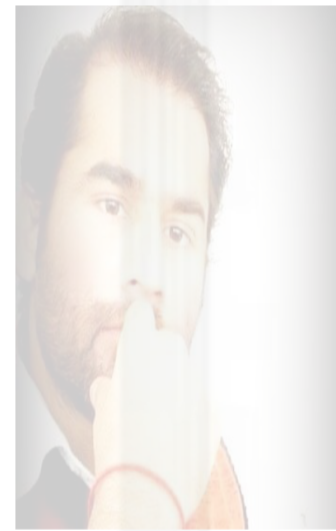
اُڑ گئی چاندنی بھی مہک کی طرح
ایسے ویراں تھے وقتِ سفر راستے

ہر قدم پر نئی یاد ڈستی رہی
دل دُکھاتے رہے عمر بھر راستے

اپنی ویران تنہائیوں کے تئیں
بن گئے حسرتوں کے نگر راستے

❋

ہَوا چلے تو ہر اک زخم پھُول بن کے کِھلے
مری وفا کو شکستوں کا یہ چمن ہی مِلے

نہ ہم سے بات کرے بے مُدعا، زمانہ شناس
نہ ہم سے پُوچھ کہ ہم کس لیے جہاں میں جیے

دِلوں میں چیختی پھرتی ہے، خامشی تنہا
نظر میں بھیگتی شب کے ہیں آنسوؤں کے دیے

اسے بُھلاؤ گے کیسے، کدھر کو جاؤ گے
تمہارے دل میں ہیں اس کے ہزار رُوپ چھُپے

اُداس کر گیا ٹھنڈی ہوا کا اِک جھونکا
تمہارے قرب کی چاہت کے بام و در مہکے

وہ شخص رنگ ہے، نکہت ہے، روشنی ہے مری
وہ جس کے بعد زمانے میں کچھ بھلا نہ لگے

مَیں راکھ اپنی ہی شمعِ وفا کی ہُوں ناہید
مری طرح کوئی خوشیوں کی آگ میں نہ جلے

✹

ہونٹوں پہ ہے سوادِ تمنّا کی داستاں
آنکھوں میں رتجگوں کی جلن ہے، بُجھی ہوئی

پھنکارتا ہے شہر میں تنہائیوں کا سانپ
لہرا سکے نہ چاہ کے بادل یہاں کبھی

تیرے تصوّرات میں ڈوبے جو ایک بار
رنگوں کی نہر موجِ خیالات سے بھری

جب شہر سے چلے تو زمانے کو غم ہُوا
تھے شہر میں تو مُنہ نہ لگاتا تھا کوئی بھی

دیکھا ہے جب سے رنگِ زمانہ قریب سے
ہیں آ ہُوئے خیال کی آنکھیں پھٹی پھٹی

پُوچھو جو ایک بار سُنائیں ہزار بار
ناہید ذکرِ دوست ہے تفسیرِ زندگی

آس کی دُودھیا چاندنی مل گئی
تم ملے مدھ بھری راگنی مل گئی

ایک پل کے لیے ہنس پڑے تھے مگر
عمر بھر کے لیے جانکنی مل گئی

یاد آئی تو اُجڑی ہوئی راہ میں
پھول، صہبا، صبا، چاندنی مل گئی

جب روانہ ہُوا یاد کا قافلہ
دردِ اُلفت کی چھاؤں گھنی مل گئی

اَب کے ناہید خوش ہے کہ برسات میں
اوڑھنی چمپئی جامنی مل گئی

اہلِ دل آؤ سُنو تو ہم بھی افسانہ کہیں
کچھ دہانِ زخم کھولیں، جورِ جانانہ کہیں

پھر پلٹ آئیں لُٹا کر ہم متاعِ زندگی
پھر نظر کو دشت و صحرا دل کو ویرانہ کہیں

ہم تو چڑھ کے دار پر بھی عشق کے گائیں گے گیت
لوگ ہم کو شوق سے چاہیں تو دیوانہ کہیں

ہم وفا پیشہ، وفا خوگر، وفا کے مُدعی
زندگی کو تیری بے مہری کا نذرانہ کہیں

ہنس کے پی لیں خونِ دل اور ہنس کے ہی نا ہیں ہم
آنسوؤں کو مے کہیں، آنکھوں کو پیمانہ کہیں

شاعروں کے جو پاس رہتے ہیں
وہ بھی اکثر اُداس رہتے ہیں

غم بہر طور اور بہر عالم
زندگی کا لباس رہتے ہیں

داغِ دل کے کبھی محبت میں
بن کے سینے میں آس رہتے ہیں

دل کی دھڑکن بھی اب نہیں میری
آپ کیوں اتنے پاس رہتے ہیں

دل بہت ڈھونڈتا ہے تنہائی
ہم بہت اُن کے پاس رہتے ہیں

اشکوں کو مزے سے پی لو جی، غم اور خوشی سے کھاؤ جی
گر تیشۂ عشق سلامت ہے، کچھ اور لگیں گے گھاؤ جی

ہم پھر سے محبّت کر لیں گے تم سامنے پھر سے آؤ جی
ہم جان کے دھوکا کھا لیں گے تم دامِ وفا پھیلاؤ جی

اے چارہ گرو یہ چارہ گری اک ڈھونگ ہے دل بہلانے کا
حالات کو اور اُلجھانے کو، کیوں ہم پہ کرم فرماؤ جی

جب لالہ و گُل ناپید ہوں اور گلشن سے دُھواں بھی اُٹھتا ہو
تزئینِ بہاراں کرنے کو کاغذ کے پھول بناؤ جی

ہم نے تو وفا کی راہوں میں یُوں دیدہ و دِل قربان کیے
جیسے کہ کسی نے دریا میں کاغذ کی بہا دی ناؤ جی

اس قلبِ حزیں کو دُنیا میں ناہید وفا کرتے کرتے
ہے ترکِ محبّت کی حسرت، ہے جُرم جفا کا چاؤ جی

✺

عشق کی گُم شُدہ منزلوں میں گئی
زندگی ٹوٹ کر دلدلوں میں گئی

یاس و حسرت بھری بے اماں زندگی
آس کے ریشمی آنچلوں میں گئی

وُہ صدا جو فغاں بن کے اُٹھی مگر
خامشی کے گھنے جنگلوں میں گئی

تم سے ہو کر جُدا ایک نفس دوستو
زندگی مرگھٹوں ، دلدلوں میں گئی

کون جانے کہ اُڑتی ہُوئی دُھوپ بھی
کس طرف کون سی منزلوں میں گئی

صبحدم ، رنگ نکھرا ہر اک شاخ کا
روشنی ، شبنمی کونپلوں میں گئی

٭

یہ بہارِ غم اپنی، دستِ خوں چکاں اپنا
عیشِ انتہا اُن کا، حزنِ جاوداں اپنا

ہاں نہ ہم کو راس آیا کچھ سوائے خاموشی
ڈھونڈ ہی لیا آخر دل نے ہمزباں اپنا

پھر پلٹ کے خود کوئی نقشِ پا مٹا ڈالے
پھر کبھی تو سچ نکلے خوابِ رفتگاں اپنا

دُودِ غم کی یورش سے جل رہی ہیں آنکھیں بھی
رنگ کچھ تو دکھلائے شوقِ خوں فشاں اپنا

ایک یاد ہی اب تک راحتِ تعلق ہے
ایک یاد ڈھانپے ہے دردِ رفتگاں اپنا

شوقِ بے ارادہ کو دخل ہے غمِ دل میں
اذنِ بے سبب بھی ہے محرمِ فغاں اپنا

---

*

حاصلِ عہدِ تمنّا نہ مِلا
رات کے بعد اُجالا نہ مِلا

تُو تو کیا، شہر میں تیرے ہم کو
کِسی دیوار کا سایہ نہ مِلا

اُس کی چاہت میں فنا ہو جاتے
کیا کریں کوئی بھی تجھ سا نہ مِلا

زندگی چاٹ گئی تنہائی
درد کا کوئی مداوا نہ مِلا

بحرِ غم سے کبھی پایا نہ فرار
زیست کا کوئی کنارا نہ مِلا

مُدّتوں بعد مِلے تھے جن سے
ان نگاہوں میں بُلاوا نہ مِلا

پھر خیالوں میں نہ گرداب پڑا
پھر وہ مانوس سا چہرا نہ مِلا

منجمد ہو گیا غم بھی ناہید
دِل میں اُمڈا ہُوا دریا نہ مِلا

✺

کچھ اتنے یاد ماضی کے فسانے ہم کو آئے ہیں
کہ جن راہوں میں اُجڑے تھے اُنھی پر لوٹ آئے ہیں

بڑا پیارا ہے وہ غم جس کو تیرے چاہنے والے
زمانے بھر کی خوشیوں کے تصدق مانگ لائے ہیں

دہکتا ہے کلیجے میں کسک کا کوئلہ اب تک
ابھی تک دل کے بام و در پہ ہجر و غم کے سائے ہیں

ہمیں دیکھو، ہمارے پاس بیٹھو، ہم سے کچھ سیکھو
ہمیں نے پیار مانگا تھا، ہمیں نے داغ پائے ہیں

✺

ہر نقشِ پا کو منزلِ جاں ماننا پڑا
مدت کے بعد، جب بھی ترا سامنا پڑا

اکثر نقابِ ضبط ہمیں تھامنا پڑا
جب بھی فصیلِ شب کو ہمیں پھاندنا پڑا

ہر بار بھولنے کو غموں کی اذیتیں
ہر رشتۂ امید، نیا باندھنا پڑا

ہر آرزو سے ہم کو ملی تازہ زندگی
ہر آرزو کا ہم کو لہو چاٹنا پڑا

کی تھی حرام خودکشی میرے خدا نے کیوں
بے وجہ زندگی کا سفر کاٹنا پڑا

نغمے آہوں سے نکلتے دیکھے
روگ غم سے بھی بہلتے دیکھے

موسمِ گُل کا فقط ذکر نہیں
ہم نے انساں بھی بدلتے دیکھے

ہم نے تو دَیر و حرم کے رَستے
اُس کے دَر پر ہی نکلتے دیکھے

سلسلے سارے جہانِ غم کے
آپ کے ساتھ ہی چلتے دیکھے

دِل میں زخموں کا الاؤ دیکھا
نغمے ہونٹوں پہ مچلتے دیکھے

دشمنوں سے بھی مِلی دادِ وفا
آگ سے پھُول نکلتے دیکھے

دل کے صحرا کو کھنگالا تو کبھی
غم کے چشمے بھی اُبلتے دیکھے

میری زباں پہ نام ترا ایسے رٹ گیا
اِک ذائقہ سا جیسے زباں سے چمٹ گیا

ملنے کی آس لے کے مرا دِل جگہ جگہ
بے اختیار موجِ صبا سے لپٹ گیا

آنسو بنا ، حجاب بنا ، مُہرِ لب بنا
اِک تیرا غم ہزار کنایوں میں بٹ گیا

تیرا خیال دھار کے آتش فشاں کا رُوپ
ضبطِ غمِ حبیب کے ایواں اُلٹ گیا

ناہیدؔ کس حبیب کا سایہ گلی میں تھا
مجھ کو اُداس دیکھ کے جو کل سمٹ گیا

آنسوؤں کی رِدا میں لپٹے ہم
یاد نے رکھ دیا تھا دل میں قدم

آنکھ میں چاہتوں کے غم جاگے
دیکھ کر راستوں کے ویراں خم

پاس آئے تو پیر دھو کے پیوں
پھول بنتے ہیں جس کے نقشِ قدم

بھولتی ہی نہیں ہے یاد اُس کی
جان سے کیوں گزر نہ جائیں ہم

بولتی ہیں گھروں کی دیواریں
کھُل نہ جائے کہیں سکوں کا بھرم

تیری فرقت میں پھُنک رہا ہے بدن
ہو نہ جائے یہ آنچ بھی مدھم

صبحدم یاد کے سمندر میں
ڈوبتا ہے سفینۂ شبِ غم

❋

دُکھ کی گتھّی کھولیں گے
اپنے آپ کو سمجھیں گے

تیری آنکھ جھپکنے میں
لاکھوں طوفاں اُٹھیں گے

جانے کس دن تجھ کو ہم
پاس بٹھا کر دیکھیں گے

سُن کے قدموں کی آہٹ
مانگ میں افشاں بھر لیں گے

دیکھیں گے بے مہریٔ دہر
چُپ کی چادر اوڑھیں گے

تیری خاطر، موسمِ گُل
کانٹے دل میں چبھو لیں گے

میری چمکتی آنکھ میں لوگ
تیری صورت دیکھیں گے

❋
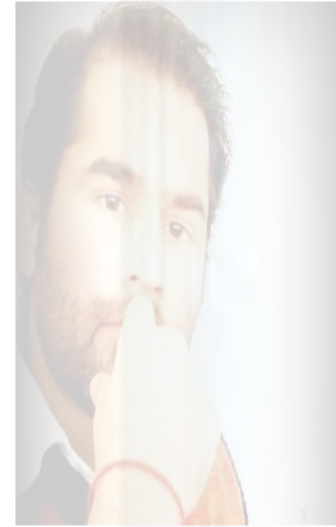
مرے نوحے میں شامل ہو گئے ہیں
محل میں لوگ داخل ہو گئے ہیں

گھروں سے صحن اُڑتے جا رہے ہیں
بہت اب لوگ کاہل ہو گئے ہیں

اُڑی خوشبو دریدہ پیرہن سے
نمودِ غم کے قابل ہو گئے ہیں

کبھی تو جھانکیے اپنے گھروں میں
بہت اپنے مسائل ہو گئے ہیں

بھری بہار میں اندیشۂ خزاں بھی ہے
وفورِ تشنہ لبی ، تنگیٔ اماں بھی ہے

صحیح تو یہ ہے کہ ہم مطمئن نہ تھے خود سے
وگرنہ آبِ رواں زیرِ خاکداں بھی ہے

منافقت ہے تقاضائے عصر، دیکھ کے چل
جو ہمسفر ہے وہی تو غنیمِ جاں بھی ہے

خود اپنے آپ کو زنجیر کر کے مت روؤ
تمہارے ہاتھ سلامت ہیں اور زباں بھی ہے

نویدِ منزل نایافت، ہر قدم پر ہے
ہر ایک راہگزر نقشِ رہرواں بھی ہے

عشق کے لاکھوں رنگوں کا ہے اک اوتار ہوا
پھرے کسی کی کھوج میں بے کل شب بیدار ہوا

تم کیا جانو ہجر کی راتیں کیسے بیت رہی ہیں
رات کا پچھلا پہر ہے ساتھی اور غم خوار ہوا

دل کی دُوری ہو تو ملنا بے معنی ہو جاتا ہے
بن جاتی ہے بیچ میں اکثر اک دیوار ہوا

جانے کس کے عشق میں گھائل بستی بستی پھرتی ہے
اپنا رُوپ بھی کھو بیٹھی ہے یہ نادار ہوا
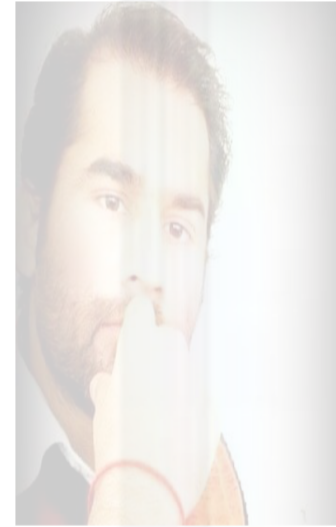
ہم بیراگی شام سویرے اُس کے دھیان میں رہتے ہیں
جس کی چاہت خوشبو جیسی جس کا پیار ہُوا

مستی میں مُنہ چُوم رہی ہے آتے جاتے پھُولوں کا
گُلشن گُلشن بانٹ رہی ہے اپنا پیار ہُوا

لاکھوں بار دھڑک اُٹھا دل ایک ذراسی آہٹ پر
درد کی چادر تان چکی ہے لاکھوں بار ہُوا

✺

حسرتیں جاگ اٹھیں، یاس نے پہلو بدلا
اس طرح ہاتھ تری یاد نے آکر رکھا

ہم تجھے دل سے بھُلا دیں نہ کبھی یاد کریں
ل اگر جائے زمانے میں کوئی بھی تجھ سا

پھُول سا جسم دہکنے لگا شعلوں کی طرح
دل تری یاد کو بھی وصل کا ساماں سمجھا

آنکھ ہر رُوٹھے ہُوئے شخص کی جانب اُٹھی
دل ہر اک چلتے ہوئے شخص کے پیچھے بھاگا

یاد آئی تو سُلگ اُٹھے نگاہوں کے ایاغ
رات آئی تو ترے غم کا مقدّر چمکا

آس کے ہونٹوں پہ پپڑی سی جمی ہے ناہید
خُوب کھایا ہے تمنّا نے وفا کا دھوکا

✺
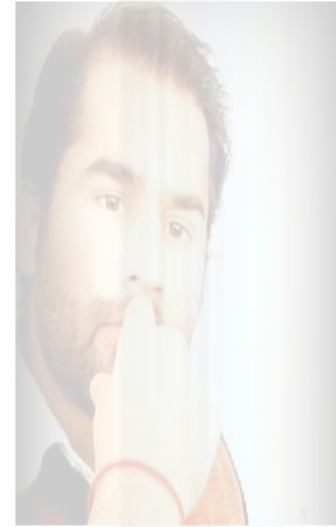
بگڑے ہیں جب کسی کے بھی حالات بے طرح
آئی ہے بن سنور کے سیہ رات بے طرح

جب سے ہے خواہشوں کے گھنے جنگلوں کا دھیان
جی میں ہے پھر سے شوقِ مدارات بے طرح

سُنتا کبھی تو، اپنی ہی دھڑکن کی آہٹیں
کٹتی کبھی تو تیری کوئی رات بے طرح

یاد آئیں بے طرح مجھے پھر آپ بیتیاں
اِک پھول پر پڑا تھا مرا ہاتھ بے طرح

اب کے بھی کاگ چھوڑ کر پنچھی چلے گئے
اب کے بھی سُونی گزرے گی برسات بے طرح

بُڑھے کے پاس کٹتے ہیں شام و سحر تمام
بگڑی ہے جب سے اپنی بھی اوقات بے طرح

آئینہ خانے کی جانب نہ چلو
اپنی ہی ذات کے سانچے میں ڈھلو

قہر بھی صبر کی حد سے گُزرا
حلق ہے خُشک تو آنکھوں سے کہو

زخم چٹکیں گے شگوفوں کی طرح
زیست کو شرطِ تمنّا سمجھو

ظُلم ہر حال میں رُسوا ہو گا
جانکنی کو نہ مسلسل سمجھو
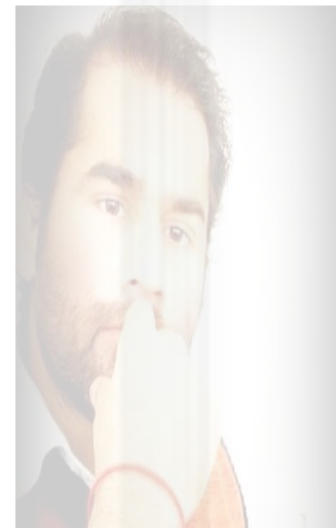
گھر کی دیواریں بھی بول اُٹھیں گی
چند روز اور تماشا دیکھو

نکلو بھی بند گھروں سے ناہید
ہے لہُو گرم تو ہنگامہ کرو

پہلے تو اپنے درد کی گیرائی دیکھ لے
پھر حسرتوں کے باب میں شنوائی دیکھ لے

گر ہو طلب تو سلسلۂ جستجو بھی رکھ
مٹی اُڑا ہوا کی پذیرائی دیکھ لے

اشکوں کی تھالیوں میں سجا پھر ہنسی کے دیپ
ہوتی ہے ایسے غم سے شناسائی دیکھ لے

صحرا میں یوں نہ سایۂ انساں گزیدہ پھر
لگتی نہیں ہے جسم کو پُروائی دیکھ لے

کاغذ کو چھو کے جان لے تحریر کا متن
آنکھوں سے جھانکتی سخن آرائی دیکھ لے

اچھی ہے اپنے آپ سے ہی گفتگو مگر
ناہید یوں نہ ہو کر تماشائی دیکھ لے

❋

آئینے محوِ تمنّا ہوں گے
ہم تو رد کر بھی شگفتہ ہوں گے

آج ہیں نقش کی صورت ٹھہرے
کون جانے ہے کہ کل کیا ہوں گے

آگہی اپنی ہی کام آئے گی
ہوں گے پامال تو سبزہ ہوں گے

ہم اِک رنگ میں ڈھونڈیں گے تجھے
منزلوں منزلوں رُسوا ہوں گے

سخت ہوتا ہے سفر کا ہنگام
در و دیوار بھی گویا ہوں گے

یاد آؤ گے شب و روز ہمیں
دشت بھی شہر کا نقشہ ہوں گے

سرسری ربط پہ نازاں ناہید
اور وہ محوِ تماشا ہوں گے

٭
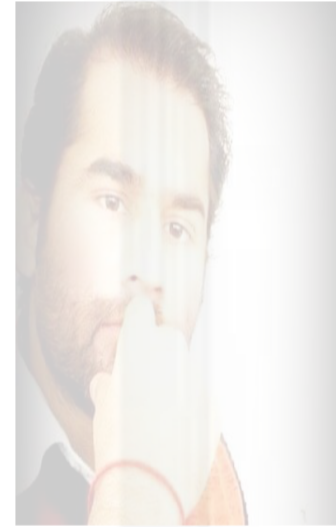
دِل مرا اپنے تقاضوں ہی سے ترسیدہ ہے
اس کی قسمت میں تو اب حال بھی غم دیدہ ہے

ٹھہریے تو نظر آتی ہے مقابل منزل
چل نکلیے تو ہر اک راہ ہی پیچیدہ ہے

رات بنتی نہیں غمّازِ طلب گارِ وفا
یہ بھی تیرے ہی خیالوں سے تراشیدہ ہے

مَیں ترا عکس ہوں کب تک تُو چھپے گا مجھ سے
یہ مری ذات تو تُجھ سے ہی تراشیدہ ہے

جسم پتھر ہے، ہر اِک چوٹ کو سہہ جائے گا
دِل سمندر ہے، ہر اِک موڑ پہ شوریدہ ہے

پیلی دُھوپوں سے بچھڑتے ہوئے سایو ٹھہرو
زندگی بھی تو چراغِ غمِ ژولیدہ ہے

وحشت و غم کو تعلق کا تماشا نہ سمجھ
دل وہ صحرا کہ سرابوں سے بھی ترسیدہ ہے

عمر بھر جاگتی آنکھوں کے تعاقب میں رہو
خوابِ ہستی ہے یہاں وقت بھی خوابیدہ ہے

٭

محرومیوں کو دَر پئے آزار ہونے دو
کچھ اور راہِ زیست کو دشوار ہونے دو

ڈھونڈو وہ چیز جس کا سلیقہ تمہیں بھی ہو
ہنگامۂ طرب پسِ دیوار ہونے دو

ٹُوٹے گا پھر سکوتِ گُلِ دید ایک دن
ہنگامہ خیز صُبح کے آثار ہونے دو

کچھ روز تم بھی صبر کرو، جی کڑا کرو
کچھ روز اس طرف سے بھی اصرار ہونے دو!

آجائے گا وہ راہ پہ سُن کر تمہارا حال
قربت کی آنچ سے اسے گلزار ہونے دو

رہنے دو اپنے نام کی تختی بھی اس جگہ
دو روز اور ہم کو گنہگار ہونے دو

دیکھیں گے کون کون مسیحا بنے گا پھر
ناہید ایک روز کو بیمار ہونے دو

✺

ہمیں تو جینے کی اُمید کا بہانہ ملا
فریبِ دوست تجھے آج پھر ٹھکانہ ملا

دبا گیا کوئی ماضی کی آگ کی بھوبھل
چمن کی آبرُو رکھنے کو شاخسانہ ملا

تمام رات منڈیروں پہ چاندنی دہکی
تمام رات کسی گھر میں رتجگا نہ ملا

کنوئیں بھی ختم ہوئے پنگھٹوں کا دور گیا
یہی سبب ہے کوئی تہہ میں جھانکتا نہ ملا

ہماری عُمر تو ہے بیل عشق پیچاں کی
ڈھلک پڑے گی اگر کوئی آسرا نہ رہا

تمام رات رہا آندھیوں کا شور مگر
کسی مکان کی کھڑکی کا دَر کُھلا نہ رہا

تمہارے شہر میں ہر اک اُداس تھا لیکن
کسی بھی لب پہ مگر حرفِ مدعا نہ ملا

---

*
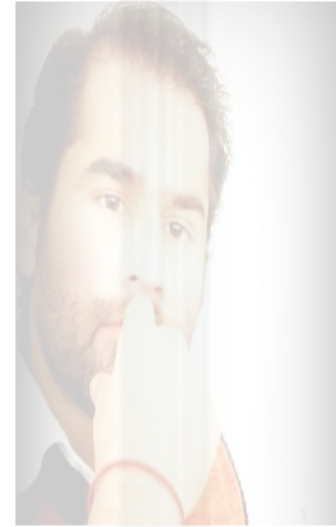
دِل بھی اندھے کی طرح اس سے لپٹنا چاہیے
شعلہ تا نبضِ جگر خُوں میں اُترنا چاہیے

کج رَوِش ہمدمِ غم، تابِ تمنّا پر کھے
نقشِ پا دیکھ کے رستہ ہی بدلنا چاہیے

خُشک آنکھیں ہیں تو بے رنگ رہے گی صُورت
چشمِ نم ہو تو ہر اک رنگ نکھرنا چاہیے

روشنی رنگ نہیں، دُھند کا دروازہ ہے
رنگ وہ ہے جو دھنک بن کے بکھرنا چاہیے

شب کے سُوکھے ہوئے گالوں پہ وفا کی سُرخی
شمعِ غم پھر تری یادوں سے بہلنا چاہے

بند ہوں دَر تو یہ دیوار گرا ڈالے گا
دل کا سیلاب کناروں سے نکلنا چاہے

ربط ہے ٹُوٹتے تاروں کا دِلوں کے غم سے
جاگتی آنکھ میں آنسو بھی ٹھہرنا چاہے

اُس کو پانے کی طلب آپ ہی دیوار بنے
دل کی آشفتہ سری جاں سے گزرنا چاہے

یہ بھی کیا رسمِ وفا ہی کی کڑی ہے ناہید
بادل کر کے مجھے، مجھ سے بگڑنا چاہے

دوہے

نا مَیں سُگھڑ نا صُورت والی، کِس کا مان کرُوں ری
جَل گندا ہے اپنے مَن کا، کیا بلیدان کرُوں ری

چیت جُدائی کا انگارہ، ساون آس کی بندی
کاتک چڑھے تو گھر آجیو، ساجن مَیں ہُوں اکیلی

جاگتے میں اِک سپنا دیکھا، جیون کا سُکھ دیکھا
دوج کے چاند میں سکھیو مَیں نے پریتم کا مُکھ دیکھا

ہریالی ہے جیون ریکھا بڑھتی اور پنپتی ہے
جیسے تیرے دھیان کی ندی بِن ساون بھی چڑھتی ہے

مَیں بہری تھی کاگا بولا، سُن نہ سکی سندیس
دِل کہتا ہے کل آئیں گے پیا بدل کے بھیس

ٹھنڈی رات اور ٹھنڈا بستر سکھی ری کاٹنے آئے
لوگ کہیں جو دُکھ سانجھے ہوں دل ہلکا ہو جائے

صُبح ہُوئے جگ بیت گئے ہیں کب سے رَین اڑی ہے
سُوکھ گئے ہیں لب پھُولوں کے ایسی اوس پڑی ہے

کیونکر پیار بڑھائے سکھیو، سوت کا رشتہ دُنیا میں
کبھی نہ ہووے اُتھلے کنوئیں کا پانی میٹھا دُنیا میں

ریشم سے بھی اُنگلی کٹ گئی، پتی کاڑھوں کیسے
جیون گگری بھاری لاگے، بوجھ اُٹھاؤں کیسے

اُڑتی چڑیا ٹھہر ذرا مرے دل کی کہانی سُن جا
روتی چھوڑ گیا مورا بھائی مُنہ سے نہ بولی میّا

بھائی مرے پردیس سُدھارے بہنیں ہوئیں پرائی
کس سے جا کے کہوں کہانی ساجن ہے ہرجائی

آنکھیں سُوکھیں، پتّھر بن گئیں پھول بنے انگارے
جس دن سے تم نین چُرائے، نیند نہ آئی دوارے

تپتے لمحے، دہکتے چہرے، سب کچھ دھیان میں لاؤں
پتّی پتّی جائے توڑوں، دل کا بوجھ ہٹاؤں

کاجل بن کے بسے ہیں سجنا اکھین بیچ ہمارے
تم ہی کہو پھر کیسے سکھیو کاجل بیچ سمائے

آنکھ میں سپنے تیرتے جائیں جب دَم دھیان جگے رے
رنگ بھریں کومل آشائیں اندر سبھا سجے رے

سُوت کے کچّے دھاگوں جیسے رشتے پہ اتراؤں
ساجن ہاتھ بھی چھُو لیں تو مَیں پھُول گُلاب بن جاؤں

گوری رنگت دیکھ کے میری، نام پوچھنے آئے
وہ بھی جو سارے گاؤں میں اپنے پہ اترائے

دیکھ کے روئیں روکر دیکھیں ہم تیری تصویر کو
کشتی بھرے تو ڈوب ہی جائے کیا کہیے تقدیر کو

کون بڑھے باتوں سے آگے کون کرے ہے گیان
کس نے بنایا آج تلک بھلا دریا بیچ مکان

تکیہ بھیگا ۔ سانس بھی ڈوبی ۔ مرجھائی ہر آس
دل کو راہ پہ لانے کی ہر آس بنی سنیاس

سچا پریمی ہونٹ نہ کھولے سدا جلائے آپ
پریت ہے ایسی بھٹی جس سے کبھی نہ نکلے بھاپ

بھائی مرا پردیس سے آیا ۔ ماں نے بنائی لسی
بیچ صحن میں پلنگ بچھایا قسمت چمکی گھر کی

بچہ میرا آئینہ ہے ، دل سے لگا کے رکھوں
پھول سے نازک مکھڑا اس کا ، اپنے پیار سے ڈھکوں

بیاہ کے جس گھر جاؤ بہنا ۔ رہو وہیں کی ہو کے
امر ہوئی تھی پریت میں سوہنی سب کچھ اپنا کھو کے

ساری رات میں بیٹھی جاگوں چاند بھی اٹھ کے دیکھے
پریتم پاس ہے میرے لیکن لمبی تان کے سوئے

آنکھ کی پتلی سب کچھ دیکھے ، دیکھے نہ اپنی ذات
اجلا دھاگہ میلا ہووے لگیں جو میلے ہات

پریم کیا اور ساتھ نہ چھوٹا کیسے تھے وہ لوگ
ہم نے تو پیاروں کا اب تک دیکھا نہ سنجوگ

دھوپ پڑی تو شبنم اڑ گئی ، وقت پڑا تو تم کھو گئے
کیسی ریت چلی یہ اندھی ، کوکھ جنے دشمن ہو گئے

اُلجھے سُوت کی انٹی دل ہے، سُلجھاؤ تو ٹوٹے گا
بھرا کٹورا لے کے چلو تو قدم قدم پہ چھلکے گا

مَیں وُہ چھوٹی ڈھوبری کوئی نہ رکھے پاس
دے گئے مجھ کو ساجنا بن کارن بَن باس

بیٹیاں چڑھتی دُھوپ ہیں آنکھیں دیکھ چُندھیائیں
جہاں جہاں بھی قدم رکھیں یہ پھُول وُہیں اُگ آئیں

چندن پھُول سجیں ہر پگ پہ، دیوے ہر ہر دوار
بھیّا مرا جب بیاہ کے لائے الہڑ سُندر نار

میکہ تو چنبے کی جھاڑی، بیٹیاں سجرے پھُول
سال کے سال بُلانا میکے، جائیں نہ بھیّا بھُول

میری چمکتی لونگ کا کوندا، جہاں پڑے
ہل والے ہل روک لیں ، راہی دیکھیں کھڑے

مٹّی کے تودے بھی اب تو بن گئے ہیں بھگوان
پانی جب سے عطر بنا ہے، اونچی ہے دوکان

جسم مرا آنکھیں بن جائے، ٹک ٹک دیکھوں ساجن کو
سوکھے کھیت پہ پانی برسے، چَین بھی آئے برہن کو

نیا تو نو دن چلے گا بی بی، پھٹے کو سینا سیکھو
رُوٹھے جو بھی منا کے اس کو پیار میں جھکنا سیکھو

روشنی ہو تو سائے جاگیں، بادل سے مینہ برسے
بھائی ہی جب بہنوں کو بھولیں، کون ہے کس کا ہووے

بے نام مُسافت

حرفِ ندا

طفل، آموختہ پڑھ کے بھی ہراساں ہوگا

سچ تو ہے

نعمتِ موہوم، کبھی لذتِ بے پایاں کا منبع نہ بنے

جانتے پہلے بھی تھے

رمزِ ملاقات کی یہ کوہ کنی

آبِ تسکیں کی فسوں سازی تو کیا کر پائے

کرمکِ حرص کا لمحاتی تعلق نہ بنے

یہ جنوں سازیٔ احساس،

حبابوں پہ کرے عرصۂ ہستی کو رقم

تیرے جانے کو بھی آنے کا بہانہ سمجھے

باقی ہر شئے کو ترے عکس کا جویا سمجھے

یہ اچٹتی ہوئی نظروں میں فسانوں کے خلاصے

یہ خیالات کی ریزش

یہ فنا اور بقا کے رشتے

جو کہ ہیں

اپنی حدوں میں محصوّر

بڑھ کے آ ملنے کی راہیں بھی نہیں

اور جو مل کے پلٹ آئیں، نگاہیں بھی نہیں

لحظہ در لحظہ، وہی آنکھوں میں کھلتی آنکھیں

وہ مرے بڑھتے تہالوں کی طرح

جذبوں کی حدّت

وہ اُلجھتی سانسیں

میرے مولا! مجھے ان خوابوں کو یوں جوڑتے رہنے کی تمازت سے بچا

نیند میں جاگتے رہنا بھی ہے

خورشیدِ قیامت سے سوا

میرے مولا! مجھے اس قُربِ قیامت سے بچا

اس کی تصویر نہیں، شکل دکھا!!

کچھ اگر ہے تو ملے

خواب میں آئے، مجھے مجھ سے ملائے

مجھے سیرابیٔ دیدار سے گلزار کرے

خواب وہ خواب کہ ہو جشنِ تمازت کا فسوں زاد

خواب وہ خواب کہ بن جائے شکستِ بے داد

کتنے ہی رنگ گھلے سُرمئی شام میں ایسے کہ شفق

خون کی آنچوں سے دہک کر پھیلے

آتے جاتے ہوئے لوگوں کی تگ و تاز بھی

اندیشوں سے الجھان لگے

جاگے خدشے بھی، خد و خالِ تمنا سے ہوں مبہوت

ہر اک عُزلتِ جاں، شوق کی شمشیر لیے

جھیل کے ساحلِ پایاب کو غارت کر دے

مرقدِ حیلۂ بے سُود مٹے

کچھ اگر ہے تو ملے

کوئی گر ہے تو چلا آئے ، مجھے مجھ سے ملائے

مجھے سیرابیٔ دیدار سے گلزار کرے

سلامت گہہِ خواب کو روند ڈالو

آگ اور برف کے درمیاں ، پگھلے لاوے کی صُورت

یہ آنکھیں ، ،

جو دِل کی کہی اَن کہی ہوتے دیکھیں

برس لیں تو اچھا ہی ہو

نمائش کی تحریر سے ، زندگی کی روایت نبھاتے

بہت عُمر گزری

بہت حوصلوں کی شکستوں کو پندار نے خامشی کے کفن میں لپیٹا

بس اب راستوں میں درختوں کی پرچھائیوں کا سندیسہ سمجھ لو

وہ دیوار گرتی نظر آ رہی ہے

صبا نے کہا ، پھول کھلتی ہُوئی رُت میں سونا تو دیوانگی ہے

نظر تو اُٹھاؤ ۔ یہ دیوار و در پہ اُگے سبز پتوں کی نس نس پہ ننھے سبز پتّے
یہ سُوکھی ہُوئی شاخ پہ بھی ہری کونپلوں کے نشاں
اجنبی نام سے، شکلِ مانوس کے آنکلنے کے شاہد ہیں
اُٹھو اور بھلا دو
وہ بے مہر ساعت
کہ جس نے بجھی خلوتوں کی سیاہی کو
حدت کی چُندھیانے والی شعاعوں سے، پگھلے ہُوئے برف کی شکل میں
بہہ نکلنے کے ہر راستے کو خرد زاد، سنگِ ملامت سے اَٹ کر
سلامت گہِ خواب کو روند ڈالا

اندھیروں کی تائید، تقدیسِ خوں کی علامت نہیں
شوق کو، عزم و امید کی سُرخ جھنڈی کے فتوے کی حسرت میں
تسلیمِ ایذا پہ مائل کرو گے
تو آنکھوں کے حلقے، تمہاری رفاقت کا نوحہ لکھیں گے

خُوشنُودیٔ غم

بے دلی، خجستۂ مکافات کا خمیازۂ آگاہی ہے
عجز کے نام پر پھیلے یہ طلسماتِ نیاز
جادۂ شوق کو بے نام مسافت کا نشاں بتلا کر
تتلیوں کی طرح پھر خواب کی پرچھائیں بنے
لذتِ وہم کو بھی کشفِ تعلق کا بھروسہ دے کر
جذبِ ادراک کے جیلے کو ابد ساز تعلق کی نمائش
کے خلاؤں میں بھٹکنے کے لیے
دست و پا، باندھ کے، آنکھوں کو مگر دیکھتے رہنے کی سکت دے کے
چلے جاتے ہیں

آنکھ کر دیکھتے رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر پاتی

دیکھتی ہے کہ یہ صحرا، سدا صحرا تو نہ تھے

یہ جو صحرا میں سُرابوں کے نشاں ملتے ہیں

یہ بھی افسونِ سکوں رنگ کے آسیب میں

جاں سوزی کے آثار،

جہاں پائے خرد بھی لرزے

یہ فقط ایک ہی لمحے کو حقیقت کی حدیں توڑ کے

مُٹھی میں دبوچے ہوئے بڑھنے کو

زماں اور مکاں سے کہیں آگے کا زمانہ سمجھیں

پھر جو بیتے اُسے غم دیدہ تعلق کا خرابہ سمجھیں

پس کہ ممکن نہیں اس آگ کے دریا سے گزرنا اپنا

کیا یہ ممکن ہے کہ یہ مُہرِ حجابات، وہ دیوار بنے

عجز کی غایتِ صد رنگ نہ کُھلنے پائے

فَبِاَیِّ آلاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن
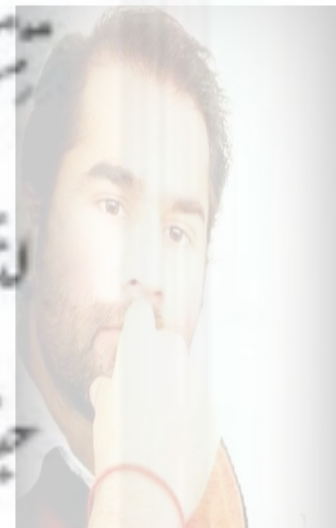
یہ بھی نعمت ہے کہ دیوانگی

ترتیبِ سراسیمگی، اندیشۂ حسرت کے سیہ خانوں سے

احساس کی قندیل لیے

رُتبۂ قرب کی جلوت میں

بہر طور اُجاگر تو ہوئی

یہ بھی نعمت ہے کہ تنہائی کی سوزش

طلب و وحشت کی دلدل سے گزر کر

کسی اک لمحۂ محسوس میں محبوس ہوئی

یہ بھی نعمت ہے کہ احساس نے پُوچھا مجھ سے

تم کو منظور ہے زندانِ بلا ہو جانا ؟

نارسائی کے تحیّر میں فنا ہو جانا ؟

یہ بھی نعمت ہے کہ یہ چشمِ نگوں سار ،

مہک اور جنوں خیز بہاروں کو نقابوں سے

نکلتے ہُوئے دیکھے ایسے

کہ ہر اک لفظ ، کہ تمثیلِ تمنّا کے لیے مشکل تھا

پھر تو پیکر کی طرح مجھ سے کہے ،

روشنی رُکتی نہیں ، آنکھ جھپکنے سے بھلا کیا حاصل !!

کچّے دھاگے

ہم حقیقت کے طالب

حقیقت سے آنکھیں چُرائے ہُوئے

دُور تک بھاگتے ہیں

اُٹھاتے ہیں وہ بارِ ہستی کہ جس کی

طلب بھی نہیں ، جستجو بھی نہیں

چاہتے ہیں اُسے ، جس میں چاہت کی خود خُو نہیں

منتظر ہیں سدا اُس کے

جس میں وفا کی ذرا سی بھی خوشبُو نہیں

ناصبُوری کی یہ داستاں

خود ستائی کا اِک آئینہ ہے

ہم اپنے ہی اندر چھپے ہر خلا کو

ہیولوں کی صُورت جگاتے ہیں

اور اپنے بدن کے لیے وہ پیالہ بناتے ہیں

جس میں ، ہمارے سوا ، سب کے چہرے ہوں ننگے

ہر اک شکل ، اصلی شباہت لیے

مُسکراہٹ کے مصنوعی جامے سے نکلے

ہر اک ہاتھ ، دستِ ستم کی نمائش کرے

وہ جو پھر اس اسیری سے اُکتا کے بھاگے

اُلجھ کے گرے اوندھے مُنہ اس طرح

کہ حقیقت کی اقلیم دھوکہ لگے !

کشیدِ شب

آج کی رات بھی پھر خواب جگائیں گے مجھے

پھر وہ کروٹ سے خیالوں کے تسلسل کو مٹانے کی کشیدہ کوشش

جسم کے درد کو سلوٹ میں سمو کے

وہی بستر پہ تڑپتے ہُوئے ، مجبوریٔ جاناں کو

کبھی آہ ، کبھی سانس کی گہرائی میں ، شَل کرنے کی

سعیٔ ناکام

یہ بھی معلوم ہے

یہ نیم رسی ، فہم کی دیوار تلک جست

یہ سائے کی تصویر ، کسی شکل و شباہت کے تسلسل کے نشاں ہیں لیکن

ناصبوری ، یہ بدن توڑتی انگڑائیاں

ہونٹوں پہ جھکتی لرزش

بات کو ربط کے آہنگ میں لانے کی طلب

میرے سینے کا دھواں، آنکھیں شرابور کیے

ہر بُن مُو کو ملاقات کا جویا کر دے

آنکھ چڑھتے ہوئے دریا کی طرح ہے پُر آب

پاؤں پھسلے ہے تو پھر سانس کا رشتہ نہ رہے

ہم تو چاہیں مگر اس دل کو یہ اچھا نہ لگے

جاں کنی، حد سے بڑھی، چارہ گرو، کچھ تو کرو!!

خزاں کا گیت

مجھ کو دیکھو تو پھر اس خیمۂ حرماں سے نکل کر دیکھو

دیکھو تو پیلے گلابوں سے بھی بڑھ کے

مرے رخسار کی پیلی رنگت

دیکھو وہ آنکھیں جنہیں خواب پرست

جھیل کہا کرتے تھے

اب وہی آنکھیں ہیں، غاروں کی طرح سے ویراں

اور وہی ہاتھ کہ جو تازہ شگوفوں سے بھی،

نازک تھے کبھی

آج سوکھی ہوئی روٹی کی طرح خاکستر

اور وہ نقشِ کفِ پا

کہ جو رستوں کو گلابی کر کے
دائمی رقصِ بہاراں کے امیں ہوتے تھے
آج ہیں اُجڑے دیاروں کی طرح
تم کہ ہو خیمۂ حرماں میں مقید اب تک
خود کو اک سایۂ شب کہتے ہو
اور پھر اپنے ہی سائے سے گریزاں بھی ہو
جھانک تو لو کبھی غم خانۂ دل کے اندر
اور کبھی دُنیا کا نیرنگ تماشا دیکھو
کُچھ نہ ہو تو یہ مرا اُجڑا سراپا دیکھو

شکستِ رنگ

مجھے مغلوب کرنے کو
مرے جذبات کے اندوختہ حیلوں کو اُکسا کر، وہ کہتے ہیں
تری آنکھوں، تری بانہوں میں
جنّت کے شگوفوں کی مہک
آسائشوں کی لذتوں کا لمس رہتا ہے:
مگر اب خواہشیں پاؤں پکڑتی ہیں
نئے خوابوں کے جالوں میں، اُلجھتے، سانس کہتے ہیں
کبھی تو پچھلے ہاتھوں کے تموّج میں سمٹ جانے کی ترغیب و اشارات کو
گزرتی ساعتوں سے ماورا ایسے زمانوں کی
فضا سمجھو

جہاں سائے سمٹ کر ایک ہوں

تسلیمِ جاں تک کی ہمک جاگے

کبھی ٹھہرو

کبھی بڑھتی ہوئی موجوں سے ہم آغوش ہوتی

تیز لہروں کی فنا ہوتے میں

یک جائی کی پنہاں سرخوشی دیکھو،

کبھی اس جبرِ بے انداز کے پھندے سے نکلو،

اور رچو اس میں کہ وہ خود تم میں رچنے کے لیے بیتاب، دائم ہے

رچاؤ ہاتھ میں اس طرح مہندی

لوگ کہہ اُٹھیں

اِسے چاہت کی بے پایاں تپش کی حدّتیں گلزار کرتی ہیں

رچاؤ ہاتھ میں اس طرح مہندی

یہ تپاں، ننگی ہتھیلی، اپنا پیکر

سُرخیوں سے ڈھانپ لے ایسے

کہ دل کے تشنگی آثار جذبے بھی

تذبذب کے دھندلکوں سے نکل کر

روز و شب کی نغمگی کو جذب کرنے پر ہوں آمادہ۔

مگر رنگوں کو آخر،

جبرِ بے رنگی کا خمیازہ مقدر ہے

اگر یوں اپنے ہاتھوں سے لگائی مہندیوں کے رنگ اُڑ جائیں

تو پھر حسرت زدہ آنکھیں کسے چاہیں

کسے پابندِ در سمجھیں

کسے ڈھونڈیں!!

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْن

بھرے شہر میں اپنی تنہائیوں کو گلے سے لگائے
بہت خوش تھے ہم، کہ تحیّر کے صحرا میں
کم مائیگی کے سوا کچھ نہیں
زندگی تیرگی کے سوا کچھ نہیں
قناعت کے تابوت میں
شوق کے ہر ہیولے کی تدفین ہم نے ہی کی
ہمیں نے طلسماتِ خواہش کی دلدل کو
حکمت زدہ استواری کے ملبوس میں ڈھانپ کر
ہر بدلتے افق سے شناسا کیا

زندگی کا کنول پتیاں پتیاں ہو کے
پانی پہ تازہ ہے اب بھی
مگر وہ کنارا کہ جس پہ مچلتے ہوئے
ہاتھ، پانی
گُل و گُل
بہر اک بہتی کشتی کو چھیڑیں!— بہت دُور ہے!!
زندگی کا نشاں اس سے بھی دُور ہے!
قہقہے، مسکراہٹ
سخن فہمیوں کے در و بام نعمت ہیں
اِن سے بہرہ مجبولیاں!!
خرقۂ شوق، دریوزۂ غم بھی ہونے کے قابل نہیں
اب ہنسو
پھر ہنسو
یوں ہنسو
کہ کنول، پتیاں پتیاں ہو کے پانی پہ تازہ رہے!!

قصّہ سوتے جاگتے کا

تمنّا سے مبہُوت ہو کے ، دُعا ساز حسرت نے
مُجھ سے کہا تھا :
مرے دُکھ کے ہر مورچے پر ، مجھی کو
کبھی زندگی کے حقائق سے ،
اور کبھی اپنی ہر پیاس سے
روز و شب ، جنگیں لڑنی پڑی ہیں -
مری حسرتِ جاں
تجھے تو خبر ہے
متانت کا احرام ، میرا لبادہ نہ تھا
پر مسیحا نفس دستکوں کو
ہواؤں کی شوخی پہ محمول کرتے ہُوئے
خندقِ دل میں چھپ کے
ہر اک سر اُٹھاتی تمنّا کی آنکھوں میں
بے رحمیوں کی سلائیں چبھوتی رہی ہوں

مُجھ کو معلوم ہے
مگر دعا ساز حسرت
مرے ہر الم ، ہر تذبذب کو
مجبوریوں کی المناکیوں سے نکالے
تو اس خاک سے خوشبوئیں پھُوٹ اُٹھیں
معانی کے صحرا میں چشمے ہوں جاری
وہ اولادِ آدم کا طوفان اُمڈے
ہر اک در ، ہر اک بام
مجنونِ خود رفتہ کی گردنوں سے پٹا ہو ،
اگر تو کہے اے دُعا ساز حسرت
تو میں پھر تمنّا سے مبہُوت ہو کے
سجاؤں لب و چشم
جشنِ ارادت کا ساماں کروں !

آگہی

پلے تھے ہم کوٹھڑی کے اندر
کہ جس کی دیوار ٹیڑھی ہو کے
ہزار کونوں میں بٹ چکی تھی
کہ جس کی کڑیاں ہماری ماں کی کمر کی صورت جھکی ہوئی تھیں
کہ جس کا دروازہ، تیل سرسوں کا پی کے کھلتا تھا، بند ہوتا تھا
دو کواڑ جس کے، ہزار بھیدوں کا آئنہ تھے
مگر وہی کوٹھڑی
جہاں پہ ہوا گزرنے کا راستہ بھی کوئی نہیں تھا
ہماری بالیدگی کا منبع بنی

ہماری ماں نے ہمیشہ روٹی پکائی ایسے
کہ ایک تھا پیٹ میں تو اک
گود میں ہمکتا
مگر نہ حرفِ گراں کبھی اس کے لب پہ آیا

میں آپ ماں ہوں
مگر مرے لختِ جاں کو،
آیا کی گود کی گرمیوں نے پالا
مجھے تو آرام ہے، کہ ہر روز منہ اندھیرے
وہ سامنے والی بیکری سے
منگا لوں میں ناشتہ جو چاہوں
پلک جھپکنے میں، جا کے بازار سے خریدوں
جو چیز چاہوں
مجھے خبر ہے
اگر یونہی، میری ماں کی صورت
مری کمر بھی جھکی تو کوئی نہ ساتھ دے گا
نہ ممتا کے مزار پر فاتحہ پڑھے گا

غرض کے بندھن ہیں سارے رشتے
نہ مامتا نہ دلار کچھ ہے
نہ تیرا میرا ہی پیار کچھ ہے۔

طلسم آباد کی ایک شام

مَیں جو دو چار ہوئی خود سے
تو دیوانہ ہنسی تھی محور،
حیلۂ جاں تھا، جہاں تابیٔ حیواں کا طلسم
یات کے رنگ، تھے
رنگوں کے تھے منظر اتنے
کہ ہر اک رُخ میں تھے رُسوائی کے جلوے رقصاں
ہر بُنِ مُو میں تھیں، ترسیدہ اُمنگیں لرزاں۔

اب یہ افسانۂ خود
لب پہ اگر آ جائے

ہر تمنا کے لہو سے وہ قیامت جاگے
کہ ہر اک سنگِ گراں
ریزۂ بے جان بنے ،
زیست کو رشتۂ آزار نیا مل جائے
مجھ کو آ کے مری تصویر کوئی دکھلائے
پھر طلسماتِ عدم زاد بنیں حیلۂ جاں
تاب و تسلیم کی کلیاں مہکیں
پھر ہنسی، رنگ بنے ، نور بنے ، صورتِ مبہوت بنے ۔

مدِ مقابل

نویدِ دید سے تمہیدِ گفتگو کی طلب
ہے فاصلوں کے حجابوں کی اولیں مقراض
ہے زندگی کے سرابوں کا سرمگیں احساس

جفا فروش، یہ قرضِ طلب ہے رشتۂ جاں
یہ شوقِ نفس نہیں اور تلاشِ لمس نہیں
میں جانتی ہوں کہ یہ رشتۂ ہوس بھی نہیں
مگر یہ لطفِ مسلسل عذاب ہے جاں پر
مرے حریف بنو تو میں تم کو چاہوں بھی !!

طلوُع

طلوُعِ وحشت عجب سماں تھا

برہنہ شاخیں بھی سرکشیدہ

نژاد امید کے فسوں میں

خزاں کے عفریت کو کُچل کر

دبے قدم آگے بڑھ رہی تھیں

دراز مدّت سے ، بند در سے

گراں ہوائیں نکل رہی تھیں

ہر اک غلافِ سکوت ،

بوسیدگی کا آئینہ بن رہا تھا

دراز سائے ، سحر نما شام کے دھندلکوں

میں چھپ گئے تھے

عکس نما

ہم وہ معصوم تھے

جن کے لیے اِلہام ہر اک فقرہ تھا

ہر چمکتا ہُوا چہرہ تھا خُدا

ہر مہکتا ہُوا دامن، فردوس

ہر نظر گوشۂ اُمید و خبر

ہر قدم مژدۂ تمہیدِ جزا

ہم نے جب آنکھ کی تحریر کو پڑھنا سیکھا

ہر چمکتے ہُوئے چہرے کی جبلّت ڈھونڈی

ہر مہکتے ہُوئے دامن کو پکڑنا چاہا

ہر نئے نقش سے قسمت کو سمجھنا چاہا

جذبِ موہُوم تھا افشارِ گلو

شوقِ زنجیر تھا
اُمید سزا تھی اپنی
چاہتیں دام تھیں
آہٹ بھی صدا تھی اپنی
لب نہ ہلتے تھے
نہ آنکھوں کے دِیے جلتے تھے
لمحے سہمے ہُوئے، چُپ چاپ گُزر جاتے تھے
نقشِ محبُوب، ابُوالہول نظر آتے تھے

اب تو فرخندہ جفا کار ہیں ہم
اب تو پڑھ لیتے ہیں ہر سادہ ورق کی تحریر
اب نہیں کرتے وفا کی تقصیر
اب ہر اک شخص سے ملتے ہیں بدل کر شکلیں
اپنے قابو میں ہیں اب فتنۂ شب کی سوچیں
اب ہمیں خوفِ ہلاکت بھی نہیں
اب کوئی آئینہ، معیارِ عدالت بھی نہیں

دشتِ صبا کا سپنا

ہم بھلا کیوں کششِ اصل سے محروم رہے
کیا ہمیں خود ہی اذیت سے محبت تھی بہت
یا ہمیں مرحمتِ غیر کی حاجت تھی بہت
یا کہ تھا فاصلہ ایسا کہ قدم ساتھ نہ اُٹھ سکتے تھے
یا کہ مخفی تھا مرا حال تری آنکھوں سے
یا مری خود نگری طوق بنی میرے لیے

کوئی سُن لے تو کہے
دشت میں جا کے پکارو گے تو محروم صدا
اشکِ گلابی بن کر
تپتے رُخسار کی تقدیر ہی بن جائے گی

شوق زنجیر تھا
اُمید سزا تھی اپنی
چاہتیں دام تھیں
آہٹ بھی صدا تھی اپنی
لب نہ ہلتے تھے
نہ آنکھوں کے دیے جلتے تھے
لمحے سہمے ہُوئے، چُپ چاپ گزر جاتے تھے
نقشِ محبوب، ابُوالہول نظر آتے تھے

اب تو فرخندہ جفا کار ہیں ہم
اب تو پڑھ لیتے ہیں ہر سادہ ورق کی تحریر
اب نہیں کرتے وفا کی تقصیر
اب ہر اک شخص سے ملتے ہیں بدل کر شکلیں
اپنے قابو میں ہیں اب فتنۂ شب کی سوچیں
اب ہمیں خوفِ ہلاکت بھی نہیں
اب کوئی آئینہ، معیارِ عدالت بھی نہیں

دشتِ صبا کا سپنا

ہم بھلا کیوں کششِ اصل سے محروم رہے
کیا ہمیں خود ہی اذیت سے محبت تھی بہت
یا ہمیں مرحمتِ غیر کی حاجت تھی بہت
یا کہ تھا فاصلہ ایسا کہ قدم ساتھ نہ اُٹھ سکتے تھے
یا کہ مخفی تھا مرا حال تری آنکھوں سے
یا مری خود نگری طوق بنی میرے لیے

کوئی سُن لے تو کہے
دشت میں جا کے پکارو گے تو محروم صدا
اشکِ گلابی بن کر
تپتے رُخسار کی تقدیر ہی بن جائے گی

شوقِ زنجیر تھا
اُمید سزا تھی اپنی
چاہتیں دام تھیں
آہٹ بھی صدا تھی اپنی
لب نہ ہلتے تھے
نہ آنکھوں کے دیے جلتے تھے
لمحے سہمے ہُوئے، چُپ چاپ گزر جاتے تھے
نقشِ محبوب، ابُوالہول نظر آتے تھے

اب تو فرخندہ جفا کار ہیں ہم
اب تو پڑھ لیتے ہیں ہر سادہ ورق کی تحریر
اب نہیں کرتے وفا کی تفسیر
اب ہر اک شخص سے ملتے ہیں بدل کر شکلیں
اپنے قابو میں ہیں اب فتنۂ شب کی سوچیں
اب ہمیں خوفِ ہلاکت بھی نہیں
اب کوئی آئینہ، معیارِ عدالت بھی نہیں

دشتِ صبا کا سپنا

ہم بھلا کیوں کششِ اصل سے محروم رہے
کیا ہمیں خود ہی اذیت سے محبت تھی بہت
یا ہمیں مرحمتِ غیر کی حاجت تھی بہت
یا کہ تھا فاصلہ ایسا کہ قدم ساتھ نہ اُٹھ سکتے تھے
یا کہ مخفی تھا مرا حال تری آنکھوں سے
یا مری خود نگری طوق بنی میرے لیے

کوئی سُن لے تو کہے
دشت میں جا کے پکارو گے تو محروم صدا
اشکِ گلابی بن کر
تپتے رُخسار کی تقدیر ہی بن جائے گی

یم بہ یم
آنکھ میں ٹھہرے اشکوں کے صحرا نما سیل ہیں
عمرِ درباختہ کو چھپانے کے لاکھوں قرینے
بشارت کے آہنگ سے نابلد ہیں

اثبات

میرے ویرانۂ تن میں جاگا
زیست کا کامنی احساس
سبک ساریٔ ساحل کا فسوں
اور بے پایاں اُمڈتی ہوئی لہروں کا زبوں
مجھ سے پوچھا مرے ہر انگ نے
اب تو بولو!
کیا تمہیں پھول کے کِھلنے کا سبب ہے معلوم
یہ ہنسی
اور مچی صحن میں دُھوم

نفی

میں تھی آئینہ فروش
کوہِ اُمّید کے دامن میں
اکیلی تھی زیاں کوش
ثریا کی تھی ہمدوش
مجھے ہر روز ، ہمہ وقت تھی بس اپنی خبر
میں تھی خود اپنے میں مدہوش

میں وہ تنہا تھی
جسے پیر ملانے کا سلیقہ بھی نہ تھا
میں وہ خود بیں تھی
جسے اپنے ہر اک رُخ سے محبت تھی بہت
میں وہ خود سر تھی
جسے "ہاں" کے اُجالوں سے بہت نفرت تھی
میں نے پھر قتل کیا خود کو
پیا اپنا لہو ، ہنستی رہی
لوگ کہتے ہیں ہنسی ایسی سُنی تک بھی نہیں

روایت نہ ٹوٹے

ہم روایات کی کہنہ صدیوں کے پربت تلے
وہ گھنے سبز جنگل ہیں جو
بے پنہ شاخ در شاخ تابندگی
تازگی کے تموّج سے سنولا کے
خود ہی جھلس جائیں
ایسے جلیں —— ایسے جلیں
کہ فقط دُور تک کوئلہ کوئلہ ہی دکھائی دے
اور تازگی کی نمو
خاک سے بھی گواہی نہ دے
وہ مقدّر کے اچھے

کہ جن کو جلاپے کی مدّت گزرنے پہ
ان کوئلوں کی جگہ، ہیرے موتی ملے
وہ مقدّر کے اچھے

کہ جن کی دُعائیں، زمیں کی تہوں میں دبیں
تو کہیں سونا چاندی بنیں
وہ مقدّر کے اچھے

کہ جن کے بدن، کھولتے خوں کے چشمے تھے
اب بھی ہیں
پارے کی کانوں کی صُورت کہیں
تو کہیں - ایسے بھی سخت جانوں کے ہیں سلسلے جا بجا
جن سے فولاد کا نام پائندہ ہے

وہ جلن جو کبھی تازگی کے تموّج سے پیدا ہوئی
ہے مقدّر کی تحریر ایسی کہ جس کی جلن ابتدا
انتہا بھی جلن
جلتے رہنے کا یہ سانحہ بھی جلن
انجمن، انجمن.

چودھویں رات کے چاند نے بھی کہا

بھیگی برسات کے رعد نے بھی کہا

تم وہی ہو کہ جن کو چٹخنے کی مہلت بھی ملتی نہیں

اب روایت یہی ہے

بجھاؤ ــــ ہنسو

مُسکراؤ ــــ جلو

ہر اک زرد چہرہ گلابی کرو

مگر یاد رکھو

روایت نہ ٹُوٹے

تموّج کی ہر تازگی لاکھ جھُلسے

روایت نہ ٹُوٹے

زوالِ استحصال

یہ ہاتھ جن میں رگیں اُبھر کے

خزاں کی آمد کی نامہ بر ہیں

رگیں، کبھی یُوں تپش زدہ تھیں

کہ جیسے سیّال آگ

بے آب مچھلیوں کی طرح ہو بے کل

یہ ہاتھ اُٹھے نہیں دُعا کو

یہ ہاتھ، دستِ طلب کی صُورت

کہیں سُبک سر نہیں ہُوئے ہیں

یہ ہاتھ اپنی ہی آرزوؤں کے

قاتل و ناخُدا رہے ہیں

یہ ہاتھ کہ جن کی انگلیوں میں
مشقتوں کے عذاب نے
ہر گرہ کو چپٹا بنا دیا ہے
ہر ایک ناخن، شکستہ ساحل کی شکل میں
بدنمائی کا آئینہ بنا ہے
یہ میرے اچھے دنوں کی تصویرِ ابتدا ہے

نئی شرطیں

بدلنا جو چاہو
تو اپنے ہی ہاتھوں کی جنبش کو بدلو
سمٹنا جو چاہو
تو اپنے گریباں کا خود چاک دیکھو
لچکنا جو چاہو
تو پھر لغزشوں سے مرصع یہ رفتار بدلو
سنورنا جو چاہو
تو خوابوں کی شہزادگی کے ابھرنے پہ شکرانہ بھیجو

حال کو اپنی تصویر سے یوں علیحدہ کرو
کہ تمہیں اپنے پیروں کے نیچے
تمہارے ہی سائے کا نقطہ ملے

اُفق بدلتا آسماں

پلک میں شب زاد جانگدازی
وہ حرف و صُورت کے رُوپ دھارے
کہ پتھروں کو بھی موم کر دے
پلک میں صرصر کا ایک جھونکا
پلٹ دے آ کے بساطِ کاکل،
کہ دل یہ چاہے
کوئی ذرا سخت اُنگلیوں سے
ان اُلجھے بالوں کو پھر سنوارے
پلک میں اک تیرگی کا بادل
اُداسیوں کی سبھا سجائے

پلک میں وہ آئے اور جائے

پلک میں یوں روئے، مسکرائے

کہ ساتِ رنگوں کی چھایا بن کے

مجھے بس اک پل کو چھب دکھائے

میں سو رہوں تو مجھے جگائے

جو جاگتی ہوں، تو اک پل بھی نظر نہ آئے

بھیگی ہوئی آنکھ میں

تو کسی جنوں کی ستیزہ کاری کی جھلکیاں ہیں

تعبیر

وہی ہے شنگرفی رنگ سُرخیٔ غم کا

وہی ہے چاند کے چہرے پہ جانکنی کا حصار

وہی ہے زرد روپتوں کے ٹوٹنے کا سفر

وہی دل میں تماشائے خستگی کی چبھن

وہی ہے ٹھہر نہ سکنے کا زندگی کا چلن

وہی ہے فصلِ غمِ ناتمام کا عالم

وہی ہے صبحوں کی تابندہ رنگتوں کی سبھا

وہی ہے جلتی دوپہروں میں عکسِ دل زدگی

وہی ہے قرمزی شاموں میں حدّتِ مثبت

وہی ہے ڈھلتی ہوئی رات اذنِ بے مایہ

وہی ہے قرب کی چاہت، سپردگی کی تڑپ
وہی فلک کی ہے رنگت وہی ہے راہگذر
مگر وہ شخص کہ جس کے لیے یہ سب کچھ تھا
وہ میرا نام درختوں پہ لکھ کے چھوڑ گیا

اب پہرے بیکار ہیں

خزاں خوردگی سے
جواں سالیٔ شب
آئینہ مانگتی ہے

ہراساں ہے شب
کہ ان دیکھے سویرے
کہیں اس کی شفاف تیرہ شبی کو ملوث نہ کردیں
کہیں کوئی دامن اُلجھ کے گریباں کی صُورت نہ بن جائے
کہیں ملگجی دھند میں نو دمیدہ شگوفوں کو بھی
زندہ رہنے کا رستہ نہ مل جائے
کہیں خواب، تعبیر سے آشنائی نہ کرلیں

یہ شب، جو زمانے سے ہم پر

سراسیمگی اور اندھیرے کا جادو چلائے ہوئے ہے

یہ شب، جو ہمیں آس کی ڈوریوں سے ٹِڑا کر

نئے جال میں دلنشیں طور پر، قید کرتی رہی ہے

یہ شب، جو ہر اک گھر کے دالان میں

مشعلوں کی زبانوں کی دشمن رہی ہے

یہ شب، جو کہ "کل" اس زمیں کے جیالوں کی

آنکھوں کا پردہ رہی ہے، پناہ مانگتی ہے، ہراساں ہوئی ہے

یہ کیا راز ہے

کیا یہ شب کے بڑھاپے کا آغاز ہے ؟

کڑے کوس

حرف،

گویائی کی زنجیر میں جب قید ہُوا

اِسم بنا

عہد بنا

نظم بنا

قصۂ کام و دہن کا غمِ مطلُوب بنا

خوب و ناخوب بنا

حرفِ ناگفتہ

مگر ذہن کا آزار بنا

دل کی دیوار بنا

راہ دشوار بنا۔

قصۂ شوق کی وارفتہ کہانی نہ بنا

حیلۂ وصل کی غم دیدہ نشانی نہ بنا۔

دار ہے منزلِ گویائی

سبھی جانتے ہیں

حرفِ ناگفتہ کے یہ زخم مگر میرے ہیں

جن کو تنہائی مری،

مجھ سے سوا، جانتی ہے

سنیاس

دل نہیں مانگوں

دل جو گیا، پھر کس نے پایا

وعدہ نہ چاہوں

وعدہ، رات کے ساتھ ہی ڈوبا

ساتھ نہ چاہوں

ساتھ تو سائے کا بھی جھوٹا

حق نہ جتاؤں

چیز پرائی پر حق کس کا

بھول نہ پاؤں

ہر دُکھ ، جی کے روگ سے اچھا
کب تک پُورے چاند کو پُوجوں
کب تک اپنے ہاتھ کو دیکھوں

رسم

تمہیں دیکھ کے میری آنکھوں میں
حِدّت کی تازہ شعاعیں جو پھُوٹیں
مرے ہونٹ، تازہ شگوفے بنیں
تو تمہیں یوں لگے
کہ ہر اک آنے والے کا سواگت
کروں مَیں یونہی

تم کہو
کیا تغیّر ہر اک دَور کو موسمِ گُل بناتا ہے
کیا دِل ، ہر اِک آنے والے سے مل کے دھڑکتا ہے

کیا ، ہر اک آشنا
شکل سے آشنا
واقفِ دیدہ و دل بھی ہوتا ہے یُوں
کہ اُسے دیکھ کے
جاگیں آنکھوں میں حدت کی تازہ شعاعیں

رسم ہے یہ کہ جس سے ملو
اُس کی چاہت خریدو
نفس در نفس اس کی سانسوں میں خوشبُو کی صورت بسو
اس کو بے بس کرو ، مُسکراؤ
تو پھر یوں کہو
مُجھ سے پہلے تھے کتنے وہ خوش بخت
جن کی رگوں کے اندھیروں کو تم نے منوّر کیا ۔

آتشبازی

تم کو مُجھ سے بے انداز ہے پیار اگر تو
میری تنہائی جھلسا دو
میرے گھر کی دیواروں پہ رقمِ حقارت
آ کے مٹا دو
میری تنہائی ہے
میری آنکھ کی پُتلی
اس کو حسنِ بصیرت بخشو
میری شامِ عروسی سجاؤ

شامِ عروسی
جب تاروں کی جھلمل کا یا

مرد کے ہاتھ میں قبضۂ قدرت دے کے سُدھارے

جب عورت کی زباں پہ

لاج کے صد آشوب ٹھہر کے سوانگ رچائیں

پھلجھڑیوں کی بارش جاگے

آتش بازی رنگ جمائے

ساری عمر کی آتشبازی . . .

چوں بروں آمدم از چاہ بہ زنداں رفتم

مَیں حد سے بڑھ جاؤں تو

پھر تم ہی کہو گے

باؤلی ہو ، یوں دُنیا سَو سَو نام رکھے گی

کس سے ملو گی ، کس سے کہو گی

مَیں تو ہار گئی تھی خود سے

کاہش سے بے حال ہوئی تھی

کیا ان گھڑیوں کا گزرنا

یادوں کے نایاب گہُر

آغوشِ بیاباں

اندھی سیاہی
گھور اماوس
اور بھلا کیا بن کے رہے گا
دروازہ جو اندھی آندھی کھول گئی ہے
بند اُسے اب کون کرے گا
مَیں تو تنکے کی صُورت، لرزیدہ ہُوں
دہشت کی کونپل، اب جھاڑی بن کے
میری چوکھٹ پر آگ آئی ہے

سَراب

ہو آئینے کی طرح، جن کی اصلیت کا فریب
نہیں کُھرچ کے بھی دیکھو تو کیا ملے گا بھلا
بس اب تو سُرخیٔ رخسار بھی فریب محض
لبوں پہ کِھلتی ہنسی بھی فریب
غم بھی فریب!
دِلوں کی بات بھی جھوٹی، فسونِ چشم فریب
ہر ایک ساعتِ دیدار وہم، وعدہ فریب
ہر ایک مژدۂ دشوار ہیچ، دعوے فریب
سکوتِ شب کا فسوں بھی فریب، صبح فریب

ہر ایک رنگ میں تازہ بدلتے رنگ کی رَو

رواں ہے یوں کہ سفیدی سیاہیوں سے الگ

دکھائی دے تو فریب نظر لگے وہ بھی

مگر وہ سُرخی شفق کی سیاہ بادل پہ

فریبِ لمحہ ہے لیکن حسین لگتی ہے،

یہ زندگی تو یونہی پینترے بدلتی ہے

رُوح کا بوجھ

اب حسِ وفا، آئینۂ شوق سے بیزار

تدبیرِ رہِ ہست کی یک رنگئ آہنگ سے

پتھرائی ہوئی آنکھ کی صورت ہے

سزاوارِ شبِ تار۔

اِک سائے کی صُورت ہے ہر اِک شکل کا احساس،

آنکھیں نظر آئیں

تو خدوخال کا نقشہ نہیں جمتا

اب خود کو بھی خود سے ہی

چھپائے نہیں بنتا

اب زیست ہے صحرا کے سرابوں کی طرح

رونقِ احساس،

جینے کی ہوس، مشکبِ رفاقت سے ہے عاری

اب رشتۂ دل، لطف و عنایت سے ہے عاری

تمہیدِ ستم اب تو مداوا نہیں غم کا

کچھ کشف تمہیں ہو تو بتاؤ کہ یہ کیا ہے!

تمہید

ابھی تو نغمہ لبوں پہ آنے کے

سُر کی ہر جستجو میں گُم ہے

ابھی تو خواہش نے سر اُٹھا کے

نمو کے پھیلے ہوئے سمندر کو

آزمانے کا دَم بھرا ہے

ابھی تو آنکھوں نے دیکھنے کی طلب کا کاسہ

اُٹھا لیا ہے

ابھی تو لرزش ہے انگلیوں میں

ابھی قدم منجمد ہیں یا پھر فسوں زدہ ہیں
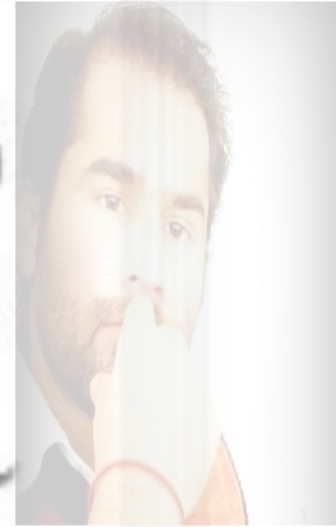
ابھی مسافت کی راہ آساں نہیں ہوئی ہے
ابھی ترے جاگنے کے دن ہیں
ابھی مرے جاگنے کے دن ہیں

خُود اذیّتی

کاش کوئی جھونکا ایسا ہو
میری شکل کی رونق لے کر
میلے، گدلے، اندھے کنوئیں میں پھینک دے جاکے،
کاش مری آنکھوں کے تارے
یوں اُلجھیں یہ رات کی تاریکی بھی
ان کے نام سے بھاگے
کاش مرے لہراتے بازو
خوف سے یوں جامد ہو جائیں
جیسے ٹھہرا کندن چمکے
کاش مرے ہونٹوں کی لالی

کالی رات کی دیوی ڈس لے
کاش مری سوچوں کے دھارے
ریت کی صورت
چوس لیں خود اپنی ہی گرمی
کاش مری آنکھوں میں خواب، نہ پھیلیں آکر
کاش مجھے احساس کی تصویروں سے
بیزاری ہو ایسی
اپنی نفی پہ ناز مجھے ہو

سلاسل

رشتۂ جاں ہے
فقط سانس کی زنجیر کا نام
رشتۂ دل ہے
فقط آنکھ کی تحریر کا نام
رشتۂ خوں ہے
فقط اپنی ہی تصویر کا نام
رشتۂ غم ہے
فقط حلقۂ دلگیر کا نام

یہ اُڑتی ہُوئی موجوں سے
لپٹتا ہُوا کف

یہ ہواؤں سے گلے ملتے ہُوئے
خاک کے ذرّے
یہ ہر اِک راہ پہ
شاخوں سے الگ ہو کے
سراسیمہ بکھرتے پتّے
جبر کی سِل پہ
کُچلتے جذبے
یہ مری خواہشِ نایافت کی
تحریریں ہیں
یہ ترے جذبۂ اُمید کی
زنجیریں ہیں

جانتے بُوجھتے

پا برہنہ ، سر او بام کھڑی ہوں تنہا
مُدّعا ، شوق کی تفسیر نہیں ، غم بھی نہیں
دِل کی بربادی کا ماتم بھی نہیں
جانکنی ، دیدۂ پُرنم بھی نہیں

پھر بھی ژولیدہ تسلط ہے
شکیبائی کا
پھر بھی بے رنگ ہیولٰے ہے
شناسائی کا

پھر بھی رنگت گلِ شب رنگ سی ہے
وہم کی غایتِ موہوم
رگِ سنگ سی ہے!

بات کا درد

پربتو!
ان کہی بات کس سے کہو گے
ہواؤں سے
جو اُلجھے اُلجھے خیالوں کے تیزاب سے بچ نکلنے کی خاطر
زمانے کے ہر دُکھ سے دامن بچا کر
خلاؤں سے اپنے تعلق پہ نازاں ہُوئیں
کہ اُس پا شکستہ اُڑتی ہوئی، گردشوں میں مقیّد
ہر اک لہر سے، جو پلٹ کے بھی فریاد کر نہ سکے

جو اگر چیخ کر، گردشوں سے بغاوت کرے
تو بھی گرداب کی گود میں ناچتی خواہشوں کے جنازے کو تکتی رہے

ان کہی بات بھی، رینگتی جانکنی کے کچوکوں سے کم تو نہیں
یہ سُلگتا ہُوا زہر، جسموں کو ویرانیوں کے کنارے پہ لا کر
ہر اک کشتیٔ آرزو جلا دے
یہ اُمڈے ہوئے سیل کو خُشک صحرا بنا دے

پربتو!
تم خیالوں کی انگڑائیاں ہو
تمہیں کیا کہ اس سمت، گھاٹی کی جانب
جوانی، نئے سال کے آخری دن کی صُورت
مضطرب تلخیوں کی فراموش گاہیں سجاتی رہی ہے
ان کہی بات کا درد دل میں چھپاتی رہی ہے

پیش بندی

پھر نظر آئی ہے
جینے کی وہ صُورت، کہ ہے جس میں شامل
دل کی دریوزہ گری
ذہن کی آشفتہ سری
غم کو بہلانے کی سعیٔ ناکام
اس سے دُوری میں بھی قُربت کی تپش
اور پھر قُرب میں حائل وہی دُوری
کہ نہیں جس سے مفر۔

جسم کا اندھا کنواں
یاد کی گیلی مٹی

یہی دولت ، یہی عُسرت
یہی نیکی تو یہی رُسوائی
تشنہ کامی کے سمندر میں چھپالو خود کو
اس کو دیکھو گی تو پھر اس کی طلب
چین نہ لینے دے گی ۔

خواب میں خواب کا ڈر

کس نے کہا تھا اُن سے ملو
بات بھی کرو
اینٹوں کا رنگ سُرخ ہے
دیوار بھی ہے سخت
دیوار پر جڑی ہُوئی شیشے کی ٹکڑیاں
نازک ہتھیلیوں کو کریں گی لہو لہان
آنگن میں اُس کے جھانکنے دیں گی نہ رات کو
اب تو ہَوا کے ساتھ بھی باتیں کرو گی تم
دن میں تو دفتروں کے مشاغل بہت سے ہیں
راتوں کو دِل کا چور نہ سوئے نہ سونے دے

ناگزیر

جب چلے تازہ شگوفوں کا جمال
جب نگاہوں سے چھلک اُٹھے دلوں کی حالت
جب قدم بھی کششِ منزلِ جاناں کھو دیں
دلِ وحشی کبھی ادراک کی اُنگلی پکڑے
راستہ ڈھونڈنے نکلے تو تماشا بن جائے
زیبِ امکاں سے گریزاں ہو ہر اک خوابِ وفا
جب تمنا صدفِ غم میں ہی محصور رہے
جب مقدر شبِ دیجور رہے
جب کہ دیوانے نہ اُلجھیں کبھی زنجیروں سے
شہر، طوفان کی زد میں ہو گا!

خود کلامی

عجیب آنکھیں ہیں
دن کو ہنستی تو رات کو خواب میں برستی ہیں، جیسے یکدم
بھرا کٹورا کوئی اُلٹ دے

عجیب زباں ہے
چلے کترنی سے تیز ایسے
جیسے دریا میں لہریں اُٹھیں
مگر جو کوئی ستم پڑے تو
زباں تو کیا آنکھ سے بھی اظہار ہو نہ پائے

عجیب دِل ہے

د ہر دُکھی دل کی داستاں سننے بیٹھ جائے
نہیں ہے معلوم ہر دُکھی دل کی یہ کہانی
تو گفتگو کے لیے ہے زینہ
نہیں یہ معلوم
ہر کوئی تو اسی طرح سے قدم قدم پر نثار ہوتا ہے
ہر ادا پر

انا کی قندیل گُل کرو بھی
یہ دُہری صُورت کے رنگ یک جان کر بھی ڈالو
بدل بھی ڈالو لباسِ عادت
یہ ادّعائے وفا نما کس لیے ہے آخر!!

کنوار پنے کی سوچ

جواں لڑکیاں ٹین کی چھت کے اُوپر کھڑی
سوچتی ہیں
یہ گرمی جو پاؤں کو لپٹی ہوئی ہے
اگر سخت ٹھٹھرے ہوئے جسم میں پھیل جائے
تو ہلکی گلابی نسوں کو
دہکتے ہوئے سُرخ شعلوں کی بھٹی بنا دے
ہر اک نبض کو نبضِ طوفاں بنا دے
ہر اک سانس کو شعلہ ساماں بنا دے
ہر اک خواب کو رشتۂ جاں بنا دے
مگر پھر یہ طوفاں زدہ زندگی
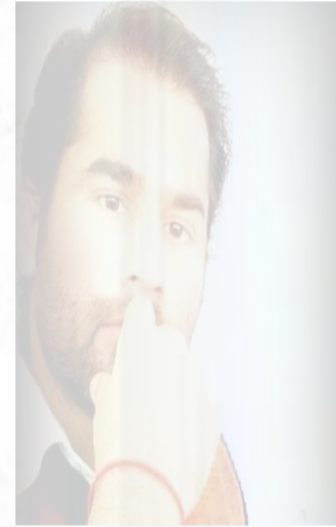
کیا یونہی پھر جھلستی ہوئی دھوپ میں
ذہن کی چھت کے اُوپر کھڑے
آتے جاتے مسافر کے سائے کو تکتی رہے گی

پہلا سفید بال

وحشت آمیز خیالوں کی لکیریں جاگیں
شعلۂ خواہشِ نایافت بھڑک کر چمکا
سائے لمبے ہوئے سب بیتے ہوئے برسوں کے
ذہن نے عمرِ گریزاں سے تعلق باندھا

آئینۂ ہوش کی مقراض بنا
پیش گوئی کے ہیولوں کے حوالے کر کے
کر گیا سینۂ سوزاں کی تپش کو ارژنگ
آتشیں زہر سا رگ رگ میں مری چھوڑ گیا
بے کراں شوق کی موجوں کا فسوں توڑ گیا

کالے بالوں میں وہ مرمر کی چمک

یخ سفیدی کے تناؤ میں نہاں
ڈھیلی پڑتی ہوئی گزرے ہوئے برسوں کی گرفت
مجھ کو اندیشوں کی دہلیز پہ لے آئی ہے
آئینہ، شوق کی تقصیر بنا !

نروان

تم وہی خواب ہو
جو جاگتی آنکھوں کو نظر آتے ہیں
تم وہی نقش ہو
جو زیست کی بنیاد ہی بن جاتے ہیں
تم وہ آواز ہو
جو کافر و دجّال سے لبیک کہلوائے ہے
تم وہ تصویر ہو
جو اصل سے بڑھ کر دلکش
خواب سے بڑھ کر رنگیں

تم وہی روشنی ہو
جو کہ پرے سات فلک میں کہیں تابندہ ہے
تم وہ ہم مسلک و ہمزاد کہ مَیں
آئینہ دیکھوں تو تم کو ہی نمایاں دیکھوں

عُروسی

مَیں نے تنہا سینکڑوں راتیں گزاریں
جاگ کر یہ سوچتے
کس طرح ہو گی بھلا
اُس وصل کی شب کی سحَر
جس شب کہ آنکھوں کی چُبھن
نیند کی خوشبو کی باہنوں سے لپٹ کر سو رہے ۔

مَیں نے بچپن ہی سے پُوچھا تھا
دُلہن کا عکس و رنگ
جامنی رُخسار کی رنگت

مہک، اُبٹن کا لمس
شعلہ رُو، شعلہ نفس
سِمٹی، سِمٹائی سی
گٹھڑی کی طرح بیٹھی ہوئی

مَیں نے بچپن ہی سے چاہا تھا
دُلہن بن جاؤں مَیں !
چمپئی رنگت کو گہرے شعلہ رُو کپڑوں میں ایسے ڈھانپ لُوں
میرا چہرہ، میری سکھیاں ڈھونڈنے بیٹھیں
تو تھک کر ہنس پڑیں
مُجھ کو گٹھڑی کی طرح دیکھیں
تو ڈھولک تھام لیں

مَیں دُلہن ایسی بنی لیکن
کہ مہندی تھی نہ افشاں
اور نہ اُبٹن کا خُمار
آنکھ میں کاجل کی تحریریں بھی

اپنوں سے جُدائی کے غموں میں ڈُھل گئیں
رہ گئی اس قُرب کی خوشبو کہ جس کے نام پر
خون کے رشتوں کو بھی
مَیں زندگی سمجھی نہیں
اور میں خوشبو سے رشتہ تا بکے !
خواب کی مانند جینا تا بکے !

اپنے خُون کا جوش

ابر اور اندھی ہواؤں کے سفینے تھے رواں
رات جب خلوتِ احساس سجانے نکلی
میری راہوں میں تری آس کھڑی تھی ایسے
جیسے کر دے گی فنا، فرق و دوئی کی صُورت۔

مَیں کہ تھی تِشنہ و تنہا، بے کل
دِل تھا اندیشوں کی دہلیز پہ غلطاں، پیچاں
ہاں مگر حلقہ بگوشی کی تمنّا دِل کو
کھینچے جاتی تھی کسی کُنجِ ملاقات کی سمت
خواہش و شوق کی وارفتہ مدارات کی سمت۔
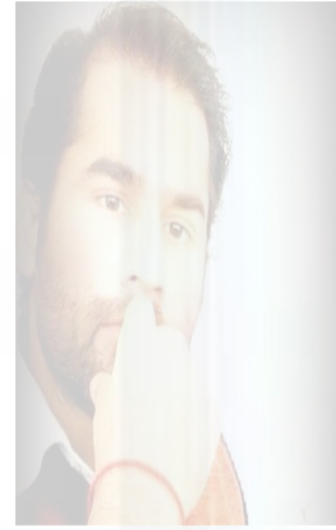
مَیں نے چاہا تھا وہی
تُو نے بھی چاہا تھا وہی
فرق پھر کیا تھا کہ رہتی قائم
دل کی دریوزہ گری
روح کی آشفتہ سری
دل میں تغیرِ تمنّا کی خلش۔

بات سے بات چلی
رات سے رات چلی
دن گزرتے گئے، ہفتوں کی طرح
اور مہینوں کی طرح
غم مقید، دلِ وحشی نے رہائی پائی۔

آج تک وقت کو زنجیر کیا ہے کس نے
کس کے ہاتھوں میں عنانِ شبِ مدہوش رہی
کون جیتا ہے فقط ایک خوشی کی خاطر
ڈر ہی جاتے ہیں زمانے سے زمانے والے
ڈھونڈ ہی لیتے ہیں تطہیرِ وفا کی صُورت

اپنے ہی خون سے مژگاں کو سجا لیتے ہیں
دل میں اُمڈی ہوئی اُلفت کو سُلا دیتے ہیں۔

مَیں کہ عورت ہوں
مرے نام سے غیرت منسوب
مجھ سے گھر بار کی عزت
مری خواہش مٹی
مری چاہت حیلہ
مرے خوابوں کی پناہ گاہ
فقط خاک ہی خاک

خاک پھر خاک ہے
اک ذرا اُڑ کے ، وہیں بیٹھ رہے گی پھر سے
پھر اُجاے گی وہی فرق و دوئی کی صُورت
پھر تمنّا کے سرابوں سے بہلنے کے لیے
کیا مٹا دے گی وہ صُورت کہ تھی جس میں شامل
تری چاہت ، تری رنگت ، مرے سینے کی تڑپ

دل مگر بھول سکے گا نہ وہ موہوم نقوش
پاک شبنم سا ، چھلکتا ہُوا ، ریشم کا بدن
اس کی بے داغ جبیں پہ مرے اعمال کی دھول
اس کی آنکھوں سے چھلکتے ہوئے لاکھوں شکوے

"دامنِ اُلفت ، مادر تری غیرت کیا ہوئی
تری چاہت کیا ہُوئی
کیوں ترے نام سے منسوب ہُوئی رُسوائی
تُو تھی شمع ، مَیں سایہ تھا ترا
اپنے سائے سے الگ ہو کے بھی رہتا ہے کوئی
اپنی تکمیل بھلا اس طرح کرتا ہے کوئی ..

ہاں مگر مُجھ کو فقط چاہنے والے کا سہارا تھا عزیز
اس سہارے کو نبھانے کے لیے
خود کو آسودہ بنانے کے لیے
اپنی شفقت کو مٹایا
تجھے تنہا چھوڑا
اپنے میکے کو بھی چھوڑا مَیں نے

اپنی سکھیوں سے بھی ناطہ توڑا

اور جھولی میں لیے مُشتِ وفا

ہاتھ پھیلا کے سہارا مانگا

اس کی چاہت کا دلاسہ مانگا

ہاتھ پھیلے ہی رہے اور سہارا نہ ملا

جس کے کہنے پہ بساطِ زرِ مادر ہاری

وہی پیارا نہ ملا

آخری وار

کلی کو پاکیزگی کا جوبن کہا کسی نے

تو خود فریبی کے خول میں

یوں سمٹ گئی وہ

کہ پھول بن کر، بکھر گئی وہ

بے نام مسافت

اس سے بہتر تو یہ تھا
مجھ کو، مری تیرہ شبوں کو
صفتِ ناموس کے عنوان سے
پھیلی ہوئی تنہائیِ دشوار کو
کانٹوں سے اُلجھتے ہُوئے
بس دیکھتے
لفظوں کی پھواروں میں بہا دیتے
بُجھا دیتے
وہ تبسّم خود افروز کی شمعیں
کہ جنہیں دیکھ کے آنکھوں میں حیا گھل کے

کبھی شرم کے ڈورے
تو کبھی حجلۂ احساس
کبھی سانس، کبھی پھانس
کبھی قوس، کبھی آس
بنا کرتی تھی

بچپن کے نام پہ پلتی ہوئی بے چینیاں
ہر روز، ہر اک شب
غمِ موہوم کی صورت میں
ہنسی اور تفکر کے تموّج میں
گھلے اشکوں کو پی لیتی ہیں

تم نے کیوں کششِ مسیحائی کے جلووں سے
مجھے ٹوٹے رفاقت کا پتہ بتلایا
راہ بتلا کے بچھڑنے والے
کیا تعلق اسی دشوارئ موہوم کی رسّی ہے
جو بن جائے کبھی طوق

کبھی رشتۂ زیست،
بوند کی شکل میں خوں ٹپکے تو گھاؤ نہ کھُلے
کیسے سمجھاؤں کہ اب عکس بھی پہچان کی صورت نہ رہی

یُوسُف کامران

وُہ تو مجرم تھا محبت کا
مَیں اُسے جانتی تھی
مَیں تو اُس شخص کے ہر نقص کو پہچانتی تھی
میں اُسے چاہتی تھی
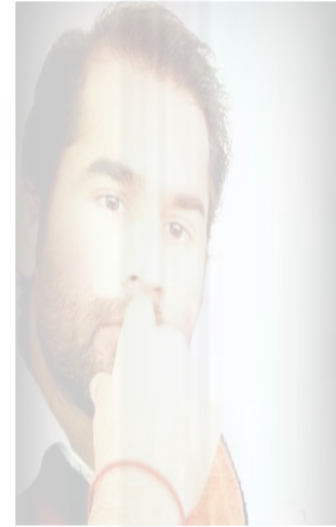
وہ شفق رنگ، حیا جس کو کہیں
تھی یہی میری وفا کی تعبیر
وہ بہانہ جسے چشمک سمجھیں
تھی مرے تیرے تعلق کی نظیر

تُو کہ محبُوب مجھے تھا، مجھے معلوم ہے یہ

تُو کہ مُجرم تھا ، مرے پیار
مری چاہت کا
تُو کہ دیوانۂ مخفیٔ محبت تھا سدا
تُجھ کو کیا سُوجھی
کہ قدموں کے نشاں اُلجھا کر
چہرۂ زرد لیے
میری ہتھیلی پہ لگی مہندی کو دُھندلانے لگا
جیل کی گرم سلاخوں سے
مرے بچّوں کو تڑپانے لگا
تُو کہ مُجرم تھا محبّت کا
زمانے کو خبر کیسے ہُوئی !!

نظمیں

دیس بدیس کی نظموں کے نثری تراجم

مَیں تمھارے ساتھ وہی کرنا چاہتا ہوں
جو چیری کے درختوں کے ساتھ موسمِ بہار نے کیا تھا۔

(پابلو نیرودا)

پابلو نیرودا

پابلو نیرودا ۱۲ جولائی ۱۹۰۴ء کو چلی کے ایک قصبے پرال میں پیدا ہُوا۔ اُسے بچپن میں ہی نظمیں لکھنے کا شوق تھا۔ اس کا باپ جو ریلوے لائن پر مزدوری کرتا تھا، اسے شاعروں سے نفرت تھی۔ باپ کے خوف سے ۱۵ سال کی عمر میں پابلو نیرودا نے جس کا اصلی نام ریکاردو الیذر نفتالی ریس اِی باسوالتو تھا، پابلو نیرودا کا قلمی نام اپنا لیا۔ ۱۹۲۳ء میں اس کا پہلا مجموعۂ کلام "جھٹ پٹے" کے نام سے شائع ہُوا۔ ایک سال بعد دوسرا مجموعہ "بیس محبت کی نظمیں اور ایک یاس کا گیت" چھپا۔ یہ مجموعہ نیرودا کی فوری شہرت اور مقبولیت کا باعث ہُوا۔ ۱۹۲۷ء کے بعد سے وہ مختلف ممالک میں اپنے مُلک کے سفارت خانوں میں قونصل کے عہدے پر کام کرتا رہا۔ سپین کی خانہ جنگی کے دوران وہ میڈرڈ میں اپنے مُلک کے قونصل کی حیثیت میں کام کر رہا تھا۔ اس زمانے میں اس نے انقلابیوں کے حق میں جو نظمیں لکھیں وہ اس کی عالمی شہرت کا باعث بنیں۔ ۱۹۴۳ء میں وہ چلی کی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گیا۔

۱۹۴۵ء میں وہ سینٹ کا ممبر منتخب ہُوا۔ ۱۹۴۸ء میں چلی کے صدر کی امریکہ نواز پالیسیوں کی مخالفت کی بنا پر اسے جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔

جلا وطنی کے دوران اس نے اپنی عظیم نظم "کانتو جنرال" لکھی۔

اس نظم میں والٹ وٹمین کا اثر نمایاں ہے۔

۱۹۵۳ء میں اسے ستالن امن انعام دیا گیا۔

۱۹۷۱ء میں جبکہ وہ چلی کی مارکسی حکومت کی طرف سے فرانس میں سفیر تھا، اُسے ادب کا نوبل پرائز ملا۔

دو سال بعد ستمبر ۱۹۷۳ء میں جب فوج نے چلی کی مارکسی حکومت کا تختہ اُلٹا تو پابلو نیرودا بیماری کی حالت میں چھٹی پر چلی آیا ہُوا تھا۔ اُسے اس انقلاب سے سخت صدمہ پہنچا تھا اور وہ نہایت کسمپرسی کی حالت میں چند ہی دنوں میں انتقال کر گیا۔

بلّی کا خواب

کیسی خوش سلیقگی سے بلّی سوتی ہے
وہ اپنے پنجوں اور اپنے بھرپور وجود کے ساتھ محوِ خواب ہے
وہ اپنے چالاک پنجوں، بے رحم خون اور جسم پر پھیلے ہُوئے
دائروں کے ساتھ محوِ خواب ہے
محوِ خواب ہے اس ریگ رنگ دم کے ساتھ
جس پر جلے ہوئے دائروں کے نقوش سربسر ہیں
چقماق نما کھُردری زبان
اور آگ کی طرح سوکھی ہوئی جنس کے ساتھ
مَیں بھی بلّی کی طرح عصر کی سنجاب اوڑھ کر
سونا چاہتا ہوں

اور پھر کسی سے ہم کلام ہوئے بغیر
اپنے وجود کو دُنیا کی وسعتوں
تہ نشینوں، وادیوں پہ پھیلا کر
خوابوں میں چوہوں کا شکار کرنے کی
بے پناہ خواہش کو زندگی دینے کا آرزو مند ہوں
مَیں نے دیکھا ہے
سوتے میں بلّی کیسے کیسے رُوپ دھارتی ہے
کیسے رات شیرۂ آب کی طرح اس کے وجود میں سرایت کر جاتی ہے
یہ کبھی سنسان اور چٹیل برف کے انبار پہ گرنے لگتی ہے
تو کبھی اس انبار کی تہ میں اتر جانا چاہتی ہے
یہ کبھی نیند میں اتنی بڑی ہو جاتی ہے
کہ چیتے کی بھی پڑدادا معلوم ہوتی ہے
اور سیاہیوں کی یورش میں بھی، یہ آتش فشاں پہاڑوں
بادلوں اور چھتوں کے اوپر چھلانگیں لگاتی پھرتی ہے

رات کی بلّی ۔ سوؤ ۔۔ ابھی اور سوؤ
اسقفی آداب اور تیتر کی طرح ترشی ہوئی مونچھوں کے ساتھ
اپنے سارے خوابوں کی حفاظت کرو
اپنے بے درد دل اور سخت کھُردری دُم کے ساتھ
ہماری خراب آلود بہادری کے ابہام پر قابو پاؤ

ایک بچّے کا غسل

اس زمین پر قدیم ترین محبت بچّوں کے مجسموں کو نہلا کر کنگھی کرے گی
وہ ان کے پیروں اور گھٹنوں کو سیدھا کرے گی
پانی چڑھتا ہے، صابن پھسلتا ہے،
اور پاک جسم بگولوں اور مامتا کی ہواؤں میں
سانس لینے کے لیے اُوپر آتا ہے
اوہ! کس قدر شدید نگہداری
خوبصورت فریبِ نظر
اور بے جان جدوجہد!

اب بال ایک اُلجھی ہُوئی بوچھاڑ کی طرح ہیں
جس پر کوئلے۔ برادے، کلونس اور برقی تاروں نے
آڑی ترچھی لکیریں ڈال رکھی ہیں
یہ اس وقت تک اُلجھے رہیں گے
جب تک کہ محبت اپنے تحمل کے ساتھ
بالٹیوں، سفنج، تولیوں اور کنگھوں
کو بروئے کار لائے۔
یوں دھونے اور سنوارنے سے
اور بنیادی احتیاط کے نتیجے میں
سفید یاسمین کی طرح
بچّہ نمودار ہوتا ہے، اور بھی تازہ،
مگر پھر بھی وہ کب آرام سے بیٹھے گا
ماں کے بازوؤں کی زنجیر توڑ کر
اپنے جنوں اور شوق کے طوفان میں
وہ پھر کیچڑ، تیل، پیشاب اور روشنائی
کی تلاش میں نکل جائے گا۔
خود کو چوٹ لگاتا اور پتھروں پر لڑھکتا پھرے گا۔
یوں، دُھلا دُھلایا، بچّہ زندگی میں شامل ہوتا ہے۔

کیونکہ زندگی کی اگلی منزلوں میں اس کے
پاس سوائے صاف رہنے کے اور کسی
چیز کے لیے وقت نہ ہوگا،
مگر اس وقت صاف رہنے کے باوجود
زندگی مفقود ہوگی۔

جل پری اور شرابیوں کی حکایت

یہ سب لوگ اندر موجود تھے
جب وہ بالکل برہنہ اندر داخل ہوئی
وہ پی رہے تھے
انھوں نے اس پر تھوکنا شروع کر دیا
وہ دریا سے ابھی ابھی آئی تھی
اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا
وہ ایسی جل پری تھی جو اپنا راستہ بھول چکی تھی
طعنے اس کے چمکدار بدن پر سے پھسل رہے تھے
اُس کی سُنہری چھاتیاں، فحش گوئی سے تربتر تھیں
وہ آنسوؤں سے ناآشنا تھی

وہ بالکل نہیں روئی

وہ کپڑوں سے نا آشنا تھی

اُس نے کچھ نہیں پہنا تھا

انھوں نے اسے جلے سگریٹوں اور بوتلوں کی

ڈاٹوں سے چھلنی کیا

اور فرش پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئے

وہ بالکل کچھ نہیں بولی

کہ لفظ اس کے لیے اجنبی تھے

اُس کی آنکھیں گزری ہوئی محبتوں کے رنگ جیسی تھیں

اور اس کے بال زردی مائل ارژنگ تھے

سُرخ چمکتی روشنی میں اس کے ہونٹ

بے صدا ہلے اور آخر کار

وہ اس دروازے سے چلی گئی

اگر وہ بچتی بچاتی دریا میں گھس گئی ہو

تو وہ پاک ہوگئی ہوگی

ایک دفعہ پھر بارش میں دھلے سفید پتھر کی طرح

اور پیچھے دیکھے بغیر ـ وہ ایک مرتبہ پھر

تیرتی رہی

وہ اپنے وجود کے آخری سانس تک تیرتی رہی

وہ عدم آباد میں داخل ہوگئی

خزاں زدہ وصیت

شاعر اپنی حالت اور ترجیحات کے بیان سے آغاز کرتا ہے:

موت اور بے حسی کے عالم میں
میں نے گٹار اُٹھایا
اور اس موّیت کے عالم میں
میرا دل بھی نہیں دھڑکا
کیونکہ جہاں میرے لیے ذرا سا بھی انتظار نہ ہو
وہاں میں اپنے اثاثے کے ساتھ
خزاں کے پہلو میں
اپنا پہلا جام پینے کو آگے بڑھتا ہوں

اگر وہ دروازہ بند کریں
میں اندر چلا جاؤں گا
اگر وہ مجھے خوش آمدید نہیں
تو میں بھاگ جاؤں گا۔
میں ان ملّاحوں میں سے نہیں ہوں
جو برف پر ہاتھ پیر مارتے پھرتے ہیں
میں ہوا کی طرح
انتہائی زرد پتّیوں اور مورتیوں کی آنکھوں میں
مٹتی ہوئی تہذیبوں کے ساتھ چلنے کا عادی ہوں
اگر میں کہیں آرام کرنے کی ٹھانوں تو
پھر آگ کے سینے میں
ان چٹختے ہوئے کوئلوں میں آرام کرتا ہوں
جو اپنے اندر ہی اندر بھسم ہو کر رہ جاتے ہیں

تم نے اپنا نام کونوں پر لکھا دیکھا ہو گا
میں اس کے لیے معذرت خواہ نہیں ہوں
اس کا کسی چیز سے بھی واسطہ نہیں ہے
مگر ہر چیز سے واسطہ ہے
کیونکہ تم میرے لیے وجود بھی رکھتی ہو اور نہیں بھی

ہر ایک کے ساتھ یونہی ہوتا ہے۔
مگر کوئی اس حقیقت کو نہیں پہچانتا
اور جب وہ اعداد کو جمع کرتے ہیں
تو ہم متموّل نہیں ہوتے ہیں
ہم تو نئے فقیر اور غریب کی شکل میں اُبھرتے ہیں

مجھے چُوہوں نے کتر کتر کر ریزہ ریزہ کر دیا ہے
یہ بھی میرے لیے ان کی طرف سے بڑا اعزاز ہے
سمندر میں اکثر
گہرے سُرمئی رنگ کے گھونگھے
عجیب قسم کے زرد کیڑے
کھا کر گزر کرتا رہا ہُوں
اور طوفانوں نے شہر کے شہر
میری قمیض اور میرے حفاظتی پیرہن میں کھو دیے ہیں
یہ وہ راستے تھے رہنماں اگر تم ہوتے
تو ہنستے ہنستے ہی مر جاتے اور وہ راستے تمہیں
فنا کر دیتے۔

وہ اپنے دشمنوں کا تذکرہ کرتا ہے اور اپنی وراثت میں اُن کو شریک کرتا ہے۔

پس میں ان سب کو چھوڑ کر جا رہا ہوں
جنھوں نے مجھ پر ناک بھوں چڑھائی تھی۔
سیّاح کی سی میری پلکیں
نمک کے لیے میرا شوق
میری مسکراہٹ کا رُوپ
ان سب جذبوں کو اگر ممکن ہو تو بے کنار رواں بہنے دو۔
چونکہ وہ مجھے نہیں مار سکے
اس لیے مَیں انھیں اپنے کپڑوں میں ملبوس ہونے سے
نہیں روک سکتا ہوں
یا پھر اتوار کو ناقابلِ یقین بہروپ میں سامنے آنے سے
نہیں روک سکتا ہوں۔
مَیں نے کسی کو چَین سے نہیں بیٹھنے دیا۔
تو وہ بھی مجھے چَین نہیں لینے دیں گے
یہ تو واضح ہے مگر اس کی پرواہ نہیں
وہ مُجھ سے کھائے ہُوئے زخموں کو بھی شائع کریں گے۔

وہ دوسری دنیا کا ...
نامی ہوتا ہے ۔

میں نے اپنی پارٹی اور اپنے لوگوں کے لیے
دُنیاوی چیزیں چھوڑ دی ہیں
ہم اب یہاں دوسرے مسائل کے لیے محوِ گفتگو ہیں
یہ مسائل واضح بھی ہیں اور مبہم بھی
یہ سب ایک ہی ماں کے جائے ہیں
یہی حال انگوروں کا ہے ۔
دو انگور کے دانے ـــ یعنی
سُرخ رنگ ، سفید رنگ
زندگی کا تمام حُسن یہی سُرخ و سفید ہیں
جو واضح ہے وہ بھی مبہم ہے
ہر چیز زمین اور مٹّی نہیں ہے
سائے اور خواب ، میری وراثت ہیں

وُہ جواب دیتا ہے اچھے
مقاصد والے لوگوں کو ۔

ایک دفعہ اُنھوں نے مجُھ سے پُوچھا
میری تحریر میں اس قدر ابہام کیوں تھا
وہ رات سے ، جمادات اور درختوں سے بھی ایسا ہی
سوال کر سکتے ہیں ۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں اس کا کیا جواب دوں
تب کچُھ عرصہ بعد
دو دیوانے آدمیوں نے مجُھ پر حملہ کیا
یہ کہتے ہوئے کہ میں سادہ لوح تھا ۔
جواب تو بہتے پانی میں ہے
مَیں یہ کہہ کر بھاگتا ہُوا ، گاتا ہُوا ، چلا گیا ۔

... اپنی تکالیف کو بیان
کرتا ہے ۔

کیا دُنیا میں کسی کو بھی اتنی خوشیاں ملی ہیں
جتنی مجھے
(خُوشیاں میری رگوں میں سمائی ہُوئی ہیں)
اور یہ سُود و زیاں میری فطرت ہے
مَیں ایک بہت بڑا بہتا دریا تھا
جس میں سخت پتھر جلترنگ بجاتے ، رات کے گہرے
سنّاٹے کو جگاتے
اور دن میں پھیلے اجیالے کو سمیٹتے لڑھکتے رہتے تھے
مَیں کس کو اس قدر زیادہ چھوڑ سکتا ہوں

اتنا زیادہ اور اتنا کم

کسی شے سے زیادہ اس کے حصوں کی خوشی
ایک تنہا گھوڑا، سمندر کے کنارے
ایک تنکا، جو ہوا کو بُننے کا خواہاں ہو۔

اور خوشیاں بانٹ دیتا ہے۔

میں اپنے غم ان کے پیچھے چھوڑے جا رہا ہوں
جنھوں نے مجھے غم زدہ کیا
لیکن اب مَیں اُن کو بھی بھول چکا ہوں
اور اب مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ مَیں نے انھیں کہاں کھویا۔
اگر مَیں انھیں جنگل کے درمیان دیکھوں
وہ چڑھتی ہُوئی انگور کی بیل کی طرح ہیں جو اپنی پتیوں کے
ساتھ اوپر کو اُبھریں گے
اور وہاں جا کے ختم ہوں گے، جہاں تم ختم ہو گے۔
تمھارے سر پا ہوا میں
اگر وہ دوبارہ نہیں اُبھریں گے
تو تمھیں دوسری بہار کے رُوپ میں آنا ہو گا

وہ نفرت کے خلاف اپنا موقف بیان کرتا ہے۔

میری نمود، نفرت سے ہوئی ہے
وحشت۔ بربریت اور اندرونی خلفشار سے ہُوئی ہے
نفرت پانی میں نظر نہ آنے والی کتّا مچھلی کی طرح ہے
جو کبھی کبھی اپنے خُون آلود گلپھڑے دکھاتی ہے
اور جس کے نیچے بہتا ہُوا صاف پانی، تمھیں گمراہ کرتا ہے۔

کیوں۔ آخر کیوں ہم اتنی نفرتیں کرتے ہیں
ان سے جو ہم سے نفرت کرتے ہیں۔
پانی کے نیچے۔ شکار کرنے والے شکار کے منتظر، دم سادھے
پڑے ہیں۔
ان کی تلواریں اور ان کے تیل کے کنستر، سب تیار ہیں
مکڑی جالے اور چوہوں کے جال، سب تیار ہیں
اس کا تعلق عیسائی ہونے سے بالکل نہیں ہے۔
یا کسی عبادت یا خیاطی سے بالکل نہیں ہے
یہ تو صرف اتنا قصہ ہے کہ نفرت کہیں ہار جاتی ہے
آنکھوں سے سانپ نیچے زہر کی منڈی میں گر پڑتے ہیں
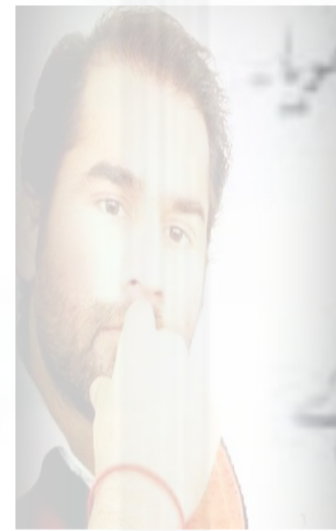
اس دوران سورج اُبھر آتا ہے
اور میں روٹی اور شراب کمانے کے لیے
کام شروع کر دیتا ہوں۔

نیز وصیت کرتے وقت
وہ اسے ذہن میں رکھتا ہے۔

نفرت کے لیے میں اپنی نعلیں چھوڑ جاؤں گا
میری ملاح والی قمیض
میرے سیاح والے جُوتے
میرا بڑھئی والا دل
وہ تمام چیزیں جو میرے ساتھ رہیں
جنھوں نے مجھے رنج اُٹھانے میں مدد دی
مضبوط اور صاف چیزیں جو میرے پاس تھیں
ہمیشہ ہمیشہ اور وقت کے گزرنے کے باوجود
تاکہ دُنیا کو پتا چلے کہ جن کے پاس درخت اور پانی تھا
وہ جہاز بنا سکتے تھے، انھیں چلا سکتے تھے
وہ جا سکتے ہیں، وہ واپس آ سکتے ہیں
وہ رنج اُٹھا سکتے ہیں، محبت کر سکتے ہیں

وہ خوف بھی کھاتے ہیں، کام بھی کرتے ہیں
زندہ ہوتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں
وہ سادہ بھی ہوتے ہیں اور مشکل طبع بھی
وہ تکالیف پر کان بھی نہیں دھرتے
اور وہ صبحِ بہاراں کے انتظار میں زندگی بھی گزار دیتے ہیں۔
یعنی یہ کہ وہ زندہ رہتے ہیں
ہر چند ہر زمانے میں چند ایسے فرعون ہوتے ہیں
جو ہماری زندگی کو زندگی ہی نہیں سمجھتے ہیں

...بالآخر وہ وجد آور انداز میں
...پنی محبوبہ سے خطاب کرتا
ہے۔

مٹلڈے یوروٹیا! میں تمھارے لیے جہاں چھوڑ رہا ہوں
میرے پاس جو کچھ تھا، میرے پاس جو کچھ نہ تھا
میں جو کچھ تھا، میں جو کچھ نہ تھا
میرا پیار تو اس بچّے کی طرح ہے
جو تمھارے بازو نہیں چھوڑنا چاہتا ہے
میں ہمیشہ کے لیے یہ تم پر چھوڑتا ہوں
تم میرا انتخاب جو ہو۔

تم میرا انتخاب جو ہو

تم ہَوا سے لرز جاتی ہو

جنوب کے پتلے درختوں سے بھی زیادہ، تم ہَوا سے

لرز جاتی ہو

اگست کی خزاں آلود جھاڑی سے بھی زیادہ تم ہَوا سے

لرز جاتی ہو۔

میرے لیے تم ایک عظیم بیکری کی طرح لذیذ ہو۔

تمھارے اندر ایک انسانی دل ہے

مگر تمھارے ہاتھ آسمانی ہاتھ ہیں

مصالحے دار پیاز کی طرح

تم سُرخ اور گرم

سفید اور نمکین ہو۔

تم ایک ہنستا ہُوا پیانو ہو

جس کا ہر راگ انسانیت سے پُر ہو

اور یہ موسیقی تمھاری پلکوں اور تمھارے بالوں سے

مجھے زیر زبر کیے جا رہی ہے۔

مَیں تمھارے سائے سے لپٹتا ہوں

مَیں تمھارے کانوں سے مسحور ہوتا ہوں

ایسے جیسے مَیں نے انھیں پہلے بھی

بھرے سُرخ پانی میں دیکھا ہو۔

مَیں نے سمندر میں تمھارے ناخن کے دھوکے میں

ایک غضبناک مچھلی کو پکڑ لیا تھا۔

تمھاری آنکھیں جنوب سے جنوب کو کُھلتی جاتی ہیں۔

تمھاری مسکراہٹ مشرق سے مغرب کو جاتی ہے

تمھارے پیر مشکل ہی سے نظر آتے ہیں

اور سُورج تمھارے بالوں پہ طلوع ہونے کو مسرّت کی

انتہا سمجھتا ہے۔

تمھارا چہرہ اور تمھارا جسم۔

سخت جگہوں سے بنا ہے۔ جیسا کہ میرا

بارش سے دُھلے ہُوئے متبرک مقامات

قدیم زمینوں اور قربان گاہوں سے میرا اور تمھارا

چہرہ اور جسم بنا ہے
ہماری خون آلود مٹی میں
زندگی اب بھی گیت گاتی ہے
لیکن تم جنگل سے تمام چھپے ہوئے خوشبو کے خزانے
اٹھا لائی ہو۔
اور تم جہاں جہاں سے گزری ہو
وہ راستہ کسی جری کو انعام میں ملی ہوئی
آب دار تلوار کی طرح جگمگا رہا ہے۔
تم نے مجھ پہ قابو
اپنے بے پناہ پیار اور لاثانی صلاحیتوں سے پایا ہے
کیونکہ تمھارے دہن نے
قدیم زمانے، اگلے وقتوں کی تہذیب
اور اجداد کے گہرے رنگ کے ڈھیلوں کی یاد تازہ کر دی ہے
مجھے اچانک محسوس ہوا کہ میرا بلاوا آ گیا
یہ بہت دور سے دھیمی اور نامعلوم آواز تھی۔
میں سوکھے ہوئے پتوں کے نزدیک ہو گیا

میں نے تمھارے منہ میں اپنے خون کا بوسہ لیا۔
میرے پیار۔ میری آرد کانا!

متلنڈے! میں تمھارے لیے کیا چھوڑ سکتا ہوں
جب تم اپنے ایک لمس سے
جلتی ہوئی پتیوں کی ہوا کو
سٹرابیری کی تیز مہک میں بدل دیتی ہو
اور تم اپنی سمندر چھاتیوں کے درمیان
کوکوتیز کی نیم وا روشنی
اور چلّی کی چمکدار پودوں کی خوشبو بسائے ہوئے ہو۔

سمندر میں خزاں بھرپور ہے۔
دھند اور چھپے ہوئے مقامات سے پُر
زمین پھیلتی اور سانس لیتی ہے
پتیاں ماہ بماہ گرتی ہیں
اور تم، صبر اور جذبے کے ساتھ

میرے کام پر جھکی ہُوئی ہو۔

میری بُجھی بُجھی تحریر

کیڑے مکوڑوں اور مکڑی کے جالوں جیسے بدخط

اور کچے لکھے ہوئے کاغذوں کو صاف کر کے لکھتی ہو۔

تم اپنے چھوٹے چھوٹے پیروں پر بھر پور شرنی کی طرح ہو

مَیں تمھارے ہاتھوں کے صاف شفاف انداز کے بغیر

کیا کروں گا

مَیں بغیر کسی مقصد اور لگن کے

کہاں گھوموں گا

کیا میں آگ اور برف سے جگمگاتی

دُور جاتی بسوں میں آوارہ پھروں گا۔

مجھے تمھارا سمندری خزاں کا قرض ابھی ادا کرنا ہے

وہ سمندری خزاں جس کی جڑیں مرطوب ہیں

جو دھند میں انگور کی طرح لپٹی ہُوئی

اور شہر میں چمکتے ہُوئے باوقار سُورج کی طرح ہو

اور خاموشی کی وہ فضا

جہاں دُکھ اپنا آپ بھُول جاتے ہیں

اور جہاں خوشیوں کا چمکتا تاج ہی

سطح پر آتا ہے۔

مجھے تمھارا یہ سب قرض ادا کرنا ہے۔

میری بے زنجیر فاختہ

میری تاج والی بٹیر

میری پہاڑی چڑیا

کوہیکو کی میری ساتھی

جب ہم مرجائیں گے

جب ہماری سانس کی آمد و رفت بند ہو جائے گی

گور کی سات تہوں

اور موت کے خُشک پیروں تلے

ہم پھر مل جائیں گے۔ محبت

تجسس اور تحیّر پھر ہمارے گرد ہوں گے۔
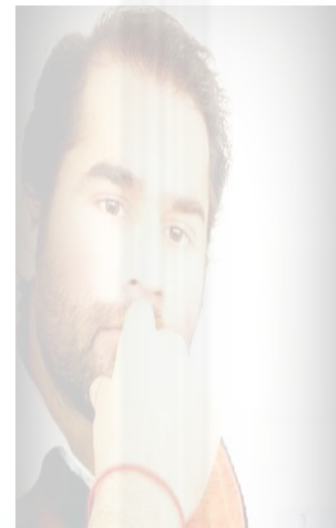
ہمارے رنگ برنگے پر
ہماری پُرغرور آنکھیں
ہمارے پیر جو کبھی نہیں ملتے
ہمارے مرتسم بوسے
سب کچھ ایک ساتھ ہمیں واپس مل جائے گا
لیکن اس سے ہمیں کیا فرق پڑے گا۔
ہم قبر سے اور بھی قریب ہو جائیں گے!
اے زندگی! تو ہم سے جُدا نہ ہو
ہمیں موت کی کوئی فکر نہیں ہے۔

آخری ہدایات ۔

پس مَیں تمھیں الوداع کہتا ہوں اے لوگو!
اتنے سارے الوداعیوں کے بعد
جبکہ مَیں کچھ چھوڑ کے بھی نہیں جا رہا ہوں
مَیں چاہتا ہوں کہ ہر ایک کے پاس کچھ ہو
سب سے طوفانی چیز جو میرے پاس ہے
جنُوں خیز اور جوشیلی شئے، زمین کی جانب پلٹتی ہے

زندگی کی جانب پلٹتی ہے۔
نیک خواہشوں کی پتیاں
ہَوا کے سبز دہن میں گھنٹیوں کی طرح گری ہیں۔

مگر میرے پاس دوستوں اور اجنبیوں کا
بہت عظیم فیض موجود ہے
میرے راستے مجھے جس طرف بھی لے گئے
مجھے فیّاضی ہی فیّاضی ملی
ایک رمز شناس دل کی طرح

دوائیوں کے بوجھ نے میری جلاوطنی کے ایام کو
کبھی دوبھر نہیں کیا
انھوں نے میرے ساتھ روکھی سُوکھی
خطرات میں، پناہ میں اور عالمِ مدہوشی میں
ہر طرح گزر کی ہے۔
دُنیا نے اپنے پھلوں سے بھرے باغات میرے لیے کھول دیے

اور مَیں ان میں ایسے داخل ہوگیا جیسے ایک مزدُور
دو رویہ عنایتوں کے بیچوں بیچ اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے
میرے شمال میں اور جنوب میں بے انتہا دوست ہیں
مشرق میں میرے دوستوں کے سر پر کبھی سُورج
غروب نہیں ہوتا ہے۔
اور شاید یہی حال مغرب میں بھی ہے
مَیں گندم کے دانے نہیں گن سکتا ہوں
بالکل اس طرح او بارزونز میں
مَیں اپنے دوستوں کو گن سکتا ہوں
اور نہ ان کی تعداد بتا سکتا ہوں
امریکہ میں
رات کے خوفزدہ ماحول کے باوجود
کسی رات کا چاند ایسا نہیں جو مجھے نہ جانتا ہو
کوئی سڑک ایسی نہیں جو میری منتظر نہ ہو
گاؤں کے چھوٹے چھوٹے گھروندوں
شہروں کے پختہ مکانوں

اور دُور دراز محرابوں میں جنھیں
مَیں ابھی نہیں جانتا
سوائے اس کے کہ ہم بھائی بھائی پیدا ہوئے تھے۔
مَیں نے ہر جگہ شہد اکٹھا کیا
جسے ریچھ کھا گئے۔
بہاروں کی رازدارانہ آمد
ہاتھیوں کا دفینہ
اور جو کچھ کہ مَیں اپنوں کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں
میرے خاندان کا شفاف چشمہ ہے
لوگ میری تعریف بتاتے رہے
اور مَیں ان تمام لوگوں سے مختلف نہیں رہا
مَیں اپنی مُٹھی میں
دُنیا کو تمام جزیروں کے ساتھ پکڑے ہُوئے ہوں
اور چونکہ مجھے تسلیم کرنے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔
مَیں نے اپنے دل
سمندر اور ستاروں کا کہا، کبھی نہیں ٹالا ہے۔

شاعر اپنی مختلف انواع کی
قلبی ماہیتوں کے بیان
اور شاعری پر اپنے ایمان
کی توثیق کے ساتھ اپنی
کتاب کو ختم کرتا ہے ۔

اتنی بار پیدا ہونے کے باعث
سمندری مخلوق کی طرح
زندگی کا میرا تجربہ بھی نمکین قسم کا ہے ۔
جو ستاروں پر کمندیں ڈالنے
اور مادی منزلوں کے حصول کے لیے بے چین رہتا ہے ۔
پس میں جاتا ہوں بغیر جانے
کہ میں کس دُنیا کی جانب پلٹ رہا ہوں
یا میں یونہی زندہ بھی رہوں گا کہ نہیں ۔
جبکہ چیزیں اپنی سمت متعین کر رہی ہیں
میں اپنی وصیت چھوڑ چلا ہوں
میری تلون آمیز تحریریں
کہ اسے جو بھی پڑھے
وہ اس سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکے گا
سوائے ایک صاف مگر متحیر ذہن کے
مسلسل رواں رہنے کی داستان
ایک شخص جو سوگوار ، زندہ دل ، خوش
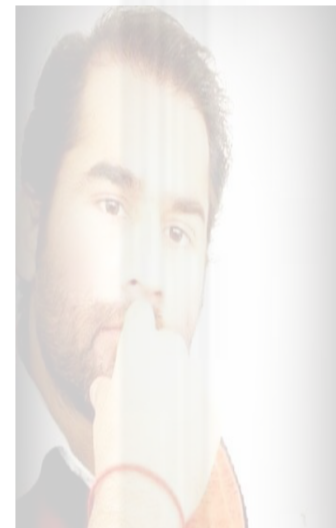
اور رنج خوردہ ذہن کا مالک تھا ۔
اور اب میں اس صفحے کے پیچھے جاتا ہوں
مگر غائب نہیں ہوں گا ۔
میں شفاف ہوا میں
آسمانی تیراک کی طرح غوطہ لگاؤں گا
اور پھر اپنی نشوونما کی جانب مائل ہوں گا
جبکہ ایک دن میں اتنا چھوٹا ہو جاؤں گا
کہ ہوا مجھے اپنے ساتھ اُڑا لے جائے گی
اور مجھے خود اپنا نام نہیں معلوم ہو گا ۔
اور جب میں جاگوں گا تو میں وہاں موجود نہیں ہوں گا
اور پھر میں خاموشی میں گاؤنگا ۔

آندرئی وزنی سنسکی

وزنی سنسکی ۱۲-مئی ۱۹۳۳ء کو ماسکو میں پیدا ہُوا۔

اس کے والد ہائڈرو الکٹرک سٹیشن کے ڈیزائنر ہیں۔

اس کی والدہ ادب کی طالب علم ہیں

۱۹۵۰ء میں اس نے فنِ تعمیرات کے انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیا۔

اُسی زمانے میں وہ نظمیں لکھنی شروع کر چکا تھا۔

پاسترناک اس کا پسندیدہ شاعر تھا۔

۱۹۶۰ء میں اس کا پہلا مجموعۂ کلام شائع ہُوا۔

اب تک اس کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔

وہ سوویت یونین کے مقبول ترین شاعروں میں سے ایک ہے۔

اس کی شاعری میں بیان کی جدّت اور جرأت کے علاوہ تجربے کی ندرت

اور خاص قسم کی کھُردری، مشینی موسیقی بھی پائی جاتی ہے۔

شعر میں جذبے پر فکر اور تجربے کا رنگ غالب ہے۔

وہ دُنیا کے کئی مُلکوں کا سفر کر چکا ہے۔

غیر مُلکی شاعروں میں اسے لورکا، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ڈلن ٹوس

زیادہ پسند ہیں۔

خُود کلامی

مَیں مارلینن منرو یا ہیروئن ہوں
مَیں خودکُشی اور خواب آور گولیوں کی ہیروئن ہوں
مرے عارضوں کے گلاب کس کے لیے کھل رہے ہیں
مرے بے کراں قہقہوں اور جملوں کی ٹیلی فون پر بازگشت کس کے لیے ہے
مری آبنوسی جگمگاتی الماری میں لٹکے بالکل نئی تراش کے نئے لباس
چیخ چیخ کر کسے بُلا رہے ہیں
یہ مجھے ناقابلِ برداشت ہیں
ناقابلِ برداشت تو یہ بھی ہے کہ
زندگی محبت سے عاری ہو
ناقابلِ برداشت تو یہ بھی ہے کہ

بید کے لرزیدہ شجر کی طرح، بے اماں زندہ رہو
ناقابلِ برداشت، خودکُشی بھی ہے
مگر حد سے زیادہ، ناقابلِ برداشت
زندگی کرنا ہے
زندگی تو اِک بکاؤ مال ہے
زندگی تو مسلسل جُھوٹے بوسوں کی اشتہا کا آئینہ ہے
جس طرح مالک کے آگے
ایک سدھا گھوڑا، کبھی دُم کو ہلائے اور کبھی گردن جُھکائے
اس طرح مَیں نے زندگی میں اپنے سامنے کھڑے
فلموں میں لگائی دولتوں کے قبضہ گیروں کو دیکھا ہے
مَیں نے "ڈرائیو اِن" سینما میں موٹر کاروں کی
ان قطاروں میں موٹروں کے اندر حدّتوں سے
پاگل، تپتے ہُوئے چہروں کو مارلینن منرو کے اندر جھانکنے کی خواہش لیے
پیاسے، تڑپتے ہوئے دیکھا ہے
مَیں نے دیکھا ہے
ان کے چہروں سے وہ رنگتیں پھُوٹ رہی تھیں

جو کُتّے کو گوشت کی بُو پا کر بیتاب کر دیتی ہیں

یہ کیفیت، ناقابلِ برداشت ہے

مجبوری کے عالم کی ہر کیفیت، ناقابلِ برداشت ہوتی ہے

مگر جس کیفیت میں ہم زندہ ہیں

اس عالم میں آزادی کے زمانے کی ہر کیفیت بھی ناقابلِ برداشت ہے

جس کا اِک رنگ وہ مُردہ زندگی ہے جو ہم سب کرتے ہیں

اس سے بڑھ کے ناقابلِ برداشت

اس بے کیف زندگی کے بارے میں تحقیق کرنا اور جان کاری کا

مرحلہ طے کرنا ہے

ہمارے سارے منصوبے کیا ہُوئے

ہماری سوچوں نے ہمیں خلا میں لٹکا دیا ہے

اب زندہ رہنا خودکشی کے مترادف ہے

اب تو بُرائی سے لڑنا، گویا خودکشی کرنا ہے

اب تو زر کی قوتوں سے نباہ کرنا، گویا خودکشی کرنا ہے

اگر خرد کی زرکاری نہ ہو تو جینا ناقابلِ برداشت

مگر خرد کی چہرہ شناسی تو جینے کو اور بھی ناقابلِ برداشت بنا دیتی ہے

ہم خود کو دولت کے زہر سے مار ڈالتے ہیں

ہم اپنے آپ کیریئر کے بنانے کے جُنوں میں گھول دیتے ہیں

اور آخر ہماری ٹانگیں، جمے ہوئے شہد کی طرح نظر آتی ہیں

ہم تمثیل کار

آنے والی نسلوں کے تحفظ کے لیے تو نہیں جیتے

ہم تو فلم ڈائرکٹر کی ناانصافی کی ہر بنیاد میں مٹی، گارا بن کے گُھل جاتے ہیں

ہم اپنے پیاروں سے بغل گیر ہو ہو کر، ان کا دَم گھوٹ دیتے ہیں

مگر ہماری سوچیں ہمارے چہروں پر یُوں جم جاتی ہیں

جیسے پگھلے تارکول کی سڑک پر ٹائروں کے نشان

ہماری چیخیں، خود ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہیں

اے ہماری ماؤں! تم نے ہمیں کیوں پیدا کیا

اے میری ماں! تجھے علم تھا کہ تیرے خون کو لوگ خاک میں ملائیں گے

اے چمکتے ہُوئے اُبھرتے ہُوئے فلم اسٹار!

ہمارے لیے تنہائی کی یافت ناممکن ہے

بسوں میں، شاہراہوں پر، سڑکوں اور بازاروں میں

ہر طرف، تحیّر میں ملفوف آوازیں "وہ دیکھو—— وہ [illegible]"

شخصیت کی یہ برہنگی، ناقابلِ برداشت ہے

ہر اخبار، ہر رسالے، ہر پوسٹر میں موجود

مارلین منرو کو سب چاہتے اور جانتے ہیں

مگر اس دل سے بے خبر ہیں جو اس بے معنی جسم کے اندر بجھ رہا ہے

مگر وہ تو

اپنی زندگی کا تلذذ تمہارے جسم کی جگمگاہٹ میں ڈھونڈتے ہیں

وہ تمہاری آنکھوں اور تمہارے چہرے سے اپنے ذہن کے مطابق

عیاشی نچوڑتے ہیں

یہ سب یاد رکھنا۔ اُف خُدایا!

کتنا دردناک ہے

دیکھو۔ ایک طرف میری نیم برہنہ تصویر ہے

اور دوسری طرف دو سطروں میں تحریر ہے

مارلین منرو مرگئی...

پروڈیوسر نے اپنے پیٹ کا دوزخ بجھاتے ہوئے چیخ کر کہا تھا

تم تو گڑیا ہو۔ تمہارے ابرو تو بیش قیمت زر و جواہر سے بھی بیش قیمت ہیں

مگر تمہیں یہ خبر نہیں ہے کہ ان جواہر کی ساری شکلوں کی ایک صورت

حسین جواں لڑکیو! خودکشی ہے۔

خودکشی تو وہی کرتے ہیں جن کا جواں خون

بپھرے سمندر کی صورت ساحلوں کے خوف سے آزاد ہوتا ہے

بے تحاشا عالمِ بے ہوشی بھی تو خودکشی ہے

بڑی بڑی کرسیوں والے اس عالم میں کیمرے کی چمک دیکھ کر

زرد پڑ جاتے ہیں

خودکشیاں

خودکشیاں

ابدی ہیروشیما تڑخ رہا ہے۔

میری چیخیں ناقابلِ برداشت ہیں

ناقابلِ برداشت ہے، وہ انتظار

جو ہر چیز کے تباہ ہو جانے کی قید سے بندھا ہے۔

آخر کیوں ہاتھ سے مٹی کے تیل کا بھبکا اُٹھ رہا ہے

نیلگوں بلور پر ہاتھ ناقابلِ برداشت حد تک جل جاتے ہیں

اے اطلسی لباسو! الوداع

میں ایک کمزور عورت ہوں

کیا میں کبھی کارِ جہاں کو دُرست کر سکوں گی

مگر اب نہیں

اب بس الوداع ..... الوداع .....

جورج سیفیرس

۲۹- فروری ۱۹۰۰ء میں سمرنا میں پیدا ہُوا۔

۱۹۱۴ء میں اس کا خاندان ایتھنز میں منتقل ہوگیا۔

۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۴ء تک پیرس میں تعلیم حاصل کی، اور ۱۹۲۶ء میں یونان کے سفارتی محکمے سے منسلک ہوگیا۔

سب سے پہلے اسے لندن میں تعینات کیا گیا۔ بعد میں وہ البانیہ میں قونصل بھی رہا۔ جنگ کے زمانے میں وہ آزاد یونانی حکومت کے ساتھ کام کرتا رہا، اور اس دَوران اسے کریٹ، جنوبی افریقہ، مصر، فلسطین، لندن اور اٹلی میں قیام کا موقع ملا۔ ۱۹۴۵ء میں آزادی کے بعد وہ واپس ایتھنز آگیا۔ اپنے کام کے دَوران اسے ترکی، لبنان، شام، اردن اور عراق جانے کا اتفاق ہُوا۔ اس کے بعد وہ لندن میں سفیر مقرر ہُوا۔

۱۹۶۳ء میں اسے ادب کا نوبل پرائز ملا۔

بعد میں وہ سفارت کا عہدہ چھوڑ کر ایتھنز میں رہنے لگا، اور وہیں گوشہ نشینی کی حالت میں اس کا انتقال ہُوا۔

اس کی شاعری میں یونانی روایت کے اثر کے علاوہ یورپ کی

جدید علامتی شاعری کا اثر نمایاں ہے۔ خاص طور پر وہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ سے متاثر تھا۔ ایلیٹ کی نظم "ویسٹ لینڈ" کا اس نے یونانی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔

منظر

شام یوں آتی ہے
جیسے ایک چڑیا جس کے پر ٹوٹے ہوں
اور جو سالہا سال تک اُڑتی رہی ہو
وہ چڑیا جو اب تمازت اور ہوا بھی
برداشت کرنے کے قابل نہ ہو،
شام یوں آتی ہے
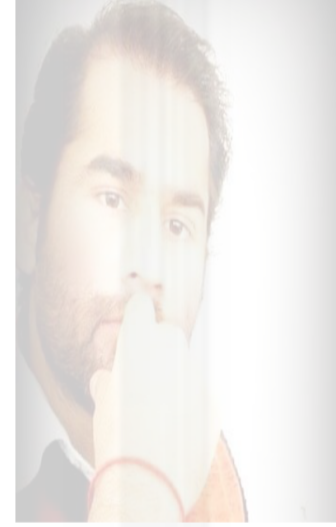
سبز گھاس پر
تین ہزار فرشتوں نے تمام دن ننگے تانبے کی طرح رقص کیا ہے
اور پھر زرد شام ہوتی ہے
تو تین ہزار فرشتے اپنے پروں میں چھپ کر کُتّا بن گئے۔

جسے سب بھول چکے ہیں

جو تنہائی میں بھونکتا ہے

اپنے آقا کو تلاش کرتا ہے

یا ظہورِ ثانی کے انتظار میں ہے

یا پھر کسی ہڈی کو چبانے کا خواہاں ہے۔

اب مجھے صرف اور صرف خاموشی کی تمنا ہے

اب مجھے کسی پہاڑی پر یا ساحلِ سمندر پر

ایک جھونپڑی کی تمنا ہے

اور میں اس جھونپڑی میں کھڑکی کے سامنے

نیلے سمندر کی طرح پھیلی ہوئی نیلاہٹ دیکھنا چاہتا ہوں

میں چاہتا ہوں میرے دراز میں

تار پہ منڈھے ہوئے کاغذ کی شکل میں مصنوعی کارنیشن ہی لگا ہو

تاکہ اُسے ہوا آسانی سے اپنے قابو میں کرسکے۔

شام ہوگی

بھیڑوں کے گلّے خیابانوں کی سمت ایک اچھے خوشگوار تصور کی طرح پلٹیں گے

اور میں سونے کے لیے لیٹ جاؤں گا

کیونکہ میرے پاس روشن کرنے کے لیے ایک موم بتی بھی نہیں

روشنی نہیں کہ میں پڑھ سکوں۔

میں دیکھتا ہوں کہ درختوں نے مرے ہونٹوں کی سیاہ طمانیت کو جذب کر کے
مسکراہٹوں کو سجایا ہے
مگر یہ وہ مسکراہٹ ہے جو مجسموں کے چہروں پہ عیاں نہیں ہوتی ہے

آئینے میں

میرے سینے کے زخم پھر جلنے لگتے ہیں
جب ستارے اُتر کر میرے جسم و جاں میں گھُل جاتے ہیں
اور جب لوگوں کے قدموں تلے خاموشی کچلی جاتی ہے۔

وقت کے سمندر میں یہ ڈوبتے پتھر
مجھے کب تک اپنے ساتھ گھسیٹتے چلیں گے
یہ پھیلا، بپھرا سمندر
کون اسے خشک کر سکے گا
میں ہر صبح اپنے ہاتھوں کو ذلت اور پراگندگی میں آلودہ دیکھتا ہوں
میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں
میں اذیتوں سے بنی ہوئی ایک چٹان ہوں

مختصر نظمیں

دو تلخ لمحوں کے درمیاں
تمھیں سانس لینے کی مہلت نہیں ملتی ہے
تمھارا چہرہ تمھارے اپنے چہرے کے مقابل ہوتا ہے
تمھارے چہرے پہ بچّے کی سی معصومیت
آتی ہے ، غائب ہو جاتی ہے ۔

ہر صبح پانی کی گرمی مجھے یاد دلاتی ہے
کہ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چیز
زندہ نہیں ہے ۔

سمندر کی جانب مت دیکھو
جھاگ بناتی ، دُور پھیلتی لہروں کو مت دیکھو
آسمان تلے ہم تو خود مچھلیاں ہیں
اور درخت سمندری گھاس ہیں

چاہے روشنی ہو یا اندھیرا
چنبیلی تو سدا سفید رہتی ہے

اس دُنیا نے اپنی رنگت کھو دی ہے
یہ پچھلے سال کی سمندری گھاس کی طرح ہے
خشک اور سرمئی
جو ہَوا کے رحم و کرم پر ہوتی ہے
یہ طویل سمندر اور دو آنکھیں
تیز مگر بے حرکت ہَوا کی طرح
اور میرے پتوار اس وقت تک ہیں
جب تک موجود ہیں

اور میرا خدا بھی

سارے شہر میں گھنٹیوں کی آواز
یوں گونج رہی ہے جیسے سکّے گر رہے ہیں
ہر نئے انداز کے ساتھ ایک نیا دَر
روشن ہو جاتا ہے
جیسے زمین پر پانی کا ایک قطرہ
وہ لمحہ آگیا ہے
اب مجھے اُوپر اُٹھاؤ

نیند نے اسے پھلوں اور پتّیوں کے خوابوں سے بھر دیا
بیداری نے اسے ایک رس بھری بھی اُٹھانے پر مجبور کیا
اور دونوں نے مل کر اس کے اعضا کو خواہش زدہ عورتوں
میں تقسیم کر دیا۔

مَیں سو رہا ہوں اور میرا دل بیدار ہے

یہ ستاروں، آسمان اور افق
اور جہاز کے عرشے پر کھل کھلا کر
پھیلتے پانی کو گھور رہا ہے

سمندری غاروں میں بھی
پیاس اور محبت بستی ہے
سمندری غاروں میں بھی خود لذّتی کی کیفیت
بالکل اسی طرح سخت دکھائی دیتی ہے
جیسے ایک سیپی جسے تم اپنی ہتھیلی پہ
رکھ لیتے ہو۔

سمندری غاروں میں
سارا سارا دن، مَیں نے تمھاری آنکھوں میں
جھانکا ہے۔
مَیں تمھیں نہیں جانتا تھا۔
اور تم بھی مجھے نہیں جانتی تھیں

تین لال کبوتر روشنی میں
ہماری تقدیر لکھ رہے ہیں
لوگوں کے ساتھ ہماری محبتوں اور رفاقتوں کے رنگوں
اور عکسوں میں وہ ہماری تقدیر لکھ رہے ہیں ۔

کینتھ پیچن

کینتھ پیچن ۳ دسمبر ۱۹۱۱ء کو امریکہ کی ریاست اوہایو میں پیدا ہُوا ۔

سکول میں تعلیم پانے کے بعد سترہ سال کی عمر میں اپنے باپ کے ساتھ فولاد کے کارخانے میں کام کرنے لگا ۔

اس کے بعد کافی عرصے تک وہ آوارہ پھرتا رہا ۔ جہاں بھی کوئی کام ملتا کر لیتا ۔

۱۹۳۶ء میں اسے ایک ادبی وظیفہ ملنے لگا ۔

اس کا پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۳۶ء ہی میں شائع ہوا ۔

اس مجموعے کی نظمیں انقلابی جوش اور ہیئت کے تجربوں سے پُر تھیں ۔

بعد کے مجموعوں میں ٹھہراؤ اور پختگی آ گئی ۔

پیچن کی بیشتر تخلیقات خوفناک خوابوں کی دُنیا میں تشکیل پاتی ہیں ۔ ایسی دُنیا جس میں مزاح بھی ہیبت ناک بن جاتا ہے ۔ یہ جنونی کیفیات کی دُنیا ہے ۔

پیچن نے شاعری کے علاوہ نثر بھی لکھی ۔ وہ کئی ناولوں کا بھی مصنّف ہے ۔

اس کی صحت خراب رہتی تھی، اس کے باوجود اس نے پچیس سے زیادہ کتابیں لکھیں۔

اس نے امریکہ کی بول چال کی زبان کو بڑی مہارت سے استعمال کیا ہے۔

اس کی تحریریں بدصورتی، تشدد اور دھوکے بازی کے خلاف احتجاج سے لبریز ہیں۔

پیچن نے جنوری ۲۰۰۱۹ء میں وفات پائی۔

آؤ ہم کھُل کے پاگل پن کا مظاہرہ کریں

اے میری نسل کے لوگو!
آؤ ہم کھُل کے پاگل پن کا مظاہرہ کریں
ہمیں اس عہدِ بربریت کے نقشِ قدم پہ چلنا چاہیے۔
ہم وہ جہت بھی دیکھیں
جو عصر کی دھندلی سرزمین کو
ابد کے بے در گنبدوں میں مقید کر کے
اس آواز سے بھرپُور ہو جو مَوت کی آواز ہو
اس چہرے کے رنگ لیے ہو، جو مُردہ چیزوں پر
بن کہے ہی جم جاتے ہیں۔

ہم بہت کچھ چاہتے تھے

ہم اِک فراخ در اور بے پناہ چاہت کی خواہش میں
خاک بسر ہوئے
ہم نے دِنوں کی خُبثت آمیز تاریکی کو بدلنے کی کوشش کی
لیکن ،
اس سرزمین پر
اور اس سرزمین کے فرسودہ ذہنوں کی
بڑی بڑی قبروں پر
تاحدِ نظر پھیلے ہُوئے دوزخ اور دُھندلاہٹوں کے سوا
ہمیں کچھ نہ مِلا ۔

لیوپولڈ سیدار سینگھور

لیوپولڈ سیدار سینگھور ۹۔ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو سینیگال میں پیدا ہُوا۔
اس کا باپ ایک امیر زمیندار تھا۔
اس کا خاندانی مذہب رومن کیتھولک تھا۔
جوانی میں وہ پادری بننے کا خواہاں تھا۔
لیکن آہستہ آہستہ اس کا یہ شوق ماند پڑ گیا۔
۱۹۲۶ء میں جب اس نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تو اس کے اُستادوں نے اس کی غیر معمولی قابلیت سے متاثر ہو کر اس کے لیے پیرس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا انتظام کروا دیا۔

پیرس ہی میں اس کے اندر شاعری کا بے پناہ شوق پیدا ہُوا۔
بودلیئر کی شاعری پر تھیسس لکھ کر اُس نے فلسفے کے شعبے میں داخلہ لے لیا۔ سند حاصل کرنے کے بعد وہ گرامر سکول میں اُستاد مقرر ہو گیا۔
جنگ کے دوران اسے فوجی خدمت کے لیے بُلا لیا گیا۔ فرانس کی شکست کے بعد وہ جرمنوں کی قید میں بھی رہا۔ لیکن ۱۹۴۳ء میں اُسے دوبارہ معلمی کا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت مل گئی۔
اسی زمانے میں وہ سیاست میں دلچسپی لینے لگا۔

۱۹۴۵ء میں وہ سینیگال کی دستور ساز اسمبلی کا ممبر منتخب ہُوا۔

۱۹۶۰ء میں وہ جمہوریہ سینیگال کا پہلا صدر منتخب ہُوا۔ جس عہدہ پر وہ آج تک فائز ہے۔

سینگھور کی شاعری ۱۹۴۵ء سے شائع ہو رہی ہے۔

وہ فرانسیسی زبان میں لکھنے والے افریقی شاعروں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔

وہ انسان دوستی اور سوشلزم پر ایمان رکھتا ہے۔

سیہ عورت

برہنہ عورت ، سیہ عورت
تم اپنے رنگ میں ملبوس ہو
یہی زندگی ہے
تم اپنے جسم کے خطوط میں گُم ہو
یہی خوبصورتی ہے
مَیں تمھارے سائے میں جوان ہُوا ہوں
تمھارے ہاتھوں کی نرمی ، میری آنکھوں کو سکون بخشتی رہی ہے
اور اب سُورج کی تمازت میں نہائی ہوئی
چوٹی کی بلندی پر
گرمی کی انتہا

اور دوپہر کے عروج کے ساتھ
اے مری ارضِ موعودہ
میں تمھارے پاس آگیا ہوں
تمھاری خوبصورتی میرے دل میں
چیل کے جھپٹے کی طرح آ کر لگتی ہے۔

برہنہ عورت، سیہ عورت
پکے ہوئے گودے سے بھرے ہوئے پھل
سیہ شراب کی خزینہ لذت
ایسا دہن جو میرے دہن کو بھی تغزل بخشے
افق تا افق پھیلے ہوئے سبزہ زار!
سبزہ زار، جو مشرقی ہواؤں کی نازبرداری
کے باعث جوان ہیں
فاتح کی انگلیوں سے نقش و نگار بناتے ہوئے
ٹام، ٹام۔ ٹاٹ۔ ٹام، ٹام، جیسے نعرے
تمھاری نازک نسوانی آواز، محبوبہ کا روحانی گیت ہیں۔

برہنہ عورت، سیہ عورت
تیل جسے سانس منتشر نہیں کر سکتا
پُرسکون تیل، کھلاڑی کے اعضا پہ
مالی[1] کے شہزادوں کے اعضا پہ،
اے غزال! تمھارے اعضا جنت میں بنے ہوئے ہیں
موتی، تمھاری رات نما جلد پہ
ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں
ذہنوں کی خوشیاں
تمھاری آبدار جلد سے رگڑ کر،
سُرخ سونے کا چمکنا
تمھارے بالوں کے سائے میں،
تمھاری آنکھوں کے سُورجوں کی دوسراہٹ میں
میری حفاظت کی ذمہ داری، ذرا آسان ہو جاتی ہے۔

برہنہ عورت، سیہ عورت
میں تمھاری اس خوبصورتی کے بارے میں نوحہ گر ہوں

[1] ملک کا نام

جو گزر رہی ہے

مَیں تمھارے لیے وہ ابدی پیکر تخلیق کرتا ہوں

جیسے قسمت کے حاسد ہاتھ

راکھ کی طرح ۔ زندگی کے درخت کی جڑوں کو

غذا دینے کے لیے بکھیر دیتے ہیں ۔
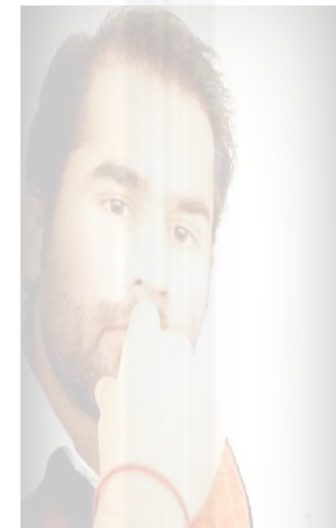
فروغ فرّخ زاد

جدید ایران کی یہ منفرد شاعرہ ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئی اور ۱۹۶۶ء میں ایک کار کے حادثے میں اُس کا انتقال ہُوا ۔

فروغ کی نظموں کے چار مجموعے اسیر، دیوار، عصیاں اور تولدِ دیگر ہیں جو اس کی زندگی میں ہی چھپ گئے تھے ۔

فروغ کے موضوع عشق، حُسن اور مَوت ہیں ۔ یہ سب مضامین عورت کے چہرے کے گرد گھومتے ہیں، جو خود اس کا چہرہ ہے ۔

حُسن اُس کی صفت، عشق اس کا خمیر اور مَوت (اپنی یا محبوب کی) اس کی تقدیر ہے ——— وہ اپنی شاعری میں عورت کے دل کے وہ اسرار بیان کرتی ہے جو خود عورت کی زبان پر کم آتے ہیں ۔

فروغ کے پہلے تین مجموعے بچپن کی یادوں سے بھرے ہوئے ہیں ۔ لیکن آخری مجموعے "تولدِ دیگر" میں فروغ کا عشق نئے ابعاد میں داخل ہوتا ہے ۔ اب یہ صرف ذات کا عشق نہیں ۔ گزرے ہُوئے دنوں کی سرمستی کا عشق نہیں بلکہ انسان کا عشق ہے ۔ سچائی کا ، سچے فنکار کا ، سچی شاعری کا ۔

فروغ کی شاعری مجموعی طور پر فکری شاعری نہیں ہے ۔ لیکن فروغ کو زندگی کے حُسن سے جو گہرا عشق ہے وہ کسی اور موجودہ شاعر میں کم ملتا ہے ۔

فروغ کے پہلے مجموعے "اسیر" میں ایک عورت کا آہ و نالہ سُنائی دیتا ہے ۔ آزادی کے لیے اس کی پکار سنائی دیتی ہے ۔ ایک ایسی عورت کی پکار جو گھر کے دھندوں میں بُری طرح گھری ہو ۔ اور ان مجبوریوں سے اکتا کر بھاگ جانا چاہتی ہو ۔" دیوار " اور "عصیان " میں تمام مروّجہ عقائد کے خلاف تند و تیز آوازے سنائی دیتے ہیں ۔" تولدِ دیگر " کی نظمیں زیادہ پختگی کی حامل ہیں ۔ ان میں اس کے درد نے ایک حد تک آفاقیت پالی ہے ۔ ان نظموں کی اہمیت کا راز یہ ہے کہ یہی اس کی تمام شاعری میں انسانیت کے لیے امید کا ایک روزن ہیں ۔ اور ان ہی میں اس کے عشق نے ایک نیا عرفان پایا ہے ۔"

(اقتباس : ن ۔ م ۔ راشد)

فشارِ زرد

مجھے یہ شوق بھی نہیں کہ مَیں زمیں کی خاک
آسماں کا ستارہ بن کے جی رہوں
مجھے یہ آرزو نہیں کہ برگزیدہ ہستیوں کی شکل میں
ملائکِ سپہرِ عنبریں کی ہم نشیں بنوں
مَیں اس زمیں کی خاک ہوں
ستارہ بن کے جی نہ پاؤں گی کبھی
مرا یہ خاک خاک جسم
میانِ دشت، سوکھی گھاس کی طرح ، اُجاڑ بے بہار ہے ۔
مگر مجھے یقین ہے
نئی بہار کی سُبک قدم صبا
مرے وجود سے ملے گی
تو مَیں بھول جاؤں گی

ہر ایک چہرہ دستِ خزاں

کھُلے گا بازیافت کا سنہرا دَر

یہ بازیافت

زندگی کی کالی کوٹھڑی کے بازوؤں میں ہو سکے گی کیا

یہاں تو عشق بے مزہ ، دھوئیں کے جالے بن کے

کوٹھڑی کی چھت سے اب زمیں تلک پہنچ چکا ۔

صدا کہاں ، کہ حرف بے زبان ہیں

وفا کا جسم ، زہرِ اجتناب پی کے

مدتوں کا سو چکا

وہ آنکھ جس میں شائبے سے خواب کوئی جاگتا

وہ آنکھ دُودِ سرزنش کے گھاؤ کھا کے بجھ گئی

نہ ہونٹ ہیں ، نہ حرف ہیں

زباں نہ خواب اور نہ جسم

مگر یہ جاں جو ہچکیوں کی شکل میں

فشارِ زرد کے سوا کچھ اور بھی نہیں

بضد ہے بازیافت پر ۔

آتشِ خاموش

رات اندھیری ، طویل راستہ اور مَیں حیران ،

وہ مرے راستے میں فانوس پکڑے کھڑا ہے

فانوس کے شعلۂ بے شکیب کو

میری نگاہ وحشت زدہ ہو کر دیکھتی ہے ۔

ہم پہ کیا گزُرتی ہے ـــــــ کسی کو کیا معلوم

بھیگے ہوئے سبزے کا بستر کہتا ہے

میری گردن سے اپنے لب پیوستہ کر دو

ہزاروں جلتے ہوئے بوسے تمھارا استقبال کریں گے ۔

ہم پہ کیا گزرتی ہے ، کسی کو کیا معلوم

میں " وہ " بن جاؤں

وہ جو دریا کے خروش جیسا ہے۔
مَیں بگولے کی طرح وحشی ہوں
وہ صحرا میں ٹھنڈی ہوا جیسا ہے،
مَیں اُس کے بازوؤں میں ہوں اور تشنہ ہوں
میرا شوق مجھے گھاس کی طرح روندتا رہے گا
جب تک کہ مَیں ان لرزتے ہُوئے شگوفوں کا عرق
رات کے جام میں انڈیل کے پیاس بجھاؤں
بھیگے ہُوئے سبزے کے بستر پہ
بے دَم، شعلوں میں لپٹی ہوئی پڑی ہوں
ڈرتی ہوں کہیں یہ بے پروا نسیم
اگر مُجھ سے آ کے یونہی لپٹتی رہی
تو میرے پیکر میں شوق کی روندی ہوئی گھاس پھر سر اُٹھائے گی

براگو ڈیوپ

۱۹۰۶ء میں ڈاکر، سینیگال میں پیدا ہُوا۔ سکول کی تعلیم کے بعد اُس نے امورِ حیوانات کے سرجن کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد کئی سال تک امورِ حیوانات کے افسر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اُس کا مجموعۂ کلام ۱۹۶۰ء میں شائع ہُوا۔ اس نے بہت سی افریقی کہانیوں کو فرانسیسی میں منتقل بھی کیا ہے۔ اس کی شاعری میں مقامی روایات کا اثر نمایاں ہے۔

یہ ہمارے اجداد کی سانسوں کی آواز ہے

انسانوں سے زیادہ اشیا کی باتیں سنو۔

سنو۔ آگ کی آواز

سنو۔ پانی کی آواز

سنو۔ ہواؤں میں درختوں کی سسکیوں کی آواز۔

یہ ہمارے اجداد کی سانسوں کی آواز ہے۔

مرنے والے ہمیشہ کے لیے نہیں جاتے ہیں

وہ زرد سایوں میں موجود ہیں

وہ گہرے ہوتے ہوئے سایوں میں موجود ہیں

وہ جو مر گئے ہیں۔ وہ زمین کے نیچے ہیں

وہ ہلتے ہوئے درختوں

گھنے جنگلوں

بہتے پانی

کھڑے پانی

اور پُر ہجوم بستیوں میں موجود ہیں

مرنے والے مرا نہیں کرتے ہیں

انسانوں سے زیادہ اشیا کی باتیں سنو

سنو۔ آگ کی آواز

سنو۔ پانی کی آواز

سنو۔ ہواؤں میں درختوں کی سسکیوں کی آواز

یہ ہمارے اجداد کی سانسوں کی آواز ہے۔

وہ مر نہیں گئے

وہ زمین کے نیچے نہیں ہیں۔

وہ مُردہ نہیں ہیں

مرنے والے ہمیشہ کے لیے نہیں جاتے ہیں

وہ عورت کی چھاتیوں

بچے کی چیخوں اور چمکتی چنگاریوں میں موجود ہوتے ہیں

وہ جو مر گئے ہیں ۔ زمین کے نیچے نہیں ہیں

وہ بھڑکتی ہوئی آگ

روتے ہوئے پودوں

کراہتی چٹانوں

جنگلوں سے بھری ہوئی جگہوں اور گھروں میں موجود ہیں ۔

مرنے والے مرا نہیں کرتے

انسانوں سے زیادہ اشیا کی باتیں سنو ۔

سنو ۔ آگ کی آواز

سنو ۔ پانی کی آواز

سنو ۔ ہواؤں میں درختوں کی سسکیوں کی آواز

یہ ہمارے اجداد کی سانسوں کی آواز ہے ۔

رومانیہ کے شاعر

آئیون مینولیسکو :

پیدائش ۱۸۸۱ء ، وفات ۱۹۴۴ء

شاعری کے چار مجموعے ، ڈراموں کے دو مجموعے ، نثر کے سات مجموعے شائع ہوئے ۔

ایمل ایساک :

پیدائش ۱۸۸۹ء ، وفات ۱۹۵۵ء

شاعری کے چھ مجموعے اور ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ۔

آئیون پلاٹ :

پیدائش ۱۸۹۱ء ، وفات ۱۹۴۵ء

شاعری کے بارہ مجموعے ، ڈراموں کے دو اور مضامین کے دو مجموعے شائع ہوئے ۔

ڈیموستین بوتیز :

پیدائش ۱۸۹۳ء ، ابھی حیات ہیں

شاعری کے گیارہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔

لوسیان بلاگا :

پیدائش ۱۸۹۵ء ، وفات ۱۹۶۱ء

شاعری کے آٹھ مجموعے، ڈراموں کے پانچ، فلسفے پر چار کتابیں یادداشتوں پر مشتمل ایک مجموعۂ مضامین اور تنقید کی دو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

آئیون وینیا :

پیدائش ۱۹۰۰ء ، وفات ۱۹۶۴ء

شاعری کا ایک مجموعہ، ایک ناول اور نثر کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔

الفلیپیڈ :

پیدائش ۱۹۰۰ء ، ابھی حیات ہیں۔

شاعری کے سات مجموعے اور تنقید کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔

راڈو بوریٹیو :

پیدائش ۱۹۰۶ء

شاعری کے گیارہ مجموعے اور نثر کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ویرونیکا پورم باکو :

پیدائش ۱۹۲۱ء

کمیونسٹ پارٹی کی سرگرم کارکن ہیں۔ خواتین کی شاعری کا ایک بین الاقوامی انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ بہت چابک دست مترجم اور مشہور مؤلف ہیں۔ دس شعری مجموعے اور تین سفرنامے شائع ہو چکے ہیں۔

سٹیفان آگسٹن ڈوئیناس :

پیدائش ۱۹۲۲ء

سترہ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔ فرانسیسی تراجم میں بہت مشہور ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ۴۰ سال کی عمر میں شائع ہوئی مگر اس کے بعد ان کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔ اب تک تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

نیناکسان :

پیدائش ۱۹۲۴ء

بچپن ہی سے شاعری کرتی ہیں۔ شعری حیات سے بھرپور شاعری کے ۱۲ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جرمن اور فرانسیسی تراجم کے علاوہ بچوں کے لیے نظمیں لکھنے کے لیے بھی مشہور ہیں۔

آئیون ہورا :

پیدائش ۱۹۲۹ء

رائٹرز یونین کے سکریٹری ہیں۔ نئے شعری آہنگ کے لیے بہت مقبول اور مشہور ہیں۔

تیبریواتان :

پیدائش ۱۹۳۰ء

ادبی صحافت میں بہت مشہور ہیں۔ رائٹرز یونین کے ہفتہ دار جریدے کے ۱۹۶۶ء تک مدیر رہے۔

اورل رائیٹو:

پیدائش ۱۹۳۰ء

رائٹرز یونین کی نیشنل ایگزکٹو کے ممبر ہیں۔ مغربی یورپین ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اطالوی، ہسپانوی اور فرانسیسی ادب کا ترجمہ کیا ہے۔ شاعری کے چھ مجموعے اور ایک سفرنامہ شائع ہوا ہے۔

نکولائی لیبس:

پیدائش ۱۹۳۵ء، ۱۹۵۶ء میں ٹرک کے ایک حادثے میں مارے گئے۔ ان کا بچپن دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں، افلاس اور تباہ کاری سے نبرد آزمائی میں گزرا۔ شاعری میں ان صعوبتوں کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ شاعری کے ۵ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔

نیچیتا ستینسکیو:

پیدائش ۱۹۳۳ء

رومانیہ کے سب سے متنازعہ شاعر ہیں۔ رائٹرز یونین کا ۱۹۶۴ء کا شاعری کا انعام ملا اور اب ادبی رسالے کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں۔

مارن سوریسکو:

پیدائش ۱۹۳۶ء

فلسفے کے طالب علم رہے۔ اینیما فلم سٹوڈیو میں پروڈکشن ایڈیٹر کے طور پر کام کرتے ہیں۔ شاعری کے پانچ اور ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔

اینا بلینڈیانہ:

پیدائش ۱۹۴۲ء

نجارسٹ میں ایک رسالے "ایمفی تھیٹر" میں کام کرتی ہیں۔ وہ رومانیہ میں خصوصی نسوانی لہجے کے لیے مشہور ہیں۔ شاعری کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

آئیون میتولیسکو
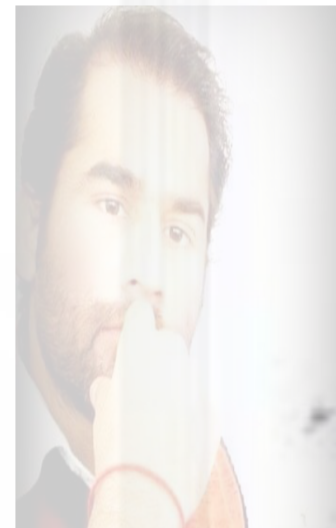
تین گیتوں کا گیت

مَیں نے اپنے آپ سے کہا تھا
مَیں تین گیت لکھوں گا
اور ان تینوں گیتوں میں
مَیں تین لاشیں دفن کر دوں گا
مَیں ان لاشوں کو تانبے کے تین تابوتوں میں
دفن کر دوں گا
تین لمحے
بنجر ، بے حس
سکّے کی طرح میری چھاتی سے چپٹے ہُوئے ہیں
تین بے جان اور بے حس نجوم کی طرح
جو غیر یقینی کیفیت کے باعث ۔ نظر سے اوجھل ہو گئے ہوں
سائپرس کی شاخ پہ لٹکے تین لاروؤں کی طرح

پھر مَیں نے اپنے آپ سے کہا
مَیں پہلا گیت فلورنس کے رہنے والے کی طرح لکھوں گا
جیسا کہ ڈانٹے نے لکھا ہو گا
جبکہ وہ بیٹرس سے ملا تھا
میں اس کی ہر لائن کو سونے سے بھر دُوں گا
اتنا سونا ۔ اتنا سونا
جتنا کہ پہلے معتقد نے پہلے عیسائی کی قبر پہ لاد دیا تھا ۔
دوسرا گیت ،
مَیں لزبین انداز میں لکھوں گا
لیزبوز کی پاگل مغنّیہ عورتوں کے انداز میں
جیسے وہ محبت کے گیت گاتی ہیں
مَیں اسے سُرخ رنگ سے بھر دُوں گا
مَیں خوش بخت بیسواؤں کے ہونٹوں سے
یہ سُرخ رنگ کشید کروں گا
اور تیسرے گیت کے لیے
مَیں سب سے دُکھ بھری شکل انتخاب کروں گا

میں اس میں جذبات کی وہ حدت اور شدت تحلیل کروں گا
کہ قطبی ویران راتوں میں بھی ان کی دلسوزی
کی کراہتیں گونجیں گی
میں اسے سبز رنگ سے بھر دوں گا
دلدلوں میں اُگے سبزے جیسا سبز رنگ
کہ جہاں وہ لوگ جو محبت کے رجز سے عاری ہوں
محبت کو دفن تو کر سکیں

تو میں نے خود سے کہا
میں تین گیت لکھوں گا
مگر تمام پرانے سونے اور ہونٹوں کے سُرخ رنگ میں سے
صرف ایک دھبہ باقی رہ گیا ہے
ایک سبز دھبہ۔ وہ اس قدر بوجھل ہے جیسا کہ قبر کا پتھر
جس کے نیچے، تین تابوتوں میں گٹار کے تین تار
سوئے ہُوئے ہیں۔ اور گٹار
کہیں نہیں ہے۔

واپسی

کسان کام سے واپس، گھروں کو پلٹ رہے ہیں
ان کے چہروں پر عمر گزرنے کا نوحہ رقم ہے
ان کے ہَل اور ان کے چپّل
رنج و محن کا آئینہ ہیں
اور چہرے آنسوؤں سے عرق عرق ہیں
وہ چہرے نیوڑھائے، بے دلی سے چل رہے ہیں
ان کی رُوحیں بوجھل ہیں
اور ان کی جیبیں خالی ہیں
جیسے ہی وہ ان کی طرف آتے ہیں
سُورج، ایک آورش کی طرح

ان پر شعاع افروز ہوتا ہے ۔
تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ چلتے ہُوئے
وہ گھروں کی سمت جاتے ہیں
ایک کھُلی ہوئی بگھی ان کے پاس سے گزرتی ہے
جس میں امرا اور بیگمات
زیورات اور خوشبوؤں میں بسے ہوئے ہیں ۔
جیسے یہ ان کے پاس سے گزرتی ہے
کسان ہمیشہ کی طرح
بُزدلی کے ساتھ برہم ہوتے ہیں
"زندگی یہی ہے"
ہم گندم کی فصل اُگاتے ہیں
اور یہ "لوگ" کھاتے ہیں
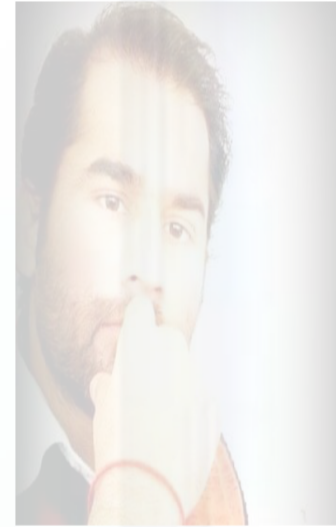
ایک لائن کی نظمیں

رقاصہ

اس کا چہرہ نقاب میں چُھپا ہُوا تھا
بغیر کسی حرکت کے وہ چلی جاتی ہے ۔

شاعرانہ فن

یہ الفاظ نہیں ۔ خامشی ہے
جو کہ ایک گیت کو اس کا حسن بخشتی ہے ۔

نشاطِ شب

پاپلر کی وہ رات تمھیں یاد ہے
جب زرد چاند بھی ہمارا ہم سفر تھا۔

شناخت

لامحدود، دُنیا، دائم و قائم ہے
مَیں اس ساری دُنیا کو کبھی بھی نہ دیکھ سکوں گی
مَیں نقشوں کے حوالے سے اَن دیکھے مقامات کا
تصور باندھتی ہوں
مَیں اٹلس سے کان لگا کر
ان علاقوں کی آوازوں کو سُننے کی کوشش کرتی ہُوں
مَیں خیالوں میں گھنے جنگل، پھیلے ہُوئے صحرا
اور چاندی سے چمکتے، مگر راستہ بدلتے دریاؤں کی راہ گزر دیکھتی ہوں
مَیں مشرق کی جانب اپنی آنکھوں کو مرکوز کر دیتی ہوں

یہ سوچ کر کہ مَیں ایورسٹ کو دیکھ رہی ہوں
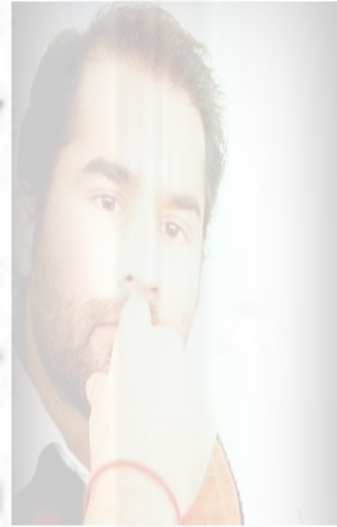
اور پھر مَیں شام کی خامشی سے کان لگا کر بیٹھتی ہوں
کہ شاید، مَیں نیاگرا کی مترنّم آواز سُن سکوں
مَیں خواب میں
قطبِ شمالی کے سفید ریچھوں کو دیکھتی ہوں
فیورڈ کی چٹانوں میں
چھوں کے گھونسلوں کو دیکھتی ہوں
اور سمندروں کی وسعتوں میں
آہستگی سے بڑھتے ہُوئے، جہازوں کو دیکھتی ہوں
جو کہ بڑھتی اور پھیلتی اُفق کی جانب رواں ہیں۔

مَیں ساری دُنیا کے لوگوں کو جاننا چاہتی ہوں
مَیں ان سب کو ان کے ناموں اور ان کے اندازِ بیان
تک کے حوالے سے جاننا چاہتی ہوں
تاکہ میرا چہرہ ناشناسا نہ رہے
اور ان تمام چہروں، ان تمام لہجوں میں میرا بھی کچھ حصّہ ہو۔

مَیں تمھارے سامنے رُک گیا

مَیں ہر جگہ ایسے سائے کی تلاش میں بھٹکا ہوں
جو کسی چہرے پہ سجی لمبی پلکوں تلے میسّر ہو
مَیں اس سائے کی تلاش میں مشرق و مغرب
اور پریوں کی کہانیوں کے مُلکوں میں مارا مارا پھرا ہوں۔

یہ بہت دیر سے ہُوا، جب مَیں نے اسے پایا
یہاں میرے اپنے مُلک میں، اپنے ہی لوگوں کے درمیان
مَیں تمھارے سامنے اس وقت آ کر رُکا، جب تم خاموش تھیں۔
تم نے مجھ سے کہا "مجھے مت چھوڑ"
مَیں تمھارے سامنے رُک گیا تھا

جانتی ہو کیوں

کیوں کہ تمھارے بال اس آگ کی طرح تھے

جسے کوئی بھی ہوا بجھا نہیں سکتی ہے

تمام جادوؤں میں سب سے سادہ اس جادو سے متاثر ہو کر

مَیں رُک گیا اور تمھاری پرستش کرنے لگا

خستگی

کھیتوں کی اُجڑی جوانی اور خز

افسردگی مجھ میں سمائی ہوئی ہے

ایک بوسہ بھی میری رُوح تک نہیں پہ

ایک برف پارہ بھی اس زمین کو نہیں چھو

دُکھ کا گیت

سب سے زیادہ دُکھ بھرا گیت

کرفیو کے وقت

بے بسی اور کسمپرسی کے عالم میں

چڑیوں کی خشک چیخوں سے اُبھرتا ہے

یہ زندگی ہے جو دن بدن

لامحدود وسعتوں میں درد کی زنجیر بنتی چلی جاتی ہے

ان درختوں کے درمیان جو جنّت کے لیے اُگے ہیں

ان پانیوں کے درمیان جو صرف اپنی سطح تک مقید ہیں

ان گلّوں اور ریوڑوں کے درمیان جو چراگاہ تک محدود ہیں

ان پتّیوں کے درمیان جو ہَوا کے دوش پر بکھر جائیں گی

زندگی درد کی زنجیر بنتی چلی جاتی ہے

بے تعلّقی کی جلاوطنی

وہ میرے پاس دماغ کی جھلّی چھوڑ گئے ہیں

تاکہ مَیں اپنے آپ کو اکٹھا رکھ سکوں

اور اب پٹیوں میں بندھا، سوچ سے بے حال۔

مَیں سٹریچر پر زندگی اور موت کے درمیان

لیٹا ہُوا ہوں

انھوں نے نازک وریدوں کو ربڑ کے دِل میں گرمایا

مجھے فولادی پھیپھڑے دیے

میرے اندر کسی اور کا خُون جاری کیا

اور یوں مجھے زندگی بخشی۔

مَیں کانوں کے بغیر سُنتا ہوں اور بینائی کے بغیر دیکھتا ہوں

بالکل اسی طرح جیسے کٹے ہُوئے بازو میں بھی

کبھی کبھی نبض چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے

مَیں اپنے اندر، اپنی ہی ایک نشانی کی طرح

زندہ ہوں ۔

میری ساری زندگی

صرف خیال اور یاد ہے

خون کے لاکھوں ذرات ابھی زندہ ہوں

کے سندیسے بھیج رہے ہیں

آرزوؤں کو جگا رہے ہیں

اور وہ حکم دے رہے ہیں

جسے جسم کا کوئی عضو، مان نہیں سکتا ہے ۔

مَیں لوہے کی تاروں اور سوئیوں سے سِلا ہُوا ہوں

سارے وقت میرے اندر بجلی کے جھٹکے

سرایت کرتے رہتے ہیں

اس جگہ کیسی عجیب تجارت فروغ پا رہی ہے ۔

تم ہر طرح کا جتن کر لو

لیکن مجھے کبھی نہ سمجھ سکو گے ۔

تم اس طرح کے عجیب و غریب صفحے جمع کرتے رہو گے

جو اوپر چڑھتی اور نیچے گرتی سیہ لائنوں سے پُر ہوں گے

لیکن تم اس دماغی گراف کے حوالے سے

میرے خیال کی لو کو بھی نہ سمجھ سکو گے ۔

یہ سیہ لکیریں، ان کا کیا مطلب ہے

صرف مَیں بتا سکتا ہوں ۔ لیکن کیسے

جبکہ ہمارے تمھارے درمیان، رابطے کی کوئی شکل نہیں ہے

اور میرا دماغ ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا محسوس ہوتا ہے ۔

وہ لائنیں بے معنی ہیں

ان سے تم اتنا ہی بتا سکتے ہو

کہ مَیں ــــ ابھی زندہ ہوں

ایک ناقابلِ یقین زندہ انسان

جو کہ آدھا مشین ہے اور آدھا زندہ شے کی طرح ہے

یہ کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن تمھیں اسی پر اکتفا کرنا پڑے گا

جب تک کہ تمھیں میری طرف سے کوئی پیغام ملے

تمھیں اک نئی دریافت کی ضرورت ہو گی

جو شین کے بغیر بھی ہمیں ایک دوسرے سے

رابطہ قائم کرنے میں مدد دے گی

خیالات سے خیالات کا رابطہ

اور یوں مَیں

ذہنی وابستگی کی دُنیا میں آزادانہ گھوم سکوں گا

مگر جب تک ، پُراسرار اور گنگ،

مَیں بے تعلقی کی جلاوطنی میں رہوں گا

آواز

تمام رات دُنیا کے ناخن نے

یادوں کے بدرنگ آسمان کو کھُرچا ہے۔

مَیں زمین پر کھڑی ہوں

دُنیا نے مجھے فراموش ماضی کے دیاروں میں چھوڑ دیا ہے

میرا وجود ایک خالی ہتھیار خانے کی طرح ہے۔

مَیں ایک ویران چوٹی پر ایستادہ ہوں

جس کے دامن میں صرف فیکٹریاں چلتی ہیں۔

دیو قامت بھوری بلّیاں

نتھنے پھُلاتی اور اپنے بالوں کو پھڑپھڑاتی

صحن میں گھوم رہی ہیں۔

جبکہ اینٹوں کی لمبی سیاہ اُنگلیاں

اَن دیکھے لبوں کو خاموش رہنے کا حکم دے رہی ہیں ۔

مَیں ایک ویران چوٹی پر ایستادہ ہوں

وادی میں دُودھیا دھند پھیل رہی ہے

پُورا منظر ایک نیگیٹو کی طرح نظر آ رہا ہے

جس میں صرف جھیل سفید نظر آ رہی ہے

اور ساری فیکٹریوں کی چمنیاں دُھند سے مُنہ نکالے

سیاہ نظر آ رہی ہیں ۔

سُرخ جھیل کے کنارے بل کھاتے درخت ہیں

مَیں ابھی یہیں ہوں

سُورج آسمان پر ایسے چکر لگا رہا ہے

جیسے کسی تہ خانے میں ایک ٹارچ !

اور زمین گونجتی ہے

میری آواز سے جو تمھاری آواز کے سہارے

لہر بہ لہر پھیلتی ہے ۔

وقت ، بسترِ استراحت کی جانب پلٹتا ہے

آنکھ ، روشنی کو بلاٹنگ پیپر کی طرح جذب کرتی ہے

مَیں نے آسمان کی بے داغ اور پُراسرار پہنائی میں

آوارہ خرامی کرتے ہوئے کچھ نہیں کھویا

تمام شب ، بیکار اشارے اور پاگل آسمان

میرے ہم رکاب رہے ہیں

اب مجھے اپنی چیخ کے جواب میں ایک چیخ سُنائی دی ہے ۔

ایک بار ، پھر دوبارہ

اِس سناٹے میں تمھارا یہ جواب

محبت کی ایک نشانی ہے ۔

ویرونیکا پورم باکو

میں کچھ نہیں ہوں۔ تم کون ہو

میں لفظوں سے خوفزدہ ہوں
کہ دن انھیں بوسیدہ کر دیتا ہے
میں بغیر لفظوں کے خوفزدہ ہوں
کہ یہ رات کے جبر سے نجات دلا سکتے ہیں
میں آئینوں سے خوفزدہ ہوں
کہ وہاں سوائے میرے عکس کے اور کچھ نہیں ہے
میں بغیر آئینوں کے خوفزدہ ہوں
ڈرتی ہوں کہ کہیں انسانوں کی عادت ہی نہ کھو بیٹھوں
میں سونے سے خوفزدہ ہوں
سانپ دروازے کے باہر میری تاک میں ہے

میں جاگنے سے خوفزدہ ہوں
دروازے سے آگے، خلا، میرے انتظار میں ہے
میں زندہ رہنے سے خوفزدہ ہوں
مجھے اپنے پیروں کے نیچے زمین محسوس نہیں ہوتی ہے
میں مرجانے سے خوفزدہ ہوں
زمین میری چھاتی پر آن گرے گی۔

آج ہم جُدا ہوتے ہیں

اب ہم نہیں گائیں گے ۔ اب ہم نہیں مُسکرائیں گے
آج اِک نئے موسم اور اس کے نئے احساس کی ابتدا ہے
آج ہم جُدا ہوتے ہیں
ایسے جُدا ہوتے ہیں جیسے زمین اور پانی
جُدا ، جُدا ہوتے ہیں
ہماری خامشی کا ہر اظہار بالکل قدرتی ہے
ہم ایک دوسرے سے کہتے ہیں
"یہ اس طرح ہونا چاہیے"
قریب ہی ایک نیلا سایہ
ہمارے ذہنوں کی سچائی اور صداقت کی تائید کرنے کے لیے
بطور شاہد ، موجود ہے
بہت جلد ، تم سمندروں کی نیلاہٹوں جیسی ہو گی
اور مَیں زمین کے سارے گناہوں کے ساتھ
زمین جیسا !
بڑے بڑے پرندے تمھیں آسمانوں میں تلاش کریں گے
اپنی چونچوں میں، وہ تمھارے لیے خوراک اور خوشبوئیں بھر بھر لائیں گے
لوگ سوچیں گے
ہم دشمن ہیں
ہمارے درمیان دُنیا ٹھہر جائے گی ،
صدیوں پُرانے جنگل کی طرح
جس میں دھاری دار فر والے خونخوار جانور رہتے ہیں ۔
کسی کو نہیں معلوم ہوگا کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں ۔
ہر شام میری رُوح
پانی کے بہاؤ سے کٹے ساحل کی طرح
تمھارے جسم میں متشکل ہو جاتی ہے
آج ہم نہ ایک دوسرے کو چومتے ہیں

نہ ایک دوسرے کے لیے فکرمند ہوتے ہیں
ہم تو ایک دوسرے کی خواہش بھی نہیں کرتے ہیں
اِک نئے موسم اور اس کے احساس کی ابتدا ہے
آج ہم جُدا ہوتے ہیں
ایسے جُدا ہوتے ہیں
ایسے جُدا ہوتے ہیں، جیسے زمین اور پانی جُدا، جُدا ہوتے ہیں
تم بہت جلد، آسمان کا ایک عکس بن جاؤ گی
مَیں کالا سُورج اور زمین بنوں گا
جلد ہی ہَوا اُٹھے گی
ہَوا بہت جلد اُٹھے گی!

سیلف پورٹریٹ

مَیں کتنی ہی کوشش کیوں نہ کروں
مَیں ہمیشہ وہی رہوں گی جو کہ مَیں ہُوں۔
مَیں اپنے چہرے کو کبھی گول نہیں بنا سکوں گی
مَیں اپنی آنکھوں کو بادام جیسا
اور اپنی ناک کو تیکھا نہ بنا سکوں گی۔
مَیں کتنی ہی کوشش کیوں نہ کروں
مَیں اپنی کھوپڑی کی شکل بدل نہیں سکوں گی
کیونکہ یہی عجیب وغریب حُلیہ اور تکون چہرہ
جو کہ کبھی کبھی میٹھی ڈبل روٹی کی طرح محسوس ہوتا ہے
اور کبھی قزاقی کشتی کے اگلے سرے جیسا

یہی میرا مقدر ہے۔

یہ میرے لمبے بال ہمیشہ یونہی

دھوئیں کے رنگ کی طرح رہیں گے۔

یہ میرا مقدر ہے کہ میں دن رات

مسلسل اسی حلیے کو برقرار رکھوں۔

جب میری بدہیئتی کی تصویر دیواروں پر واضح ہو جائے

تو میں اپنے اردگرد موجود لوگوں کی بصارت کو زخمی کر دوں۔

میرا رشتہ کس سے ہے

مرے والدین، ننھیال ددھیال

سب نے مجھ سے ناطہ توڑ لیا ہے

اور یوں لگتا ہے کہ کالی بھوری

پیلی اور سُرخ، سب نسلوں نے

وقتی طور پہ اس مسئلے پر ایکا کر لیا ہے۔

کوئی بھی جاندار

مجھے اپنے سے متعلق کہنے اور پہچاننے سے منکر ہے

جب میں خود کو زخمی کر کے روتی ہوں

جب یخ بستگی میری رگوں کو بھی چھلنی کر دیتی ہے

جب وقت میرے اوپر اک گہرے زخم کا نشان چھوڑ جاتا ہے

تو وہ کہتے ہیں "خوبصورت"

لیکن میں کہتی ہوں "آدم زاد"

تمھارے لیے

تمھارے پاس ہر چیز کے لیے وقت ہے
تم اَن تھک اور بے پناہ ہو
تم سخت سے سخت کام آرام سے کر لیتی ہو
خوشی اور افسردگی میں
روز و شب، تم ہمیشہ میرے پاس ہو
سوتے ہوئے، خوابوں میں
ہجوم میں۔ تنہا،
تمھارے پاس ہر چیز کے لیے وقت ہے
کھڑے ہو کر میرے بالوں میں کنگھی کرنے کا
کتابوں کے ضخیم انبار میں غوطہ زن ہو کر
مضمون، نظمیں اور نوٹس بنانے کا
امتحانوں کے پرچے دیکھنے، پڑھنے،
لیبارٹری میں کام کرنے کا
سینکڑوں موجود بچوں میں ہر بچے پر توجہ دینے کا،
جن کی خود نوشت سرگزشتوں کا
ایک صفحہ، ہر روز تم ہی تو تحریر کرتی ہو۔
کتابوں سے پُر کتابوں کی شیلفوں کے ساتھ
ہماری چھوٹی بیٹی
خواب آلود آنکھوں سے
تم سے سنو وائٹ اور سات مہربان بونوں کی کہانی سن رہی ہے۔
تمھارے پاس ہر چیز کے لیے وقت ہے
جب اپنے فارمولوں کے ساتھ
اپنے اگلے ہفتے کے آنے والے اسباق کی
اَن تھک اور بے پناہ تیاری کر رہی ہوتی ہو
تو یہی زندگی کی اصل روح لگتی ہے۔
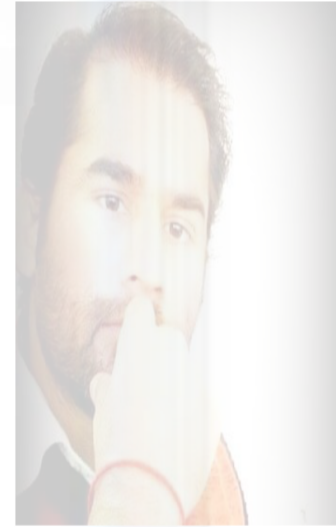
تلوار اور پھول

جب میرا بچہ پیدا ہو گا
تو بہت جلد
سرسبز میدانوں اور لمبے تنے کے درختوں کو جان لے گا
وہ اپنے ہاتھ شبنم سے بھیگی ہوئی
گھاس کی پتی کی جانب بڑھائے گا
وہ شیشے کے ذریعے دروازے کے اندر
جھانکتی ہوئی روشنی کی شعاعوں کو
پکڑنے کی کوشش کرے گا
اپنے تلووں کے نیچے مٹی کی گرمی
محسوس کر کے وہ بستر سے زیادہ سکون
اور گرمی پائے گا
وہ اس ملک کی مٹی سے پیار کرے گا
سورج، نرگس اور ان کے گیتوں سے پیار کرے گا
وہ سیاروں کے بلاوے کو محسوس کرے گا
اور اسے پر ملیں گے جن کی قوت سے وہ بادام سے بڑے
ستاروں کی جانب بھی مائل پرواز ہو گا جو بہت قدیم ہوں گے
مگر قریوں کے وجود کے بعد کے دور سے متعلق ہوں گے
وہ ان افقوں اور ان منتہاؤں کی جانب
مائل پرواز ہو گا جہاں خیالات تلوار کی طرح تھے مگر اب وہی خیالات
پھولوں کی طرح لہک رہے ہیں۔

افاقہ

دیکھو مَیں واپس آگیا ہوں

اب ہم ایک دوسرے کو پیار کریں گے

اب ہم ایسے زندگی گزاریں گے

جیسے پہاڑ، برف کے نیچے

اور سنہری لہریں، اگست کے جلتے موسم میں۔

اب مَیں خوش ہوں کہ مجھے

دل کا بہت خیال نہیں رکھنا پڑتا ہے

اب یہ پہلے کی طرح حسبِ معمول کام کر رہا ہے

یہ مجھے کوئی تکلیف نہیں دیتا ہے

اب یہ پہلے کی طرح، خون جمع کرتا ہے

پھر اسے سارے بدن میں پھینک دیتا ہے

اور یوں، دماغ اور انگلیوں کو زندگی دیتا ہے

مَیں اب خوف اور موت کی دسترس سے باہر ہوں

اس برف پر، میرے پاس ایک پنسل ہے

جس سے مَیں اپنی نوٹ بُک کے صفحات لکھوں گا

جنگل میں اِک بھوری چڑیا گا رہی ہے

مگر یہاں کوئی اور خوبصورت اداس چڑیا نہیں ہے

جو لمبے تنے کے درختوں سے، اس کو جواب دے سکے۔

کیونکہ اتنا بھاری بوجھ لے کر وہ چل نہیں سکتا ہے۔
بُری خبر اور بے عزّتی کی طرح
یہ سوال بار بار ذہن سے ٹکراتا ہے

سنو۔ سنو۔ سنو
مگر ہم نہیں، کبھی بھی ہم نہیں۔۔۔

مگر ہم نہیں

ہم میں سے کچھ لوگ اپنی غلطیوں، مکر اور خوف پر غالب آ گئے ہیں
مگر ابھی بھی افق پر لٹکے ہوئے نخلستان تک پہنچنے کے لیے
کافی طویل مسافت طے کرنی باقی ہے
سوکھی ہوئی نسلیں بالکل ہی سُوکھ جایا کرتی ہیں
نوجوان نسل ستاروں کو دیکھ کر ہنسا کرتی ہے۔
ان بدلتے ہُوئے راستوں پر
وہ کون پہلا شخص ہوگا
جو کامیابی کے خوابوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دے گا۔
ہم میں سے کون ہمارے جسم کے مُردہ ہونے سے پہلے ہی مر جائے گا۔
ہم میں سے کون اپنا دل ریت میں گرا دے گا۔

نیچیتا ستیفنکیو

دوسرا نوحہ

ہر کھلی جگہ پر ایک خُدا موجود تھا
اگر کسی پتھر میں کہیں دراڑ سے جگہ پیدا ہو گئی
وہ بھاگے اور ایک خُدا اس میں بٹھا دیا
اگر کوئی پُل گرا تو یہ حادثہ۔ خُدا کے نزول کے لیے کافی تھا
جہاں کہیں سڑک میں دراڑ پڑی
تو خُدا کا ظہور اور وجود، اِک لازمہ تھا
محتاط رہو، اپنے ہاتھ اور اپنی ٹانگیں
جان بُوجھ کر یا غلطی سے زخمی نہ کر لینا
ورنہ وہ تمہارے زخم میں بھی اک خدا لا بٹھائیں گے
جیسا کہ اُنھوں نے ہر جگہ کیا

وہ اِک خُدا بٹھا دیتے ہیں
اور ہمیں اس خُدا کی عبادت کی ترغیب دیتے ہیں
کیونکہ ان کے خیال میں وہ خُدا
ان تمام چیزوں کی حفاظت کرتا ہے جو ٹوٹ کر بکھرنے والی ہوتی ہیں۔
سپاہی! اس کی نگرانی کرو
پلک بھی جھپکنے نہ پائے
ورنہ یہ لوگ اک خدا لاکر، بندوق کی نالی پر بٹھا دیں گے
اور وہ وہاں جم کر بیٹھ جائے گا
ہم اس کی تعریف و توصیف میں بے خود ہوں گے
اور آخر
ہم اپنی روح و بدن اس کی حمد و ثنا میں خاک کر دیں گے۔

وراثت

کھڑکی سے باہر جھانکنا
ہم سب کی عادت بن چکی ہے
ہر شخص کھڑکی سے باہر جھانکتا ہے
پڑھتے ہوئے، نہاتے ہوئے، پیار کرتے اور مرتے ہوئے۔
ہر عالم میں
ہم افتاں و خیزاں، کھڑکی سے
باہر کا نظارہ دیکھنے کو بے تاب ہوتے ہیں۔
تم آخر کیا دیکھنے کے تمنائی ہو
تم بھلا کس کو ڈھونڈھ رہے ہو
بھول جاؤ
جو آچکا ہے۔ وہ آچکا ہے
جو جا چکا ہے
وہ بس۔ جا چکا ہے
جو کچھ تمھارے ساتھ ہونا تھا
وہ سب کچھ ہو چکا ہے
پردے کھول دو
کھڑکیاں بند کر دو
اور آرام کرو
بارش۔ دھوپ، جنگ، امن
گویا ہر ابتلا اور آسائش
بار، بار دیکھ لینے کے بعد
تم نے محسوس کیا
کہ ہر غم اور ہر خوشی، بغیر کسی تبدیلی کے
ایک وقت کے بعد دوسری مرتبہ
اپنے آپ کو یونہی دہرائے جا رہی ہے
انسانیت

دراصل کچھ اور دیکھنا چاہتی ہے
مگر جو کچھ ہے، اسے دیکھنے کے لیے
بے نور آنکھوں کے ساتھ، کھڑکی میں
ایستادہ ہے

اس لمحے

یہ وہ لمحہ ہے جبکہ وحشی درندوں کا پیار
اپنے سے چھوٹوں کے لیے ظہور پذیر ہوتا ہے
عورتوں کو بچوں کی پیدائش کے مرحلے میں
مر ہی جانا چاہیے
تبھی دُنیا میں، ہر چیز خوبصورت ہوگی
عورتوں کے کُولھے، جب دردِ زہ کے عالم میں پھیلیں گے
تو اسی کے درمیان سے دُنیا کا امن اُبھرے گا
بھاری چھاتیوں کے درمیان، سانپ پھسل پھسل کر
ان پر پھیلی ہوئی گرد اور مٹی کو نرمی سے صاف کریں گے
پھل اس زمین کی گہرائیوں میں اُگیں گے

جو دُودھ کے گرنے سے خمیر شدہ ہو۔

ہر چیز بہت خوبصورت ہو گی

مریم نما، باوقار عورتیں

دوسرے اجزا سے ملنے کے لیے

نیچے کی جانب، مُسکراتی ہوئی جائیں گی۔

مگر یوں ہوتا نہیں ہے

عورتیں بچوں کی پیدائش میں

اس طرح نہیں مرتی ہیں

جس طرح ہیملیٹ نے، بادشاہ کو عبادت کے دوران

اس خوف سے نہیں مارا تھا

کہ وہ بادشاہ جو عبادت کے دوران مارا جائے

جنّت میں داخل نہیں ہو سکتا ہے

بلغاریہ کے شاعر

لیوڈل سٹونیوف :

پیدائش ۱۸۸۶ء ، وفات ۱۹۷۳ء

شاعری، ڈرامہ، تنقید، ترجمہ، ہر صنفِ سخن میں بہترین تخلیقات پیش کیں۔ ان کی تخلیقات جدید بلغارین ادب میں کلاسیکی حیثیت رکھتی ہے۔

نکولا فورناڈجیو :

پیدائش ۱۹۰۳ء ، وفات ۱۹۶۸ء

الیگزینڈر گروف :

پیدائش ۱۹۱۹ء ، ابھی حیات ہیں۔

جدید بلغارین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔

بلاڈا ڈمٹروف :

پیدائش ۱۹۲۲ء ، ابھی حیات ہیں۔

راڈیو رالن :

پیدائش ۱۹۲۳ء ، ابھی حیات ہیں۔

لیانا دسکالووا :

پیدائش ۱۹۲۷ء

پوروان سٹیفانوف :

پیدائش ۱۹۳۱ء ، حیات ہیں

ولاڈیمیر باشو :

پیدائش ۱۹۳۵ء ، وفات ۱۹۶۷ء

پینیو پینوف :

پیدائش ۱۹۳۰ء ، وفات ۱۹۵۹ء

لیوڈمل سٹونیون

پہلی مُلاقات

جوانی میں، مَیں آزادانہ، دُور دُور تک گھومتا ہُوں
ایک دن، صُبح، مَوت نے مجھے پکڑ لیا۔
ایک خنجرِ بُرّاں اس کے کندھے پر لٹک رہا تھا۔
مگر اس دن مَوت نے بھی مجھے، بس ایک نظر دیکھا۔
اے تیغ بکف! کیا تم مجھے ساتھ نہیں لے جاؤ گی
تم بھی تو ساری رات شکار کی تلاش میں سرگرداں رہی ہو گی۔
مگر آنکھوں میں یخ آلود تمسخر لیے
بے اعتنائی سے مُڑ کے دیکھے بغیر
وہ چُپ چاپ گزر گئی
وہ اس وقت میرے پاس سے لے کر بھی کیا جا سکتی تھی۔

میرے پاس نہ کوئی دولت تھی اور نہ مادی خزینہ
جس کے لُٹ جانے پہ مَیں ماتم کناں ہوتا۔
خزانے تو میرے مستقبل میں پنہاں ہیں
اور اس خزانے پر کسی انسان کا بس نہیں چلتا ہے

اس لیے موت کو مجھ میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی
اور وہ آگے چلی گئی
اپنے چند ہم عصروں کی طرح
مجھے جنگ، شہرت اور طاقت میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی
مَیں نے موت کا تمسخر اُڑایا
اور موت سانس کی طرح ہَوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئی
بہت سال بیت گئے
میرے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں
اور مَیں لفظوں کے انبار جمع کر چکا ہوں۔
مگر کیا ان دولتوں کو چھین لینے کی
موت کوشش کرے گی، اگر وہ پھر میرے پاس سے گزرے

جس طرح کُتّے کو پرے رکھنے کے لیے گوشت پھینک دیا جاتا ہے
مَیں آج موت کے سامنے کیا پھینکوں
جو نقصان مجھے بے تحاشا تکلیف کے ساتھ برداشت کرنا پڑے گا
وہ میرا ماضی ہوگا۔ جو پھر کبھی بھی واپس نہیں آسکتا ہے۔

ہم اکٹھے ہیں

خوشی ہو یا غم، ہم دونوں اکٹھے رہے ہیں
خوشی — بہت جلد بیت جاتی ہے
مگر مجھے معلوم ہے کہ زندگی میں تم نے کس قدر محرومی محسوس کی ہے
جب گہرے غم نے ہماری زندگی میں جگہ پائی ہے
بے پناہ مصائب کے ان برسوں میں
تم نے زندگی کی کشتی رواں رکھنے کے لیے ہمیشہ حوصلے سے کام لیا ہے۔
تم نے میری جدوجہد کو سراہا
اور میرے خوابوں کو اپنی زندگی سمجھا
غم واندوہ کا یہ زمانہ کتنا شدید تھا۔
اور جب صدمات پہاڑ بن کر گرے
اور تمام راستے مسدود ہو گئے
اس وقت مجھے لازوال طاقت کی ضرورت تھی
تمھارا بے پناہ شکریہ کہ تمھاری رفاقت ہی میری لازوال قوت تھی۔
سورج بہرحال ڈوب جاتا ہے
اور ہمیں معلوم ہے کہ سورج ہمارے لیے نہیں رکے گا۔
ہم زندگی کے تمام مدوجزر سے واقف ہیں
ہم نے اُمید اور آلام کے ذائقوں کو بھی چکھا ہے۔
اب ہرچند زندگی کی کشتی کنارے کی جانب آرہی ہے
دو شفاف چشمے ساتھ ساتھ مگر اپنے اپنے مقام پر رواں ہیں
اب ہماری منزلیں ایک دوسرے میں تحلیل ہو رہی ہیں
مَیں تمھارے ساتھ ہوں۔
اندوہناک دنوں کو مت یاد کرو۔

آنے والی موت کا نوحہ بنی ہوئی تھی

ہماری زندگیاں بھی یونہی ختم ہو جاتی ہیں
ہم بھی یونہی تنہا رہ جاتے ہیں
مگر ہمارے پاس اُڑنے کے لیے پَر نہیں ہوتے ہیں۔
ہم درد کی شدت سے مضطرب زندہ رہنے پر مجبور ہیں

کبُوتر

سب سے خوبصُورت کبُوتری
آج صُبح صُبح مر گئی۔
مَیں نے اس کے ٹھنڈے اور مُردار جسم کو اُٹھایا
اور یخ زمین میں دبا دیا۔
کبُوتر تنہا ہو کر
بادلوں سے اُوپر، دوسرے کبوتروں کے ساتھ اُڑنے لگا۔
صُبح کی روشنی میں اس کے پَر گرتی پتیوں کی طرح کی آواز پیدا کر رہے تھے۔
اور پھر وہ سب سے الگ، سب سے جُدا تھا
اُس کا غم شدید اور بے پناہ تھا۔
اس کی غمناک آواز

بلاڈاؤمٹروف

تن تنہا سفر کرتی عورت

یہ ایک جان جوکھم مسئلہ ہے

ایک بے چینی ہے۔

اس دُنیا میں۔ جو آج بھی مرد کی دُنیا ہے۔

تمھارے کام کے بدلے

بدتمیز اور بے ہودہ جملوں کی کمین گاہیں

تمھاری منتظر ہوں گی۔

گلیوں، سڑکوں اور بھرے پڑے چوراہوں میں

بُری نظریں گھورتی اور کنکھیوں سے دیکھتی آنکھیں

تمھارے اردگرد ہوں گی۔

ایک تنہا سفر کرتی عورت

تمھاری ساری خود حفاظتی

تمھارا تنہا پن ہے۔

تم آج تک کسی مرد کو

ایک مضبوط سہارا جس پر تم جھک سکو

ایک مضبوط تنا، جس کے سہارے تم آرام کر سکو

ایک دیوار جس کے سائے میں تم رہ سکو

نہ بنا سکی ہو۔

تم نے ایک مرد کو بھی

راہِ منزل یا جستِ منزل نہیں سمجھا ہے۔

تم نے تن تنہا سفر کا آغاز کیا

تاکہ مرد کو برابر کی سطح پر ملو

اور یوں صحیح اور سچے پیار کی بنا پڑے۔

تمھیں نہیں معلوم کہ تم آگے جا بھی سکو گی

یا تم آدھے راستے میں مٹی میں دھنس جاؤ گی

یا پھر سورج کی تیز شعاعوں سے تمھاری آنکھیں چُندھیا جائیں گی

تمھیں ان سب باتوں کا اندازہ نہیں

مگر تم سرکش ہو۔

کیونکہ اگر وہ تمہیں آدھے راستے ہی ناکام بنانے کی بھی کوشش کریں

تمہارا جرأت مندانہ آغازِ سفر

اس بات کی دلیل ہے کہ تم کہیں نہ کہیں ضرور پہنچو گی۔

سڑک پر ایک تنہا خاتون

تم آگے ہی آگے بڑھتی رہو۔

تم مت رُکو۔

کوئی مرد ایسا تنہا نہیں ہوگا

جیسا کہ سفر کرتی ہوئی تنہا عورت۔

تمہارے سامنے تاریکی

سات تالوں والا دروازہ کھڑا کر دیتی ہے۔

ایک عورت تنہا سفر کا آغاز

رات کو نہیں کرتی ہے۔

اور ایک گھمانے والی چابی کی طرح

درخشاں سورج

صبح کے وقت سارے دروازوں کے تالے کھول دیتا ہے

مگر تم اندھیرے میں بھی

چھپتے چھپاتے نہیں، آزادی کے ساتھ چلو۔

تمہارا ہر قدم اعتماد اور یقین کی علامت بن کر اُٹھے۔

اور اس مبہم مرد کو جھٹلا دے

جس نے تمہیں اکثر خوفزدہ کیا ہے

فرش پر تمہارے قدموں کی آواز کی گونج پھیلتی ہے

ایک تنہا سفر کرتی عورت

سب سے نرم مگر سب سے باعزم قدم

ہماری اس ملائم سرزمین پر

جو بذاتِ خود

اس شاہراہ پر ایک تنہا عورت کی طرح ہے۔

اڈیورالن

بیٹی

میری ماں

(مجھے یقین ہے کہ آپ نے اسے کبھی نہیں دیکھا)

بہت بدصورت عورت ہے۔

یہ بھی تو حقیقت کو کم کر کے بتانے والی بات ہے

ورنہ حقیقت میں تو وہ ہیبتناک ہے۔

جس دن وہ پیدا ہوئی

ایک کوہان نے اس کے جسم کو دبوچ لیا

اور ایسے مروڑا کہ جب وہ بڑی ہوئی

تو نہ سیدھی تھی اور نہ نازک

اس کا کوئی بچپن نہ تھا

اس کے ساتھ بچے نہیں کھیلتے تھے

اور اس کی ماں ملامت کرتے ہوئے کہتی

کاش تم پیدا ہی نہ ہوتیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا

کہ جب وہ بڑی ہوئی ہوگی

تو کیا لگتی ہوگی

بھینگی آنکھوں اور تشنج زدہ بوکھلائی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ

کونسی لڑکی اپنی جوانی تباہ کرنے کے لیے

اس کا ساتھ گوارا کرتی ہوگی

شاید اسی لیے میری ماں کبھی محفل میں دکھائی نہیں دی

مگر اس سرزمین پر میرا باپ کہاں سے آگیا

اس بدذوق اور فضول آدمی کو

میری ماں کی آخر کونسی چیز پسند آئی

اسے آخر کس ادا نے مسحور کیا
اس کے پاس نہ تو جہیز تھا، نہ سونا اور نہ گھر بار۔

کیا یہ محبت تھی
تو کیا ہمدردی تھی
بہر حال مہربانی کا عنصر ضرور غالب تھا
ورنہ مَیں، یوں مسکراتی، صحیح سالم اور نرم و نازک
پیدا نہ ہوتی۔

ہر شخص یہ کہتا ہے کہ مَیں
سارے علاقے میں سب سے خوبصورت لڑکی ہوں
یہ ممکن ہے داستان طرازی ہو
مگر یہ حقیقت ہے کہ مَیں خوبصورت ہوں

میری ماں، میرے ساتھ
ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے

باہر سیر کو نکلنا
پسند کرتی ہے
اور جو بھی راستے میں ملے
اسے سلام کرنا
پسند کرتی ہے۔

لیانا وسکالووا

قرمزی رنگ میں ایک نظم

قرمزی رنگ
میرا پسندیدہ رنگ ہے
میرا کوٹ بھی قرمزی ہے
اور میرا لباس بھی

جب تم مجھے گلے لگاؤ
ذرا سلیقے سے لگانا
کیونکہ تم ایک پھولدار شاخ گلے لگاؤ گے

تمھاری محتاط نگہداشت سے

میرا دل کانپ کانپ اُٹھتا ہے
جیسے کہ ایک پھول کی پتی
میرے لباس کے نیچے کانپ اُٹھے
اور یہ دل نما پتی
اُڑ کے کہیں گر بھی سکتی ہے
اگر کسی پُر آشوب دن
کوئی طوفان آئے تو ،

میرے ہمدم یہ نہ بھولنا
کہ یہ پھولدار شاخ
نہ تو پھولوں کی ہے
اور نہ درخت کی ہے ۔

یہ تو پھول کی طرح نازک ہے
اور درخت کی طرح پُرغرور
اگر شاعروں کے سر پہ تاج ہو

تو یہ میرے سر کا تاج ہو گی۔

کیا تمھیں میرے عشق کا اندازہ ہے
کہ مجھے قرمزی رنگ کیوں پسند ہے
میرے کوٹ کا رنگ
اور میرے لباس کا رنگ قرمزی کیوں ہے،

کیونکہ قرمزی رنگ
سُرخ اور نیلا رنگ مل کر بنتا ہے
یہ انقلاب اور امن کے رنگ ہیں۔

سوالات

باپو! یہ چڑیاں ننگے پاؤں کیوں پھرتی ہیں
باپو! یہ درخت ہوا کو کیوں چلاتے ہیں
کیوں۔کیوں۔کیوں
تم مجھے کیوں پریشان کرتی ہو
کیا تم اچھی بچّی نہیں بن سکتی ہو
مگر نہیں۔یوں نہیں۔
کیا مَیں اپنی بچّی کو بھی
بدقسمتی کی بشارت دے رہا ہوں،
میری بچّی مجھے معاف کر دو
مَیں ــــ ہاں بس مجھے معاف کر دو

اب تم اپنے سوال دُہراؤ

اور دوسرے ذہنوں کو تکلیف دو۔

لیکن کل تم سوالوں کی صلیب پہ

خود ٹنگی ہوئی ہوگی

اور تم پھر اس وقت کو بہت مشکل

ناخوشگوار اور ناقابلِ برداشت

تصوّر کروگی

مَیں تمھیں اس وقت سے بچانا چاہتا تھا۔

یہی سبق تھا جو ہمارے اجداد نے ہمیں دیا

انھوں نے ہماری گوشمالی کی اور زباں بندی کی

حتّٰی کہ ہم ان کی دانش کی بنیاد کو سمجھنے لگے۔

جب ہم نے سوالات کرنے بند کر دیے

تو ہمارے بزرگوں نے سکون کا سانس لیا

لیکن مَیں تمھارے لیے اس نصیب کی تمنّا نہیں کر سکتا ہوں

پوچھو تم اپنے سوالات ضرور پُوچھو

بہت اچھی بچی مت ہو

ہر ایک سے پوچھو

چڑیوں سے پوچھو

اپنے خوابوں سے پوچھو

اپنی ہتھیلی پہ کھیلتے ریشم کے کیڑوں سے پوچھو

سوالوں کی یہ جوالا

اللہ نہ کرے کہ تمھارے ہونٹوں پہ خاکستر ہو جائے۔
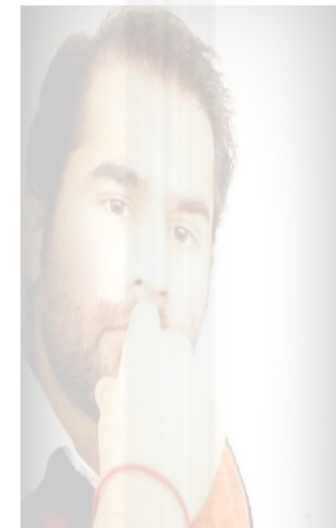
سایہ

اگر ہمیں دُنیا کو کچھ نہیں دینا
تو پھر ہم کیوں پیدا ہُوئے تھے ۔
ہمیں وہ عزّت نہیں چاہیے
جو بڑے آدمیوں کے ناموں کو سجاتی ہے ۔
ہمیں تو عورتوں کا وہ ذہنِ رسا چاہیے
جو دھاگے اور موتیوں کے ملاپ سے
ہماری زمین کا حُسن نکھارتی ہیں ۔
ہمیں تو ان ہاتھوں کا رُوپ چاہیے
جو لکڑی کے سخت اور بے جان ٹکڑوں کو زندگی دیتے ہیں ۔
ہمیں وہ شان و شوکت نہیں چاہیے

جو بڑے آدمیوں کا حصّہ تھی
ایک نسل کا تشکّر ہمارے لیے کافی ہے ۔
ہمیں کو لیو فچے جیسے معمار کی ضرورت ہے
جس کے خاموشش اور بے جان پتھر
ہمارے دلوں کو خوشی سے بھر دیتے تھے
ہمیں ناسٹر بینول کے ان پروں کی ضرورت ہے
جو آواز سے بھی تیز اُڑنے کی سکت رکھتے تھے ۔
اور جو بلقان پہ اُڑنے والے
عقابوں سے بھی زیادہ حوصلہ مند ہوں ۔
ایک نسل کا تشکّر ہمارے لیے کافی ہے
اسی لیے ہم اپنے ایک عظیم خواب کو
تخلیق کا رُوپ دینا چاہتے ہیں
گندم کے کھیت پہ برستے پانی کی طرح بنو
تازہ اور لذیذ روٹی کے ٹکڑے کی طرح بنو
جو گرفتارِ بلا ہیں ، انھیں ہم درد سے چھڑانا چاہتے ہیں
بنجر زمینوں کو قابلِ کاشت بناؤ

سب جراثیم کو مار ڈالو
اور ننھے سے ایٹم سے
لاکھوں کروڑوں روشنیاں منقش کر دو۔
آؤ عظیم خواب کو تخلیق کا رُوپ دیں
اور پھر جب ہم مریں
تو پھر ہمیں زمین میں بڑے آدمیوں
کے ساتھ ، دفن ہونے کا حق حاصل ہو گا

پینیو پینوف

(طویل نظم کا ایک حصہ)

آزمائش کے دِن

اس مصیبت میں میرا دل دُکھ رہا ہے ۔
میرا دل گئے زمانوں کی غلطیوں اور پاداشوں سے آگاہ ہے
اور اب خزاں کی پہلی یورش کی یخ بستگی
میرے بالوں میں سفیدی کا زخم آویزاں کر گئی ہے ۔

گزشتہ شب کی خمریات کا تلخ ذائقہ ابھی تک
میرے ہونٹوں پر ہے
یہ ذائقہ چپکا رہتا ہے کہ گزر جاتا ہے
میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں
وقت تیزی سے گزر جاتا ہے

ہم تو اس کی رسّی سے بندھے ہیں
ہر تازہ زخم پر جلد ہی کھرنڈ کی تہ جم جاتی ہے

مگر مجھے ایک بات معلوم ہے
ہر زخم اپنا نشاں ضرور چھوڑتا ہے
میرے شعور کی دیوار اور بلند ہو گئی ہے
میرے اندر دو زمانے مدِّمقابل ہیں
اور میرے اندر ہی ان دونوں زمانوں کی رستخیز جاری ہے
کیا مَیں ہی صرف وہ بے قرار طوفان تھا جو تھما نہ تھا
کیا مَیں ہی صرف وہ بے چین شخص تھا جو بجلی کی چمک سے متحیّر تھا۔

پھر بھی مَیں یہ کہوں گا کہ مَیں اکیلا فرد تھا۔
جس کے دل میں سوال وحشی ہرنوں کی طرح چوکڑیاں بھر رہے تھے

میرے اوسان گھڑی کی سوئیوں اور شب و روز کے چکر سے بندھے ہیں۔
سب کی ذمّہ داری کا فرض، میرے کندھوں پر ہے

مَیں نے خود ہی اپنی ذمّہ داریوں کی گٹھڑیوں کو بڑھایا ہے
آج ہر مصرعہ جو مَیں لکھتا ہوں
ایک سخت سلاخ کی طرح میرے اندر نوکیلے زخم بناجاتا ہے
میرے خیالات پہرہ داری کرتے ہیں
کہ تم اپنے [illegible] کی کس منزل پہ ایستادہ ہو!
میرے اوپر ایک سخت اور بیدرد زمانہ حاوی ہے
اس زمانے نے میری کوکھ میں گھر کر لیا ہے
اس زمانے نے میرے ماتھے پہ پنجے گاڑ دیے ہیں
میرے اردگرد ظالم لمحوں کی طنابیں کھینچ دی ہیں
ہنگامی لمحوں، اُبلتے سوالوں اور تشنج کر گرہیں،
گرہیں ہی گرہیں، موجود ہیں۔
میرے ماتھے کے پیچھے متضاد ہوائیں
کہ جن کو شکوک نے جنم دیا ہے، متصادم ہیں
وہ خوف زدہ ہو کر چیختی ہیں
اور میری گھسی پٹی مصروفیات کے انبار کو اٹھا کر پھینک دیتی ہیں
وہ چیختے چنگھاڑتے طوفانوں کو بھی بغاوت پر آمادہ کرتی ہیں

اور یوں گھرے سیہ بادل بارش بن کر برستے ہیں

اور میرے مندر پر بجلی بن کر چمکتے ہیں۔

ژالہ بار طوفان میری روح کے اندر اترتا جاتا ہے

میرے اکڑے ہوئے اعصاب پر تنے اطوار ستار کی تار کی طرح تنے ہوئے ہیں

اور بجلی میرے دماغ میں چُبھتی جاتی ہے۔

بھاڑ میں جائے یہ انا کا تماشہ

یہ شور و غل اور تصنعات

مَیں اس دُنیا میں تعیشات اور رنگ رلیوں کے لیے نہیں آیا۔

وقت کا فولادی پہیا چلتا چلا جا رہا ہے

میں دن کے گھسے ہُوئے سخت پتھروں کو توڑتا ہوں

میرے شعور کے نئے نظام کی طنابیں کمزور پڑتی جا رہی ہیں

لالچ کے افیمی دروازے میرے لیے نہیں ہیں۔

اس وقت جب کہ انسانیت فریاد کناں ہیں

اور مصیبت کے ان دنوں میں ہاتھوں نے ڈائنا مائٹ پکڑے ہوئے ہیں

مَیں اس دُنیا میں

سُورج کو دیکھنے، خوشی کے اشعار کو چُھونے اور خوشگوار ماضی بنانے کے لیے آیا تھا۔

میری انتہا کی نظم

ذرا آزاد روی سے، نظم معریٰ کی شکل میں لکھی گئی ہے۔

تم، زمانہ ـــــ تم اور مَیں

ہمارے سُر نہیں ملتے

مگر پھر بھی ایک سُر مشترک ہے

جس کا لُطف ہم سب اُٹھاتے ہیں۔

ہم کافی مُدت سے کشتی لڑ رہے ہیں

کافی مُدت سے مَیں یہ قمیض پہنے ہُوئے ہوں

میری جانفشانی کے نمکیں پسینوں میں بھیگی ہوئی یہ قمیض

دھوپ اور کہر کے تواتر سے اب مٹیالی سی ہو گئی ہے۔

مَیں دراز بازوؤں اور کھُلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مروں گا

اور مُوت کے بعد

سفیدیِ صُبح کی جانب پلٹ کر

میری آنکھیں دیکھیں گی

دیکھتی رہیں گی حتیٰ کہ ،

میری روح بھی بیدار ہو جائے گی
اور پھر پہاڑی کی سمت سیدھی شاہراہ پر گامزن ہو گی۔
لاکھوں کروڑوں لوگوں کی آخری منزل
تمام مزاحمتوں کے کھنڈر کے اوپر سے گزر جائے گی۔
میں پھر آگے آگے طبل بجانے والا بنوں گا
اپنے ملک کے آگے بڑھتے ہوئے قافلے کا پیش رو بنوں گا
کیونکہ میں تو عصر کے شعور کا نمائندہ ہوں

چین کے شاعر

ماؤزے تنگ:

سوشلسٹ انقلاب کا سب سے بڑا رہنما ماؤزے تنگ جب شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے تو اس کی کلاسیکی روایت میں اختراعات کی صلاحیت اور بھی واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

ماؤزے تنگ کی کُل ۲۴ نظمیں رونگ ین نے انگریزی میں ترجمہ کی ہیں۔ اسی انگریزی ترجمے کو اُردو تراجم کے لیے بطور اصل سامنے رکھا گیا ہے۔

لوسون:
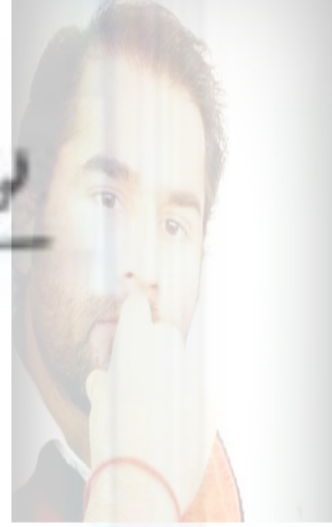
لوسون نے کُل ۲۳ نثری نظمیں لکھیں۔ یہ نظمیں ۱۹۲۴ء سے لے کر ۱۹۲۶ء کے دوران لکھی گئیں۔ یہ سب نظمیں ایک مجموعے میں مرتب کی گئیں جس کا نام "خود رو گھاس" رکھا گیا۔ یہ نظم بھی اسی مجموعے میں سے لی گئی ہے۔

کوموجو:

۱۸۹۲ء میں پیدا ہُوا۔ آج کل بھی چین کے مشہور اور منفرد شعراء میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس کا پہلا مجموعہ ۱۹۲۲ء میں شائع ہُوا

اور بہت مقبول ہُوا۔ مگر بعد میں اس قسم کے اشعار باقاعدگی اور پختگی کے ساتھ سامنے نہیں آئے۔ اس کا شمار چین کے زمانۂ جدوجہد اور مزدور راج کے شعرا میں ہوتا ہے۔

فنگ چی :

شمالی صوبے ہوپی کا رہنے والا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں پیدا۔ پیکنگ یونیورسٹی سے بی۔اے پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے غیر ممالک گیا۔ ہائیڈل برگ میں اس نے جرمن اور فلاسفی کو خوب پڑھا۔ وہ گوئٹے، ہلڈرلن اور رلکے کا دلدادہ ہوگیا۔ رلکے کے سونیٹ کے تراجم تو بہت مشہور بھی ہوئے مگر اس کی اپنی مطبوعات بہت کم ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں باہر جانے سے پہلے ہی اس کا پہلا مجموعہ شائع ہوگیا تھا۔ دوسرا مجموعہ ۱۹۳۰ء میں اور پھر رلکے کا ترجمہ کتابی شکل میں ۱۹۴۱ء میں شائع ہُوا۔ اس کا آخری مجموعہ یعنی "آخری دس سال کی نظمیں (۱۹۴۷ – ۱۹۵۰ء) کی نگارشات پر مبنی تھا۔

لیو یاٹسی کے نام

کینٹون میں چائے پینے کے دن کبھی نہیں بھولیں گے
وہ لمحے بھی نہیں بھولیں گے جب ایک دوسرے کو شعر سناتے سناتے
چونگنگ کی پتیاں سُرخ ہوگئی تھیں۔
اکتیس سال بعد، اپنے آبائی قصبے میں واپسی،
بالکل یوں لگتا ہے جیسے اپنے اچھے اشعار
اس وقت یاد کرو جبکہ شگوفے جھڑ رہے تھے۔
یاد رکھو دلوں کی شکست، اُداسی کی انتہا کو نہ پہنچ جائے،
اپنے ذوقِ بصیرت کو وسعت دو
تاکہ واقعاتِ عالم کو پرکھ سکو۔
یہ مت کہو کر کونمنگ جھیل میں پانی پایاب معلوم ہوتا ہے

یہاں تو فوچنگ کیانگ کے مقابلے میں
مچھلی پکڑنا بہت پسند کیا جاتا ہے ۔

برف

ملک کا شمالی منظر
میل ہا میل یخ بستگی کا منظر
اور میلوں آگے برف کے ذرّے ،
دیوارِ چین کو ادھر سے اُدھر تک دیکھو
ایک وسیع و عریض صحرا
عظیم دریائے زرد ، اوپر نیچے ،
کیا اس کی جھاگ بیٹھ گئی ہے
پہاڑیاں سانپوں کی طرح ناچ رہی تھیں
پہاڑ ، موم کے ہاتھیوں کی طرح جھوم رہے تھے
یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی حیثیت کا مقابلہ

خدا کی حیثیت سے کر رہے ہوں۔

ایک سہانی صبح تک انتظار کرو

جب دھوپ، تمھاری براق سیم تنی کو سنہرا کر دے

یہ منظر اور دل پذیر انداز میں ہویدا ہو۔

یہ زمین اپنی بے پناہ خوبصورتی کے ساتھ دمکتی ہے

اس نے اپنے لاتعداد جوان سپوتوں کو

اپنی حفاظت کی خاطر قربان کیا ہے

چن ہیانگ اور ہان وو!

تم پر ترس آتا ہے

تم دونوں ناشناس سخن ہو

تانگ تزنگ اور سوانگ تو

فنون لطیفہ کے حظ سے عاری ہیں

اور وہ جنت کا بگڑا بچہ

چنگیز خاں

کہ جس نے کھینچی کمان سے

چیلیں شکار کرنی سیکھی تھیں

سب کچھ گزر چکا ہے

بڑے آدمیوں کے لیے

صرف اور صرف

یہ زمانہ آئندہ ہے۔

رائے کے اظہار کا ایک انداز

میں نے خواب میں دیکھا

میں ایک پرائمری سکول کے کلاس رُوم میں بیٹھا ہوں

اور ایک مضمون لکھنے کی تیاری کر رہا ہوں ۔

میں نے اُستاد سے پُوچھا کہ رائے کا اظہار کیسے کیا جاتا ہے

"یہ بہت مشکل ہے" اپنے چشمے کے شیشوں کے کونوں سے جھانکتے ہوئے

استاد نے کہا ۔

انھوں نے کہا "میں تمھیں ایک کہانی سُناتا ہوں "

"جب ایک گھر میں بچہ پیدا ہوتا ہے" تو سارا گھر بہت خوش ہوتا ہے

جب بچہ ایک مہینے کا ہوتا ہے تو پھر وہ اسے اپنے مہمانوں کے سامنے نمائش

کے لیے لے کر جاتے ہیں

ظاہر ہے کہ اس نمائش کا مقصود ، تعریف کروانا ہوتا ہے ۔

دیکھنے والا ایک شخص کہتا ہے "یہ بچہ امیر ہوگا" پھر اس شخص کا شکریہ

ادا کیا جاتا ہے ۔

ایک اور شخص کہتا ہے "یہ بچہ افسر بنے گا" اب اس شخص کے جواب میں

اظہارِ تشکّر کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں ۔

ایک شخص کہتا ہے "یہ بچہ مر جائے گا" اس شخص کو پورے خاندان والے

مار مار کر ادھ مُوا کر دیتے ہیں ۔

یہ تو ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ بچہ مر جائے گا ۔ ہاں یہ ، البتہ جھوٹ

ہو سکتا ہے کہ وہ بہت امیر ہو گا کہ افسر بنے گا ۔

مگر جھوٹ کہنے پہ انعام واکرام ملتا ہے اور ناقابلِ تردید اظہارِ حقیقت

لائقِ سزا ٹھہرتا ہے ۔۔۔ تم ۔۔۔

جنابِ والا نہ میں جھوٹ بولنا چاہتا ہوں اور نہ مار کھانے کی ہمت رکھتا ہوں

تو پھر مجھے کیا کہنا چاہیے ۔

اس سلسلے میں کہو "آہ اس بچے کی سمت دیکھو ۔ میرے لفظ ۔۔۔ اوہ

میرے ۔۔۔ اوہو ۔۔۔ ہاہا ۔۔۔ ہاہا ۔۔۔ ہی ہی ۔۔۔

اے زمیں ! میری ماں !

اے زمیں ! میری ماں !

آسمان سحر کے رنگ میں پہلے ہی پھیکا پڑ گیا ہے

تم اپنی کوکھ سے بیجے کو نمو دیتی ہو

اب مَیں تمھاری کمر پر رینگ رہا ہوں۔

اے زمیں ! میری ماں !

جب بھی مَیں فردوس نما باغوں میں گھوما

سمندروں کی تہوں میں اُترا

تم نے مجھے سنبھالا دیا

تم نے مجھے وہ آہنگ دیا کہ جس نے میری رُوح کو آسودگی بخشی

اے زمیں ! میری ماں !

ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے

تم میرے لیے غذا ہو، زندگی ہو، پناہ گاہ ہو

مَیں تمھارے احسانات کا بدلہ کس طرح چکا سکتا ہوں

اے زمیں ! میری ماں !

اب سے مَیں خود کو تہ خانوں میں مقید نہیں کروں گا

مَیں تمھارے کھلے بے گیاہ میدانوں میں

اپنے فرض کو ادا کر کے

تم سے سُرخرو ہوں گا

اے زمیں ! میری ماں !

مَیں تمھارے فرض شناس بیٹوں اور کھیتوں میں کام کرتے کسانوں پہ رشک کرتا ہوں

وہ تو انسانیت کے مسیحا ہیں

تم نے ہمیشہ ان کی ناز برداری کی ہے

اے زمیں ! میری ماں !

مَیں تمھارے پیارے کوئلے کی سیہ کانوں میں کام کرنے والے کارکنوں پہ رشک کرتا ہوں
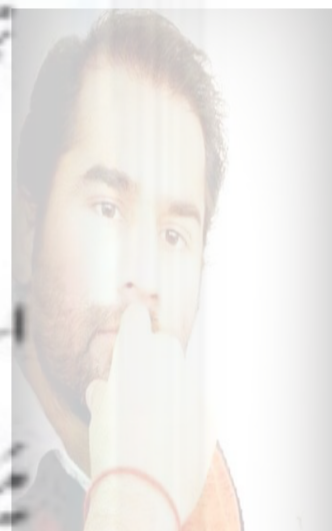
وہ تو انسانیت کے مسیحا ہیں
تم نے ہمیشہ ان کی ناز برداری کی ہے

اے زمیں ! میری ماں !
مَیں ہر شاخ ، ہر ٹہنی ، اپنے بھائیوں اور تمھاری اولاد پہ رشک کرتا ہوں
یہ سب لوگ کس قدر سرخوشی ، آزادی ، قناعت اور قوت کے ساتھ
اپنی اپنی زندگی کے مزے لُوٹتے ہیں ۔

اے زمیں ! میری ماں !
مَیں ہر جاندار چاہے وہ حشرات الارض ہی کیوں نہ ہوں اس پہ رشک کرتا ہوں
ہاں مَیں پرندوں پہ رشک نہیں کرتا
کیونکہ انھوں نے پر پرواز وا کرنے کے لیے تمھارا ساتھ چھوڑ دیا ہے ۔

اے زمیں ! میری ماں !
مَیں ہوا میں اُڑنا نہیں چاہتا ہوں
نہ مَیں بیل گاڑیوں اور گھوڑوں پہ سوار ہونا چاہتا ہوں
نہ مَیں موزے اور جُوتے پہننا چاہتا ہوں
مَیں تو ننگے پاؤں تمھارے اور قریب ہونا چاہتا ہوں ۔

اے زمیں ! میری ماں !
تم میرے وجود کی حقیقت کی گواہ ہو
مجھے اس بات پر یقین نہیں کہ تم خواب میں تخلیق شدہ ایک بلبلہ ہو
مجھے اس بات پر بھی یقین نہیں کہ مَیں ایک بے عقل مخلوق ہوں اور بغیر مقصد کے
مصروفِ عمل ہوں ۔

اے زمیں ! میری ماں !
میرا خیال ہے ہم سب ماں جائے ہیں
مجھے اس بات پر یقین نہیں ہے کہ آسمان پر جنت کے سایہ دار مقام پر
میرا کوئی باپ ہے جو کہ رہتا ہے ۔

اے زمین ! میری ماں !
میرا خیال ہے کہ اس دُنیا کی ہر چیز تمھارے جسم کی تجسیم ہے
گرج تمھاری قوت کا سایہ ہے
برف اور بارش تمھارے خون کے تموّج کا عکس ہیں ۔

اے زمین ! میری ماں
میرا خیال ہے کہ آسمان کا پھیلا پیالہ ، تمھارا آئینہ ہے جس میں دیکھ کر

تم اپنا سنگھار کرتی ہو۔

اور دن کے وقت یہ سورج اور رات کے وقت یہ چاند

آئینے میں تمھارے سامنے ہیں۔

اے زمیں! میری ماں!

میرا خیال ہے کہ آسمان کے سارے تارے

آئینے میں منعکس تمھاری تخلیقات کی آنکھیں ہیں

میں صرف یہ سوچ سکتا ہوں کہ تم وجود کی حقیقت کی گواہ ہو۔

اے زمیں! میری ماں!

میری پہلی ذات صرف ایک لاعلم بچے کی ذات تھی

میں نے بس تمھاری شفقت سے حظ اٹھایا تھا

مگر مجھے تمھاری شفقت کا نہ مطلب سمجھ میں آیا تھا

اور نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس شفقت کا جواب کس طرح دینا ہے۔

اے زمیں! میری ماں!

اب مجھے احساس ہوگا کہ تم کتنا پیار کرتی ہو

اگر میں ایک گلاس پانی پیوں چاہے وہ پانی کا گلاس رات بھر ٹپکتی شبنم

سے ہی بھرا ہو۔

مجھے معلوم ہوگا کہ یہ تمھارا دودھ ہے

میری زندگی بچانے والا مشروب ہے

اے زمیں! میری ماں!

جب کبھی میں کسی آواز کو بولتے یا ہنستے سنتا ہوں

میں سمجھتا ہوں کہ یہ تمھارا گیت ہے

جو میری روح کو آسودہ کرنے کے لیے نغمہ ریز ہے

اے زمیں! میری ماں!

میری آنکھوں کے سامنے ہر چیز مضطرب ہے

میں سمجھتا ہوں کہ یہ تمھارا رقص ہے

اس رقص کے بہانے تم میری روح کو آسودہ کرنا چاہتی ہو

اے زمیں! میری ماں!

میں ہر خوشبو اور ہر رنگ کو سلام کرتا ہوں

مجھے معلوم ہے کہ یہ کھلونے ہیں جو تم نے مجھے دیے ہیں
کیونکہ تم میری رُوح کو آسودہ کرنا چاہتی ہو

اے زمیں ! میری ماں !
میری رُوح تمھاری رُوح ہے
مَیں اپنی رُوح کو قوی تر بناؤں گا
تاکہ تمھاری شفقتوں کا جواب دے سکوں

اے زمیں ! میری ماں !
اب مَیں تمھاری شفقتوں کا جواب دوں گا
مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے پیار کرتی ہو اور میرے کام کرنے کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہو
مَیں تم سے انتھک کام کرنے کا سلیقہ سیکھوں گا۔

بہار کے ریشم کے کیڑو !

ریشم کے کیڑو ! تم ریشم کے تار بُن رہے ہو
نہیں ، تم تو شعری سوغات تخلیق کر رہے ہو
کتنی ارفع ، کتنی مقدس کتنی نازک اور کتنی دِلرُبا ہے تمھاری یہ شاعری
تمھاری یہ شاعری کن انتہائیوں کو چھوتی ہے
میرے پاس تو اس کے بیان کے لیے الفاظ نہیں ہیں

ریشم کے کیڑو ! تمھاری شاعری
کیا یہ آوُردہ ہے کہ بے ساختہ ہے
کیا تم فنی باریکیوں کے ساتھ تخلیق کرتے ہو
یا پھر یہ فطری بے ساختگی کا اظہار ہے

کیا یہ تم دوسروں کے لیے تخلیق کرتے ہو

یا پھر یہ تم صرف اپنے لیے بناتے ہو

ریشم کے کیڑو ! مجھے ڈر ہے کہ تمھاری شاعری

کہیں محض بے ساختہ

اور غیر ارادی تو نہیں

فن کا وہ محل جو تم تعمیر کر رہے ہو

افسوس ہے کہ

وہ صرف اور صرف تمھارے اپنے لیے ہے۔

کوموجو

مَیں تخیّل پرست ہُوں

مَیں تخیّل پرست ہُوں

مَیں سُورج ، اونچے پہاڑوں اور سمندر کی پرستش کرتا ہوں

مَیں پانی ، آگ ، آتش فشاں پہاڑ اور بڑے بڑے دریاؤں کی پرستش کرتا ہوں

مَیں زندگی ، مَوت ، روشنی اور اندھیرے کی پرستش کرتا ہوں

مَیں سویز ، پناما ، دیوارِ چین اور اہرامِ مصر کی پرستش کرتا ہوں

مَیں تخلیقی فنکاروں ، طاقتوروں ، گرم خون اور نرم دلوں کی پرستش کرتا ہوں

مَیں بموں ، غموں اور تباہی کی پرستش کرتا ہوں

مَیں بُت شکنوں کی پرستش کرتا ہوں ، مَیں اپنی پرستش کرتا ہُوں

کیونکہ مَیں خود ایک بُت شکن ہوں۔

سانپ

میری تنہائی ایک لمبا سانپ ہے۔
خاموش اور بے زبان
اگر تم اسے اپنے خوابوں میں دیکھو گے
تو حیرت سے گنگ ہو جاؤ گے۔

یہ میرا وفادار ساتھی ہے
یہ گھر کے حزن سے درد چشیدہ ہے۔
اس کی تمنا ہے کہ تمھارے سروں پر۔
کالے بھبھوت ریشم کے گچھوں سے گھونسلیں بن جائیں۔
اور چاندنی کی کرنوں کی طرح ہلکے سے۔

یہ تمھارے پاس سے، خاموشی سے۔
تمھارے خواب چرانے کے لیے گزر جائے
خواب! جو کہ شعلہ رو قرمزی پھول ہے

الیگزینڈر بلاک :

۱۸۸۰ء میں سینٹ پیٹرزبرگ میں پیدا ہُوا - بلاک نے ۱۹۰۵ء
کے انقلاب میں اپنی تخلیقات کے حوالے سے بہت اہم کردار ادا کیا۔
۱۹۴۳ء میں سرمورس بورا نے بلاک کا پہلی دفعہ انگریزی میں ترجمہ کیا
اور یوں بلاک کی شاعرانہ عظمت سوویٹ یونین سے نکل کر چہار دانگ
عالم میں پھیلی۔ اگست ۱۹۲۱ء میں طویل علالت کے بعد اس کا انتقال ہُوا۔

اپنے دوستوں کے نام!

ہم بڑی رازداری سے
ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں
ہم ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں
ایک دوسرے کے بارے میں کچھ سُننا نہیں چاہتے
اور ہم ایک دوسرے سے سرکشیدہ ہیں
ہم کوشش بھی کریں تب بھی
نفرت کیے بغیر نہیں رہ سکتے
نفرت کرنا، ہماری عادتِ ثانیہ بن چکی ہے

پھر کیا ہُوا
اب جبکہ ہم میں سے ہر شخص نے

اسے گھر کو نفرت کے زہر سے بھر دیا ہے
ہمارے گھروں کی دیواریں بھی بغض اور کشیدگی کے زہر سے تر بتر ہیں
کوئی جگہ نہیں کہ جہاں لمحہ بھر کو سر رکھ کے آرام کیا جا سکے

پھر کیا ہُوا
خوشیوں سے ایمان اُٹھ جانے کے باوجود
ہم ہنستے ہیں
اتنا ہنستے ہیں کہ ہم ہونٹوں پہ جھاگ بن جاتے ہیں
اور مدہوشی کے عالم میں
راستوں سے اپنے گھروں کے غاروں میں جھانکتے ہیں
اور بے ہوش ہو کر گر جاتے ہیں

ہم نے زندگی اور دوستی دونوں سے نمک حرامی کی ہے
ہم خالی لفظوں کے چرخے ہیں
پھر کیا ہُوا
ہم ان کے لیے راستہ صاف کر رہے ہیں

جو ہمارے بعد آئیں گے
جب ببول کی باڑ میں
ہماری خستہ ہڈیاں، مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گی
اور پھر بعد میں، کوئی عالِم
ضخیم کتاب میں ہماری داستان لکھے گا

چھوڑو یہ لغویات
وہ عالِم بھی، معصوم نوجوانوں کو
حقیقتوں کی جامہ زیبی سے اذیت پہنچائیں گے
وہ ان کی پیدائش اور موت کو کسی نہ کسی نکتے سے مربوط کریں گے
اور اس کے ساتھ بے تکے حاشیے لگائیں گے

کتنے افسوس کی بات ہے
ہماری زندگیاں یوں اُلجھی ہوئی ہیں
اتنی اذیت اور اتنی بے چارگی
اور یہ اصول پرستی، کے اندوختہ کا مظہر

نقادوں کے لیے ایک نئے شاخسانے کا سامان ہو گا

اور ببول کے درختوں تلے قبر میں

کہ جہاں سو کر انسان اپنے بارے میں سب کچھ بھول جائے

کتابیں بند کرو۔ خاموش ہو جاؤ

میں نے تمھیں کبھی کچھ نہیں لکھا

کبھی نہیں . . .

جانبازی

جانبازی، افتخار، استحصال، شہرت

میں اس تلخ زمین پر بھول گیا ہوں

جبکہ تمھارا چہرہ، میرے سامنے

میز کے کپڑے پہ ایک سادہ سے فریم میں

چمکا تھا

وہ وقت بھی آیا کہ تم سدا کے لیے گھر چھوڑ گئیں

میں اندھیرے ہی میں تمھارے تعاقب میں سرگرداں رہا

مگر تم نے دوسرے شخص کے ہاتھ میں اپنی زندگی کی طنابیں پکڑا دیں

اور میں تمھارے رخساروں کی ہڈیوں کی خوبصورت محراب کو بھی بھول گیا

دن گزرتے گئے

ایک لامحدود اُداسی مسلط ہو گئی

جبکہ معاشقوں اور شراب نے میرے مُنہ کا ذائقہ تلخ کر دیا

قتل گاہ میں کھڑے، مَیں نے تمھیں یاد کیا

مَیں نے تمھیں دوبارہ ایسے یاد کیا، جیسے مَیں اپنی جوانی کو یاد کر رہا ہوں

مَیں نے تمھیں یاد کیا، مگر تم نے مجھے قابلِ توجہ نہ سمجھا

مَیں تمھارے لیے رویا، مگر تم پر کچھ اثر نہ ہُوا

تم نے اپنے آپ کو سنجیدگی سے نیلے فرغل میں لپیٹا۔

اور اپنے آپ ہی بھیگی ہوئی رات بِتانے چلی گئیں

مجھے نہیں معلوم کہ تمھارے تفاخر نے کہاں دستِ مسیحائی پایا

میری پیاری، میری مہربان، میری خوشیوں کا مرکز

مَیں اپنے سارے خوابوں میں، تمھارا وہی نیل گوں فرغل

تمھاری کمر پہ بل کھاتا، لٹکتا

اور رات میں تحلیل ہوتا دیکھتا ہوں۔

ہاں، یہ وجدان کی آواز ہے

ہاں، یہ مرے وجدان کی آواز ہے

مرے دن کے خواب

اس سمت ضرور، پلٹتے ہیں

جہاں بے عزتی، اندھیرا، غربت اور گندگی بکھری ہوئی ہے

نیچے، بالکل نیچے، مسکین بن کر، نیچا ہو کر

دوسری دُنیا، بہتر طریقے پر دیکھی جا سکتی ہے

کیا تم نے پیرس میں بچّوں کو خوف سے دُبکتے دیکھا ہے

یا سربازدہ سین[1] کی بوجھل رفتار دیکھی ہے

تم زندگی کے تمام خوفناک اور اندھے راستوں کو سمجھو

---

[1] دریا کا نام
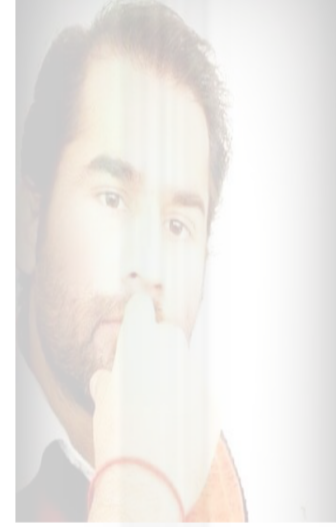
اپنی آنکھیں کھلی رکھو

اس سے پہلے کہ زبردست طوفان بے قابو ہو جائے

اور تمھارے آبا کی زمین کا چہرہ مسخ کر دے

اپنے ہاتھوں کو آنے والے کاموں کے لیے تیار کرو

اور اگر تم نہیں کر سکتے

تو پھر بوریت اور غم کو اکٹھا ہو کر

تمھیں بھسم کر لینے دو

زیادہ بے عزّت ہوئے بغیر ہی

تم اس شرمناک زندگی کے داغوں کو دھو ڈالو

اور ایک بُزدل چھچھوندر کی طرح

زمین کھود کر روشنی سے اندھیرے کی جانب سفر کرو

اوندھے، ساکت، لیٹ جاؤ

اور شدّت کے ساتھ، دُنیا سے نفرت کرو

دُنیا کو بُرا، بھلا کہو

اور ہر چند تم مستقبل کو واضح طور پر نہیں دیکھ سکتے ہو

پھر بھی، حال کی نفی کر رہے ہو۔

گلیاں، دُھوپ، دروازے

دِلوں کے خالی چرخوں پہ خوشیاں کیسے کاتی جائیں

کشور ناہید!

عمر کے اڑتیس برس
تمھارے بالوں اور گالوں میں
اترتی خزاؤں
اور ڈھلتے جذبوں کی آندھیوں میں
کچے ٹوٹتے پھلوں کی طرح
سارے رشتے
زندگی کے چندن روپوں کی طرح
گدرا گئے ہیں۔

کشور ناہید!
تم مُنہ بند سیپی کی طرح

زندگی کے سمندر میں
ہواؤں سے باتیں کرتے
پہاڑوں کی بُنیاد ہلاتے
اور لہروں کو اپنے بالوں کی طرح کاٹ کر
ساحل پہ
گزشتہ کی روایتی
اور آج کی مضطرب
عورت بن کر سوچ رہی ہو۔

کشور ناہید!
یہاں نہ کوئی بولتا ہے
نہ کوئی بولتی آنکھوں کے
لفظوں کو سمجھنا چاہتا ہے۔
ہاتھ سے پھسلتی مچھلی
خوف کو نفرت میں بدل دیتی ہے

کشور ناہید!
تمھیں خاموشش دیکھنے کی چاہت
قبروں سے بھی اُمڈی آرہی ہے
مگر تم بولو!
کہ یہاں سُننا منع ہے
مجھے جن جذبوں نے خوف زدہ کیا تھا
اب مَیں ان کے اظہار سے
دوسروں کو خوف سے لرزتا دیکھ رہی ہوں
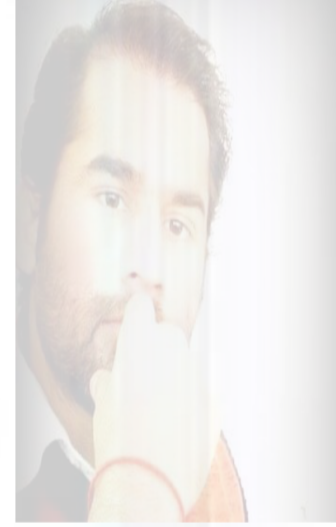
مکافات

مَیں شاعری کرتی ہوں
کیوں کہ مَیں نے خودکُشی نہیں کی۔
مَیں زندگی کرتی ہوں
کیونکہ مَیں نے دلبری نہیں کی۔
مَیں نوکری کرتی ہوں
کیونکہ مَیں نے سروری نہیں کی۔

مَیں آگے ہی آگے چلتے رہنا چاہتی ہوں
کیونکہ پیچھے مُڑ کر ویرانیٔ نقشِ پا دیکھنے کی ہمت نہیں ہے۔
مَیں ہنستے ہی ہنستے مر جانا چاہتی ہوں
کیونکہ چہرے کے زخم آلود گڑھوں کو مجسّم کرنے کی ہمت نہیں ہے۔

دیے کی بتی نے چوکھٹ پار کرلی ہے اور ہوا لرز رہی ہے

بیابان ماتھے

خزاں خوردہ آنکھیں

اور سوختہ جاں شوق

کیسے کیسے خزینے ہیں کہ لب کھلتے ہی نہیں۔

ہُوا کا ڈھول گلے میں ڈالو

اور دستکوں سے پوچھو

تم پلٹ کر تو نہیں آؤ گی!

بانجھ ہونٹوں سے التفات!

کیا لوگ کاغذ بھی کاتنے لگے ہیں؟

ساحل اور دریا کا فرق ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

متوازی لکیروں کا فاصلہ ہمیشہ ایک سا ہوتا ہے۔

مَیں .....

مَیں ناگفتنی کرتی ہوں

کیونکہ مَیں نے گفتنی نہیں کی۔

گھاس تو مجھ جیسی ہے

گھاس بھی مجھ جیسی ہے

پاؤں تلے بچھ کر ہی، زندگی کی مُراد پاتی ہے

مگر یہ بھیگ کر کس بات گواہی بنتی ہے

شرمساری کی آنچ کی

کہ جذبے کی حدت کی

گھاس بھی مجھ جیسی ہے

ذرا سر اُٹھانے کے قابل ہو

تو کاٹنے والی مشین

اُسے مخمل بنانے کا سودا لیے

ہموار کرتی رہتی ہے۔

عورت کو بھی ہموار کرنے کے لیے
تم کیسے کیسے جتن کرتے ہو۔
نہ زمیں کی نمو کی خواہش مرتی ہے
نہ عورت کی۔
میری مانو، تو وہی پگڈنڈی بنانے کا خیال درست تھا
جو حوصلوں کی شکستوں کی آنچ نہ سہہ سکیں
وہ پیوندِ زمیں ہو کر
یونہی زور آوروں کے لیے راستہ بنا دیتے ہیں۔
مگر وہ پرِ کاہ ہیں
گھاس نہیں
گھاس تو مجھ جیسی ہے!

نیلام گھر

موت کا ذائقہ
لفظوں کے پیکر میں
اس کے ہونٹوں سے ٹپکتا ہے۔
وہ نفرتوں کو بوسوں کا رنگ دے کر
میرے مُنہ پر نیلے نیلے داغ ڈال کر
یہ جتانا چاہتا ہے
کہ اسے میرے جسم کو ہر طرح استعمال کرنے کا حق ہے۔
یہ حق بھی کیا عجیب ہوتا ہے۔
حق جتانے کی خواہش
محکومیت کی ڈھال پہ اپنا چھتر بناتی ہے
حق جتانے کی خواہش
ہر کذب اور ریاکاری کو صدقے ہوتی

محبتوں کا نقاب اُڑھاتی ہے ۔

مگر نقاب کے نیچے سے چہرہ

اب تو اور بھی صاف اور بھی واضح نظر آتا ہے ۔

ترغیب اور تذلیل یکجان ہو کر

زوج بنتے ہیں ۔

نفرتوں کی جھیل میں پاؤں لٹکا کر بیٹھنے سے

ماتھوں پہ لکھی عزلتوں کی سیاہیاں دُھل تو نہیں جاتی ہیں

ہاں مسافتوں کی مایوسیوں کی مٹی

اپنا آپ چھوڑ دیتی ہے ۔

تپے ہُوئے تنور سے جس طرح پھُولی ہُوئی روٹیاں باہر نکلتی ہیں

میرے مُنہ پر طمانچہ مار کر

تمھارے ہاتھوں کی اُنگلیوں کے نشان

پھُولی ہُوئی روٹی کی طرح

میرے مُنہ پر صد رنگ غبارے چھوڑ جاتے ہیں

تم حق والے لوگ ہو

تم نے مہر کے عوض حق کی بولی جیتی ہے ۔

ترا لٹیا شہر بھنبھور

نیند نہیں آتی

بستر کی خواہش بھی آسودگی چاہتی ہے

مَیں ستارے گنتے گنتے

یہ سوچتی ہوں کہ ستاروں کی گنتی

تو تمھیں گلا گھونٹ کے مار ڈالنے کی گنتی سے کہیں کم ہے

تم میں بھی خواہش ہے

مُجھ سے خوبصورت بنتے رہنے

اور نت نئے ڈیزائنوں کے کپڑوں میں

لپٹے رہنے کی ۔

کیلنڈر کی تصویر بدلتی ہے

روز و شب کی تلخی نہیں بدلتی

روز ، سہ پہر سے رات

قدموں کی چاپ کی بازیافت
یا ٹیلی فون کی گھنٹی سے
واپس آنے کی تسلی کے حرف کی اُمید میں
بسر ہوتی، منتشر ہوتی رات، اور پھر دن
کریز میں سجے دُھلے دُھلائے کپڑوں
کی طرح گزر جاتا ہے۔
سہ پہر سے رات
پھر وہی احساس
پھر وہی خواہش،
تالے میں چابی گھومتی ہے
مَیں کروٹ بدل کر لیٹ جاتی ہوں،
مرتبان میں بند
تتلی کی طرح،
صحرا میں گھومتے
اکیلے چیتے کی طرح،
مگر نیند نہیں آتی ہے

جاروب کش

دوسروں کی سیوا
پتھروں کی سیوا کے برابر ہے
بہن، بیوی اور ماں کے رشتوں
کی خاطر جینے والی
تم اپنے لیے بھی تو جیو!
دیکھو کنول کا پھول کیسے عالم
اور کیسے ماحول میں اپنی انا
اور اپنے وجود کا اعلان کرتا ہے،
تم کیوں آٹھ سال چھوٹے بھائی
کے غصے بھرے تحکم کو مان کر

کھڑکی سے جھانک کر مسکراتے چہرے
کی تلاش سے آنکھیں چُرا لیتی ہو!
تم کیوں پینتیس برس کی عمر کی ہو کر
خود کو سنوارنا بند کر دیتی ہو
کہ تمھیں اپنے شوہر کے زہر میں بجھے
فقروں سے طلاق کی بُو آتی ہے۔
تم ماں ہونے کے ناطے
اپنے اندر کے بچے کو
گوشت پوست کے بچوں کی بھینٹ چڑھا کر
ممتا کا نام دیتی ہو!
جیسے کچے رنگوں کے دھاگے
پانی کے ایک ہی قطرے سے
رنگ چھوڑ دیتے ہیں
یہ سب رشتے
کچے رنگوں کے دھاگے ہیں
سب پتھر ہیں

ان کے اُوپر چلو تو بھی لہولہان
ان کو سہو، تو بھی لہولہان
پر اپنے لیے جینا کیوں ممکن نہیں!
میری بنّو!
سُورج مکھی کی طرح
گھر کے حاکم کی رضا پر
گردن گھماتے گھماتے
میری ریڑھ کی ہڈی چٹخ گئی ہے
جسم کا سارا بوجھ سہنے والی ہڈی
چٹخ گئی ہے

سُنو جین آسٹن !

جین آسٹن !
تم نے کہا تھا
تم جتنا بھی چاہو
دیوانگی اختیار کرو
مگر دیکھو !
بے ہوش ہو کر، گر مت پڑنا !
جین آسٹن !
تم نے یہ اختیار اور جبر کا ترازو
میرے ہاتھ میں کیوں پکڑا دیا !

جین آسٹن !
تمھیں معلوم تھا
تولنے والے کے ہاتھ کانپ جاتے ہیں
تمھیں معلوم تھا
ترازو کے دونوں پلڑے
برابر نظر بھی آئیں
تو اصل میں برابر نہیں ہوتے ہیں
مَیں دونوں پلڑوں کو برابر
ظاہر کر کر کے، ہانپ گئی ہوں
بے ہوشی کے ہوش کے لمحے میں
یہ چند باتیں تم سے
جین آسٹن !
کہ ظاہر میں موجود لوگ
تو سب مر چکے ہیں
میرے لیے

تعبیر

مَیں نے اپنی ماں سے کہا تھا
مَیں تم سے نفرت کرتی ہوں
مَیں اس جرأتِ اظہار پر
آج تک نازاں تھی
آج میرے بیٹے نے مجھ سے کہا ہے
"مَیں تم سے نفرت کرتا ہوں"
میرا بچپن پارہ بن کر
میرے خون میں تیر رہا ہے۔

سمجھوتہ

وہ کہتے ہیں
مَیں درشتی اور سنگدلی میں
ایک چٹان کی طرح ہوں
مَیں سوچتی ہوں
محبت کی طلب اور احتیاط
کے کٹوروں کو
چٹانیں کون کہہ سکتا ہے
ہاں مَیں نے حلق میں چٹانیں بنالی ہیں
کراہیں ان چٹانوں سے ٹکراتی ہیں
اور واپس میرے جسم میں

نس نس سے پھوٹنے کے لیے
بیتاب ہوتی ہیں۔
میرا سارا بدن جل رہا ہے۔
میں اس آنچ کو ہونٹوں اور آنکھوں تک
نہیں پہنچنے دوں گی۔
میرے حلق کی چٹانیں
فصیلیں ہیں میرے جذبوں کی
تمھارے فیصلوں کے رڈار پہ
ان مورچوں کی خبر نہیں پہنچے گی۔

اگر تم رونا ہی چاہتی ہو

تو دریا میں چھپی مٹی اپنی آنکھوں پر مل لو

اگر تم جینا ہی چاہتی ہو

تو خوابوں کے غار پہ مکڑی کا جال بن کے تن جاؤ

اور اگر سب کچھ بھولنا ہی چاہتی ہو

تو سوچو پہلے کونسا لفظ سیکھا تھا

− × + = −

ارے کیا ہُوا

منھ پہ طمانچے کا نشان !

تنور میں روٹیاں یونہی لگتی ہیں

ارے کیا ہُوا

گردن پہ گلا دبانے کا نشان !

گیس بھری بوتل کا چھڑا دبانے سے ہی

بوتل کا رس تم پی سکتے ہو۔

ارے کیا ہُوا

فقروں سے چھلنی ہو کر، ہونٹوں پہ پپڑیاں !

کمان سے تیر نکلے تو کسے خبر کہ کون نشانہ بنے گا۔

پیروں تلے جنت کی ہیروئن !

لولی پاپ کی قیمت بڑھ رہی ہے

اور تیری گھٹ رہی ہے

ہم نے خواہشوں کے سارے پرندے اُڑا دیے ہیں

شروع شروع میں اچنبھے اچھے لگتے تھے

شوق بھی تھا اور دن بھی بھلے تھے

اچھے لوگوں سے ملنے کا شوق، جنوں کی حد تک

ہر لمحہ بیتاب لیے پھرتا تھا۔

جب کوئی اپنا ہیرو

اپنے آدرش کا پیکر سامنے آتا

جی یہ چاہتا

آنکھیں بچھائیں، دل میں بٹھائیں

باتیں سُنیں، اتنی باتیں

سیلِ زماں سے اونچی باتیں

دل کے گہرے غم کی باتیں

دُوری اور نزدیکی

لفظ بہت چھوٹے ہیں
ان لفظوں کو پرکھو تو
انسان اور بھی چھوٹے نکلتے ہیں
پاس بلا کر جسے دیکھو
اس کا چہرہ، فق، بے رنگ
بھبھوت کی صُورت، کالا کالا!
کیا سُورج بہت نیچے آگیا ہے
کیا ماؤں نے بچے جن کے
دُودھ پلانا چھوڑ دیا ہے
گولیاں کھا کے، دُودھ کے سوتے
خشک کرنے والی ماؤں!
پلاسٹک کے بیگز میں رات رات بھر
بچوں کا پیشاب جذب کرنے والی ماؤں!
نیند تمھاری بہت میٹھی ہے
ٹھیک ہے، تم بھی بے بس ہو
مرد گھروں سے غائب ہوں تو

ماں کی ممتا، بلک بلک کر
نیند کی گولی کے آنگن میں سو ہی جایا کرتی ہے۔
خواب آور گولی
یہ بھی تو آج کی اہم ضرورت ہے۔
مصنوعی پلکیں آنکھوں سے اُتار کے
اصلی چہرہ مت دیکھو
گولیاں کھاؤ، سو جاؤ، آرام کرو۔
صُبح تمھارے سر کے اُوپر سُورج کی
اور بھی گرم شعاعیں، رقص کریں گی۔
اچھے لوگ، صُبح کو کچھ اور شام کو کچھ
اور رات کو ان کے خون کی طغیانی میں
ان کے ہاتھ اور ان کی آنکھیں
بالکل جنگلی چوہے جیسی معلوم ہوں۔
پہلے پہل یہ اچنبھا تھا
خوف کی تہ میں انجانے کو جاننے کی خواہش
مکڑی کے جالے کی مانند پھیلی

پہلے پہل پستانوں میں درد کی ٹیسیں بہت اُٹھیں

پھر یاد نہیں

مصنوعی پلکیں اتنی لمبی ہیں

میں اپنے پیر کے نقش کے آگے دیکھ نہیں سکتی ہوں

کہتے ہیں کہ ہوا چلی ہے

کھیپ نئے لوگوں کی

جن کو اچھا کہنے والے ساتھ ہیں

پہنچ گئے ہیں، شہر کنارے

سُورج اب تو اتنا نیچے آپہنچا ہے

اس کو اُٹھا کے دُور کسی کونے میں دفن کرو۔

رات کی چادر اوڑھنے سے پہچان کا رشتہ

شُکر خدایا! ——— ٹُوٹ تو جاتا ہے

اے رب! تُو والیٔ کون و مکاں

تُو سب کے دلوں کے حال سے واقف ہے

تو ہم کو بتا۔ ہم کیا سوچیں۔

ہم نے خواہشوں سارے پرندے اُڑا دیے ہیں

FACE THE PAN

انڈوں کی جگہ

ہونٹ تلنے کا تجربہ کیسا ہے

ہونٹ بھی انڈوں کی طرح

گرمی سے، بیک وقت

سکڑتے اور پھیلتے ہیں

انڈوں کے چھلکوں کی طرح

ہماری شخصیت بھی اندر سے خالی

اور دو حصّوں میں بٹی ہوئی ہے

مگر وہ تو عموماً برابر کے حصّے ہوتے ہیں

اوہو! یہ برابری کا خواب

تمہیں باورچی خانے میں کیسے لے آیا ہے
انڈوں کے چھلکے تو ڈرائنگ رُوموں
میں بھی سج جاتے ہیں
تم کہاں سجو گی!

نظم

مجھے خوشبو لگانے والے مردوں سے بُو آتی ہے
بے حس تعلقات کی
مردہ مدارات کی
ان سے کہو
حرفوں کے علوم کی چھتوں کے پار
جو صحرا ہے
اس میں اگر تم یہی سپرٹ سے بنی
خوشبو بغلوں میں لگا کر گئے
تو تمھارا اِک اِک بال
کنکھجورا بن کر
تمھاری کھال میں، جان قبض کرنے والے
پنجے گاڑ دے گا

القاب

میں تاریکی کی انتہا میں ہوں
اور تم سے مخاطب ہوں
اگر تم میری جانب آؤ تو
اپنی مہربانی کے چراغ ساتھ لانا
میں محبتوں کی خوشبو، اپنے ساتھ بچا کے لائی ہوں
اور تمھاری منتظر ہوں۔

(ماخذ فروغ فرخ زاد)

ساحلِ مراد

وہ مجھے سُرخ پھولوں کے باغ میں لے آیا
اور میرے بیتاب بالوں کو
سُرخ پھولوں کی تاریکی میں چھپا دیا
اور آخرِ کار
پھولوں کی پتیوں کی سُرخی
میرے ساتھ سو گئی۔

(ماخذ فروغ فرخ زاد)

نظم

مجھے پانی کے جوہڑوں میں نہاتی
وہ عورتیں اور بطخیں اچھی لگتی ہیں
جنھیں کسی حرف آشنا نے
پاکیزہ نہیں کہا ہے

نظم

اس نے چڑیا کو پروں سے دبوچا
چڑیا ہاتھ سے پھسل گئی
آنگن خون سے تر بتر تھا
نائن آنگن دھو رہی تھی

دھواں چھوڑتی بسیں

ہماری عمریں تو بس سٹاپ پر
کالج کی بس کے انتظار میں گزر جاتی ہیں
تم کہو کہ جن کے پیر، ہوائی چپل سے بے نیاز
ہوا میں تیرتے ہیں
بادلوں کو اوڑھتے ہیں
اور مخملوں کو مسلتے ہیں
تم نے کہاں عمر گزاری۔
آنکھوں کے گرد پھیلے حلقے
پپوٹوں پہ لگے رنگ سے
اور کھل اُٹھتے ہیں

تمھارے مُنہ پہ بھی اُلٹا کے مارے ہُوئے
سالن کا ماسک سجے
تو مَیں بھی پُوچھوں
کہو، آنکھوں میں شبنم کو تیرتا دیکھ رہی ہو!
تمھیں بھی رات گئے، لوٹنے والے
پُرخور مسافروں کے پَیر دبانے پڑیں
تو پوچھوں
ہاتھوں پہ بہار کیسے کھل اُٹھتی ہے!
ہمارے پَیروں میں پھوڑے اُگ آتے ہیں
اور آنکھیں سلیٹ کی طرح صاف ہو جاتی ہیں
پھر بھی کماؤ پُوت کے لیے
کنیزوں کی طویل قطار سجتی ہے
جسے چاہو اپنی سزا کے لیے منتخب کر لو
اور یوں باقی عمر
اے کالج کے لیے بس کا انتظار کرنے والی لڑکیو
دھواں چھوڑتی بسوں کی طرح، دھکّے کھا کھا کے گزار دو!

زہر نما امرت

کھانا تو اِک شغل لذتی تھا
مُنہ کے ذائقے میں زندگی کے تمام ذائقے در آتے ہیں
جیسے پانی کی لاکھوں بوندیں، ایک ہی بادل کی صورت میں
پھیل کر اپنا آپ چھپاتی ہیں
ایسے ہی بھوک کے روپ میں محنت کی
اِک ایک گھڑی یہ چاہتی ہے
مجھے شکتی دو
مرے ہر لمحے کی قیمت دو۔
انسان، انسان کا غلام بنے
جسے یہ بھی کہیں، انسان، انسان کے کام آئے

فیشن کی تہیں چڑھتی جائیں
عمریں سب کی بڑھتی جائیں
خواہش کی بھوک یہی کہتی ہے
دیکھو شفق، بس لمحوں کی مہمان ہُوا کرتی ہے
شکم سے پہلے، خواہش کی ہر بھوک مٹا دو
کیسے ممکن ہے
خواہشیں، خواہشیں، کیسے گنوں مَیں
بھُوکے کو جب روٹی ملے تو
کھاتے کھاتے سانس بھی بھُول ہی جاتا ہے۔
ہم سب سانس کے رشتے سے
پھولے پیٹ کے ہانپ ہانپ کے سانس لیتے ہوئے
ماں جائے ہیں
بھُوکے ہیں، خواہش سے تپے ہُوئے چہرے ہیں
آنکھوں میں اِبن الوقتیوں کے کاجل نے
پھیل کے کام خراب کیا ہے
مُنہ دھو لو

آؤ دیکھو، نئی نئی اقسام کے کھانوں کا
دسترخوان بچھا ہے
بھوک بہت ہے
لیکن ہر لقمہ، جتنا چباؤ، اور بھی پھولتا جاتا ہے
لقمے میں خواہش جاگ رہی ہے
لعابِ دہن اب ساتھ نہ دے
کھانا تو شغلِ لذتی تھا
لذت کس کے پاس ہے
مجھ کو لوٹا دو

نوشتۂ دل

تم زندہ ہو
اور اس اذیت سے آگاہ بھی ہو۔
خودکشی سوچتی ہے کہ تمھیں وہ
مقابل دروازے سے نکال لے جائے گی
مگر وہ تو دروازے کی تصویر ہے
جو دیوار پہ آویزاں ہے
یقین کرو تم زندہ ہو۔
دیواریں، دروازے نہیں بنا کرتی ہیں
آگ کو پھول بنانے کے زمانے کب کے لد چکے
روزنوں سے جھانکنے سے کبھی سراپا نظر نہیں آتا۔

دیواروں پہ چپکے ہوئے لفظوں کے لاشے
ایک پہ ایک لاشہ
آپس میں خلط ملط ہوتے نعرے
اتحاد پہ نفاق
اور ایمان پہ کفر کی تحریر
تاکتی جھانکتی سطریں
جانتے ہو، درد تغافل سے کم نہیں ہو جایا کرتا ہے۔
تم نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے
مگر یہ تمھارے ہاتھ خون آلود کیوں ہیں؛
تم نہ قتل کر سکتے تھے، نہ کرو گے
تم تو بس ارادہ کر رہے تھے۔
ہاتھوں پہ خون کی سُرخی
ماتھے پہ اذیت کی محراب
یہ کس وصل کی تیاری ہے!

دفعہ ۱۴۴

ہم اندھے پن کے متلاشی ہیں
جہاں تمیز کی حدیں غائب ہو جاتی ہیں
اور ہم صرف لمس بن کر رہ جاتے ہیں،
لمس — جو معذرت اور التجا کا آئینہ ہے۔
یہاں غُربت اور امیری رہے گی
اس لیے کہ ہم ذہنوں کو چھُو کر، انھیں بے قیمت کر دیتے ہیں۔
درخت پتے پہنتے ہیں
مگر خزاں، وصال کی شہوتوں میں انھیں زمین دوز کر دیتی ہے۔

ہم بہرے پن کے متلاشی ہیں
کہ جہاں لفظ و معنیٰ، صرف ہلتے لبوں کی جنبش میں

قید ہوتے ہیں
جنبش ـــــ کٹھ پتلیوں کے تار ذرا بھی غلط ہل جائیں
تو سارا کھیل چوپٹ ہو جاتا ہے
یہ کھیل تو رہے گا
اندر کے خوف کو رعشہ مت بننے دو

ہم گونگے پن کے متلاشی ہیں
کہ تالی بجانے والے آواز استعمال نہیں کرتے ہیں
آواز، آزاد ہو تو نعرۂ منصور
اور گھٹ جائے تو حسن ناصر بن جاتی ہے
مگر گونگے چیخ تو سکتے ہیں
یہ کیوں ہے - یہ کیوں ممکن ہے !!

تقریر نمبر ۲۷

میری آواز، میرے شہر کی آواز ہے
میری آواز، میری نسل کی آواز ہے
میری آواز کی بازگشت نسل در نسل چلے گی
کیا سمجھ کے تم میری آواز کو شور کا نام دے رہے ہو
کس برتے پر تم میرے اندازِ تخاطب کو مجنونانہ کہہ رہے ہو
کس زعم پر تم بڑھتے ہوئے طوفانوں کو نظر کا دھوکہ
سمجھ رہے ہو

مَیں پیمبر نہیں ہوں
مَیں تو بس آج کو آنکھیں کھول کر دیکھ رہی ہوں

تمھاری وحشیانہ رعونتوں کی بو
پیسے کی ہوس کی شکل میں پھیل رہی ہے۔
تم لیموزین کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو
تاکہ شیشوں سے جھانکتی غربت کی سخت دھوپ
تمھارے سرجری شدہ چہرے کو مسخ نہ کردے
تمھیں تقریروں کے نمبر اب ازبر ہو گئے ہیں
تقریر نمبر ۱۰، غریبوں کو جگانے کی آواز ہے
تقریر نمبر ۱۵، عورتوں میں شعور بیدار کرنے کی آواز ہے
تقریر نمبر ۲۷، ادیبوں، دانشوروں کو مشورے دینے
کی آواز ہے۔

آواز، آواز، آواز
غل کسے کہتے ہیں
بے ہنگم آوازوں کے شور کو
کہ بے ربط تقریروں کے تموج کو۔
پتھر لڑھک رہے ہیں

صحرا میں پتھر پھینکو تو پتھر، ریت میں بے آواز دب جاتے ہیں
لیکن میری آواز پتھر نہیں ہے
بجلی ہے
جس کی چمک کے بعد، گرج کا شور
سب سُنا کرتے ہیں
تیز گرج ہو تو کانوں پہ ہاتھ رکھ لینے سے
طوفان رُک نہیں جایا کرتے ہیں

موسم کا حال پڑھ کر موسم کے بارے میں تقریر کرنے والے
گلی میں بہتی نالیوں کو دیکھنے کب آئیں گے
شجرکاری کے دِنوں میں انقلاب کا پودا لگا دینے سے
انقلاب کا جنگل اُگا نہیں کرتا ہے
لال رنگ دو آنے میں ڈھیر سارا آجاتا ہے
مگر یوں دو آنے کے رنگ میں رنگے دوپٹے
خون کا عکس نہیں بن سکتے
مجھے اگر یہ سب کچھ معلوم ہے

تو تمھیں کیوں معلوم نہیں
مَیں سچ کہتی ہوں
مَیں پیمبر نہیں ہوں
مَیں تو بس آج کو آنکھیں کھول کر دیکھ رہی ہوں۔

التماس

دروازوں میں سوراخ کر کے، ہم اندر جھانکتے ہیں
اندر، وحشی ہُوا بند ہے
ہم اسے بگولوں کی طرح ناچتے دیکھ کر
دروازوں پر لوہے کی سلاخیں گاڑ دیتے ہیں
اور خود اپنی بے بضاعتی چھپانے کے لیے
اپنی فتح کا جشن مناتے ہیں۔
ہم خود اپنے آپ کو تسخیر کر رہے ہیں
اوکھلی کی طرح خالی سروں
ٹوٹی پھوٹی فٹ پاتھ کی طرح
ٹیڑھے میڑھے دانتوں

اور خالی بوتلوں کی طرح

پھُوٹے جسموں کی بقا کے لیے

ہم ہَوا کا راستہ مسدود کر رہے ہیں۔

ہم مصنوعی دانتوں سے کاٹنے والے

اور مصنوعی بازوؤں کو شمشیر زن سمجھنے والے ہیں

NOSTALGIA کے مریض ہیں

ہم راتوں کو خواب میں چلتے ہیں

اور دن کو اعلان کرتے ہیں

کہ منزل دُور نہیں۔

سوکھے ہُوئے سیب کی طرح

ہماری تاریخ کی جُھریاں بھی اب زرد سے

خاکستری ہوتی جا رہی ہیں

آنکھوں کے حلقوں کی سیاہی رات بن چکی ہے

رات ـــــ کہ ہمارا مقدر نہیں تھی

گمرہی ـــــ کہ ہمارا مقدر نہیں تھی۔

ایک ہی کمر کے جڑواں بچوں کی طرح

یہ لوگ

ہماری دھرتی ماں کے پستانوں کو چچوڑ رہے ہیں

خُدا کے لیے یہ سوراخ بھی بند کر دو

تاکہ ہَوا

ایک دھماکے کے ساتھ باہر آجائے

تازہ ہَوا۔

دستِ غیب

وفاداروں کے ایک قبیلے نے، میرے کان میں آ کر کہا

لگان وصول کرنے کے دنوں میں

تم حقدار کی باتیں کیوں کرنے لگتے ہو

بھلا پانی، زمین کے وصال بنا، کچھ ہے؟

نہیں، تو پھر سورج کے رُخ پر آئینے کے عکس سے

کاغذ جلانے کا کیا فائدہ

سُنا ہے اب کی فصل میں

گندم کے دانے اور بھی سنہرے، اور بھی فربہ، اور بھی زیادہ ہیں

مگر اس مرتبہ ان کے اندر، مغز نہیں، ہَوا بند ہے

پھولے ہوئے سنہرے دانے

کہ جو کھوکھلے ہیں۔

اگر پیدا کرنے والا ناراض ہو تو

یوُں رزق کی نعمتوں کو بھی بانجھ کر دیتا ہے

میری آنکھوں کی پھٹی پتلیوں جیسے دانے

لگان بن کر، ہَوا میں تحلیل ہو جائیں گے

وفاداروں کا قبیلہ کہتا ہے کہ زبان کھولو گے تو

پہاڑ برف کے گالوں کی طرح اُڑیں گے۔

یہ تو لگان وصول کرنے کے دن ہیں

کیچڑ میں چلتے ہوئے ذرا پائنچے اونچے کر لو

کہ سفید پوشی کے خریدار تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں

وفاداروں کے قبیلے نے پُورے چاند کی رات کو

سُورج گہن کا نام دیا ہے

اس کو سچ مانوں تو اپنی بصارت

اپنے آپ کو جھٹلاؤں

میرے اندر تو، تصویر میں ٹھہرے

طوفان کا منظر دیکھ کر

جان لیوا طوفان کا خدشہ جاگ اُٹھا ہے
وفاداروں کا قبیلہ کٹتا ہے
ملامتی صوفی مست بنو
مصلحت کا ہاتھ تھامو
کہ یہی دستِ غیب ہے۔

اجازت دو

سب مہریں تسلیم
مگر کیا میں تم سے درختوں یا بادلوں کی طرح بھی
بات نہیں کر سکتی ہوں

اے میرے محبوب
مَیں تمھیں نہیں بچا سکی
مَیں تمھارے بارے میں کچھ بھی تو نہ کہہ سکی
مَیں کہ شاعر تھی
لفظوں کی شہزادی تھی
اب بھیک، مانگتی ہوں ان لفظوں کی
کہ جن میں آبرومندی کے دلاسے
اور حدّتِ فردا کے سندیسے ہوں
تم مجھے درختوں کی طرح ہمکلام ہونے دو گے

تو مَیں آسمان سے باتیں کرتی ہواؤں کو زنجیر کر لوں گی

تم مجھے بادلوں کی طرح ہمکلام ہونے دو گے

تو مَیں پیاسی لٹکتی زبانوں کا آسرا ہوں گی

اے میرے محبوب

اے میرے محبوب

تمھیں پتہ ہے

اُنھوں نے بیج کی نمو مار ڈالنے کے لیے

قبریں بھی کھود ڈالی ہیں

تمھیں پتہ ہے

اُنھوں نے دریاؤں کا رُخ موڑنے کے لیے

لاشوں کے پہاڑ بنا دیے ہیں

مگر میرے محبوب

مَیں کہ لفظوں کی شہزادی ہوں

مجھے شکتی دو

مجھے تم درختوں اور بادلوں کی طرح بات کرنے کی اجازت دو

اجازت دو!

سُن ری سہیلی

آسمان سے بارشوں کی صورت برستا پانی

پھول بنتا ہے، فصل اُگاتا ہے، کھیت بنتا ہے

مگر میرے آنسوؤں سے میرے غم کی کھیتی سیراب کیوں نہیں ہوتی ہے

میرے آنگنوں میں کھڑے گلاب کے پودوں کو

میرے آنسوؤں کا نمک، زہر بن کر کھا رہا ہے

اپنے آنسوؤں سے کپڑے دھونے والی نسلو!

مرادوں کا بہتا دریا آنکھوں کی جھیلوں سے پھوٹ پڑا ہے

آنکھوں کے گرد حلقے، رنگریز کے رنگے ہوئے سیہ ابرے کی طرح ہیں

تم اپنے آنگنوں میں گیلی لکڑیوں کی طرح

دن بھر دھوپ میں سُوکھ سُوکھ کر کوئلہ بن چُکی ہو

کوند آگ بن کر چٹختا ہے
مگر تم میں تو یہ حوصلہ بھی نہیں
ہاتھوں کی جھریوں اور آنکھوں کے حلقوں کی کمائی لیے
تم کیا چاہتی ہو ۔
پتھر سے پتھر ٹکرائے تو پھر بھی آواز سنائی دیتی ہے
ستاروں کی روشنی، ان کی خامشی کو آواز میں بدل دیتی ہے
مگر بولتے انسانوں کی گفتگو
آواز کو خامشی بنا رہی ہے
اخبار میں لپٹے ہوئے پھول، بہار کی نشانیاں کیسے بنیں ۔

آخری خواہش

آج تو میرے کپڑے بھی پانی کی طرح بھاری ہیں
موت کا کاجل آنکھوں میں لگانا
اور آنکھوں میں پٹی باندھ کر تار پہ سائیکل چلانا
ایک جیسا عمل ہے
زندہ رہنے کا عمل
مردہ زندگی کی دریوزگی سے
انگور کی طرح رنگ بدل کر دو آتشہ ہوتا
پگھلی ہوئی موم بتی کی روشنی کے آخری وار
کی طرح کاری ہوتا ہے
بلی اپنے شکار سے

پہلے کھیلتی ہے، پھر کھاتی ہے
آج جب کہ میرے کپڑے پانی کی طرح بھاری ہیں
میری بنتی سُنو
مجھ سے کھیلنا بند کر دو
مجھے کھا جاؤ

چشمِ زدن

اتفاقات دیکھو
ہم دونوں ایک ہی لفٹ میں تھے
بس ہم دونوں تھے
ہم نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور بس
قُربت لفظ کے بغیر مکمل ہو گئی
وہ پانچویں منزل پہ اُتر گیا
اور مَیں اوپر چلی گئی
جانتی تھی کہ اس سے پھر ملاقات نہ ہو سکے گی
یہ بھی جانتی تھی کہ اگر مَیں نے اس کا تعاقب کیا
تو مَیں اس کے راستے پہ مُردہ فرد کی طرح ہوں گی

مجھے یاد ہے

اس کے خیالات انگور کی مانند

اور جذبات شراب کی طرح تھے

مَیں رات بھر اس لذّت سے سرشار رہی

مگر صبح ہوتے تلک

خالی بوتلوں اور اُجڑے سگرٹوں کی صورت میں

میرا جسم کمرے پہ محیط تھا ۔

جاپانی شاعر جی رو - ہیرا کی

"موت اور مَیں"

جب مَیں ٹائیفائڈ سے مرنے والا تھا

مَوت میرے قریب آئی ، اور سرگوشی کرتے ہُوئے بولی :

اے میرے دیرینہ دوست ! کہو کیسے ہو ؟

اب وقت آگیا ہے کہ تم میرے ساتھ چلو"

مَیں نے اس کے بُلاوے کو قبول کیا اور کہا :

"ہاں ، اس بُلاوے کا شُکریہ !

مگر مجھے تمھارے ساتھ چلنے سے پہلے

اس مکان کا کرایہ ادا کرنا ہے

اگر تم وہ کرایہ میری جگہ دے دو

تو مَیں چلنے کو تیار ہوں"

پھر موت نے کہا :

" اُف خُدایا !

میرے شب و روز بھی آج کل کس قدر خراب ہیں

میری جیب میں تو اس وقت ایک پیسہ بھی نہیں

اے ابلیس ! یہ کیا مصیبت ہے ؟ "

اور یہ کہتے ہُوئے جھنجھلا کر ، مَوت واپس چلی گئی
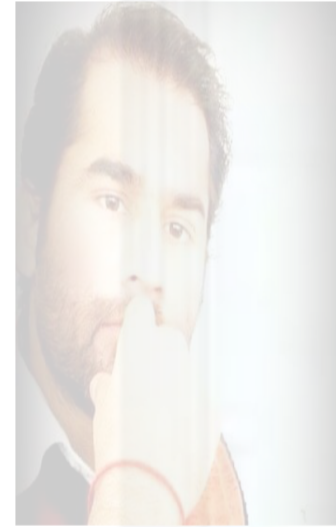
بارش میری طرح ہے ، تم پگھل کر ہی مجھ میں مل سکتے ہو

کلیئرنس سیل

سُنو ! اے بانوئے گُفت آشنا نیا قصّہ
نکل کے آئی ہے لیلیٰ حیا کے محمل سے
سُنا ہے مسئلہ درپیش ہے چناؤ کا
ہو آبنوسی بدن ، شاخسار باہنیں ہوں
کُشادہ ، پیاسی ، طلبگار ، بے وضو آنکھیں
وقائے شب کے قرینے سے آشنا آنکھیں
طلوعِ دستِ مسیحا کی شکل میں پلکیں
جُھکیں تو سایۂ ابرِ سیاہ ، یاد آئے
مہکتے ہار چمکتی گداز باہنوں کے
نثار ہوں نئے مہماں کی دلنوازی کے

عروسِ وصل کو فردوس آشنا کر دیں
زباں میں ذائقۂ وصل یوں رچے شب بھر
کہ ختم ہو نہ یہ قربت کی ساعتوں کی سحر
بدن کے روپ میں ، مے کی سراحیوں کی طرح
خمارِ شب میں ڈھلیں اور بھی گُلاب بنیں
زر و جواہر و لعل و گُہر کا عرق پئیں
نصیب جاگیں گے دوشیزگانِ نورس کے
نئی سحر کے پیمبر جگا رہے ہیں اُنھیں
چلی بھی آؤ ، بُلاتے ہیں ظلِّ سُبحانی !

عروسِ وصل کو فردوس آشنا کر دیں
زباں میں ذائقۂ وصل یوں رچے شب بھر
کہ ختم ہو نہ یہ قربت کی ساعتوں کی سحر
بدن کے روپ میں، مئے کی سراحیوں کی طرح
خمارِ شب میں ڈھلیں اور بھی گُلاب بنیں
زر و جواہر و لعل و گُہر کا عرق پئیں
نصیب جاگیں گے دوشیزگانِ تورس کے
نئی سحر کے پیمبر جگا رہے ہیں انھیں
چلی بھی آؤ، بُلاتے ہیں ظلِّ سُبحانی!

کتنی چاہت والے لوگ ترے دیوانے

تقدیس کے لفظ سے ہاتھ رچا کے
پیروں میں قیدی کی سی بیڑیاں ڈال کے
اسے حیا کا نام دیا ہے
کتنا سُندر، کتنا پیارا نام ہے
ہیرے کی کنّی جیسا
خنجر کی چمکتی لہراتی انی جیسا
وہ کہتے ہیں
اس سے زیادہ اور تجھے کیا چاہیے گُڑیے
مرمر جیسی چمکتی صاف، بلور دیواریں
تیری حفاظت کی خاطر، آراستہ و پیراستہ ہیں

بجلی کی چمک کے بعد اور بادل کی گرج سے پہلے

تھمے جو دل کا فشار
احوالِ خواب لکھوں
وہ باب لکھوں
ادھورے لفظوں کی سولیوں پہ
کہ جن کی مہکار، پا بریدہ
کہ جن کی آنکھیں ہیں خوں چشیدہ
وہ وار لکھوں
جو بیتی صدیوں میں، آنے والے ہزار سالوں میں
میرے تیرے گلو میں پیوست، نیلے ترکش
فراق رُوئیں، ملال لکھیں
رفاقتوں کا جمال لکھیں
وہ پھول بانٹوں
کہ جن میں تیرے پلٹ کے آنے کی خوشبوئیں ہوں
کہ جن میں میرے گلے سے لپٹی، تری نگاہوں کی دلہنیں ہوں
یہ حسرتیں ہوں
اجازتوں کی طناب ٹوٹے
تو کھُل کے برسیں
بکھر کے چاہیں
جھلس کے پھر زندگی کو ترسیں
یہ آرزو ہے کہ کھُل کے برسیں۔

تم سے!

اتنی گرمی

میرا تن اندر سے بھٹی

باہر ۱۱۷ ، ۱۲۰ کی گرمی

مہندی، لمحے بھر کو ٹھنڈک

بیچ ہتھیلی آن جگائے

پانی پنڈے پر ڈالو تو

آتی جاتی ٹھنڈک

روئیں روئیں میں

ٹھہر ٹھہر کے چین سجائے

ٹھنڈے پیٹ اور نرم کٹوروں

بیچ رکھے ہاتھوں میں جاگے

دھوپ میں جیسے گیلے کپڑے

رات میں جیسے خواب کا نشہ

پھیلے پھیلے اور بھی پھیلے

ان چھوئی کلیوں کی دودھ سفیدی

جاگتی، بند ہوتی آنکھوں کی صورت

پھول میں ڈھلنے کو تڑپے تو

فاختہ جیسے بازو کھولو

انگڑائی کی گرمی تم سے نئی چنبیلی مانگ رہی ہے

اعتراف

سہمی ہوئی دبکی چڑیو!
یہ تم ان سہمے لرزتے ہاتھوں سے کیوں خوفزدہ ہو
تم تو پھر بھی انجانے میں جال میں پھنس کے
آزادی کی لذت سے محروم ہوئی ہو۔
ہم تو خود ہی اپنی زبانیں کاٹ کے
سُرخروئی کے احراموں میں پلٹے
سجدہ گزار ہیں، محوِ ثنا ہیں

سہمی ہُوئی دبکی چڑیو!
تم کھیتوں میں دانے چُگنے آئی تھیں
اپنے لیے اپنے ہاتھوں سے رزق بنانے آئی تھیں۔
اپنے ہاتھوں، اپنے رزق کی چاہت
خوف کو کھا جاتی ہے
آنکھوں میں بھی ایک چمک سی بھر جاتی ہے

سہمی ہوئی دبکی چڑیو!
جال میں قید ہوئیں تم کیسے
صدیوں پُرانی کہانی ہے
یہ تو رسمِ زمانی ہے
ہم کہ جو صیاد تھے، خود ہی قید ہوئے
ہم کہ جو شاد تھے، قسمتِ صید ہُوئے
ہم تو خود ہی اپنی زبانیں کاٹ کے
سرخروئی کے احراموں میں پلٹے
سجدہ گزار ہیں محوِ ثنا ہیں۔

رات آتی ہے

دو بستر

ایک ہی کمرے ایک چھت کے سائے میں
ایک پہ بہتا نیند کا ساگر
ایک پہ بے خوابی کا صحرا
ایک پہ نرم ہوا کے جھونکے
ایک پہ لُو سے گرم تھپیڑے

دو بستر

ایک پہ تکیے کی آغوش کا گہرا بادل
ایک پہ شکنیں، اُمڈے دریا جیسی
ایک پہ خواب کی دیوانی اور دہکے ہونٹ
ایک پہ آنکھ کی ویرانی اور سوکھے ہونٹ

دو بستر

ایک پہ کروٹ، دریا ملے سمندر میں
ایک پہ کروٹ، نکلے آگ کہ جیسے پتھر میں

دو بستر

بیچ نہ ساحل
اور نہ صحرا
پھر بھی ڈونگا لمبا پَینڈا۔

بہلاوا

ڈر بالک کا یا ہردے کا
دونوں میں خوں رنگ اندھیرا
ہونٹوں پہ بھی سرد سویرا
بات بھی کرتے ہم ڈرتے ہیں
تجھ سے ملتے ہم ڈرتے ہیں
سانس بھی لیتے ہم ڈرتے ہیں
کیسی محبت، کیسی چاہت
پھول بھی چنتے ہم ڈرتے ہیں
جھانک کے دیکھیں ہمسائے میں
کیا ڈر دیو وہاں بھی
اپنے پیلے دانت گاڑ کر چھوڑ گیا ہے!
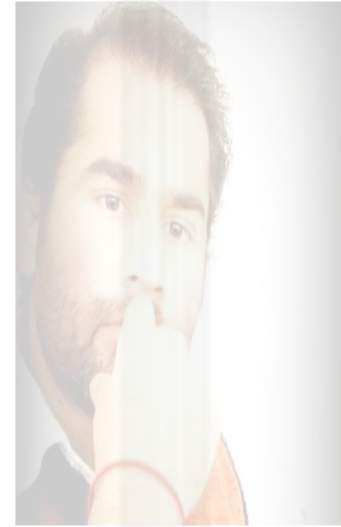
ہمزاد سے

ذات کے مقتل میں جینے کی طرح
مرنے کی تدبیریں
ہنسی کی کھوکھلی یلغار میں
بہہ جائیں تو
پھر نت نئے فقروں سے
محفل کو سجانے کی پرانی سرگزشتوں کو
نئے انداز سے روشن کرو
زندگی روشن کرو
ایوان و در روشن کرو
آنکھ میں لوشن کی تحریروں سے

اپنی پیاس کے صحرا میں
تو آراستہ جذبوں کو دکھلاؤ
سرابوں کے ہیولوں کے نشاں۔
یوں نہ ہو
کہ غم بھی خوشیوں کی طرح
لمحوں کی عزت پا کے رخصت ہوں تو پھر
نوشتن کی تحریریں بھی
گھل جائیں پگھلتے درد کی یلغار میں۔

کیتھارسس

مَیں ترے خوابوں کی دوست تھی
یاد ہے تو نے میری بانہوں میں
باتوں کے گجرے پہنائے تھے
تُو نے میرا جھوٹا پانی پی کے
میرے ہونٹ سنہرے چمکائے تھے
تیرے گھر میں مَیں آئی تھی
حرف بھی وصل کے پیرائے تھے۔

کچے پیالے پہ مُنہ رکھ کے
مَیں نے پیاس کی خوشبو سونگھی
اوس نے دید سے رشتہ باندھا

رس نے رنگ کی چولی پہنی
گھر میں خواب کی شاخ لگا کے
سوچا تھا دیوار ڈھکے گی
بیل عمریا چڑھ جائے گی

کتنے میٹھے خواب تھے جن کا
ذکر کرو تو ہونٹ کسیلے
کتنے انوکھے رشتے تھے وہ
خواب سے سچے ، خواب سے جھوٹے

جینا مرنا ڈھونگ پُرانا
بچھڑ کے تجھ سے وہ بھی جیے گا
تو بھی ہنسے گی زندہ رہے گی
اس کے گھر بھی سبھا سجے گی ۔

چوبِ خشک اور آگ

مرے عجز کو میرے خُدا کے سوا بھلا جانے کون
مرے شوق کو میرے گنہ سے سوا بھلا جانے کون
بھلا جانے کون تجھے اور مجھے
پہچانے کون تجھے اور مجھے
پہچان کی منزل کوئی نہیں
کوئی سب کچھ جان کے انجانا
کوئی سب کچھ دیکھ کے بیگانہ ۔
جسموں کی ہیئت تو سب کی ایک سی ہے
اندر بھلا کس نے جھانکا ہے
اندر تو گھور اندھیرا ہے

ہاں سب کا باہر ایک سا ہے۔
ذرا جھانکو تو
جسموں کے دریچے دیکھو تو
آنکھوں کی پلکیں ایک سی ہیں
آنکھوں کے ڈورے ایک نہیں
باہنیں تو سب کی ایک سی ہیں
باہنوں کا جھولنا ایک نہیں
ہاتھوں کی گرمی ایک نہیں
باتوں کی نرمی ایک نہیں
کبھی تم نے تلوے دیکھے ہیں
کچھ تلوے چاند کے ٹکڑے سے
کچھ تلوے کنکر ذرّے سے
کچھ ہاتھ ملائم رُوئی سے
کچھ ہاتھ ولدّر مٹی سے
پر دیکھے کون اِسے، پہچانے کون۔
مرے شوق کو، میرے گنہ سے سوا بھلا جانے کون!

شادی کی بیسویں سالگرہ
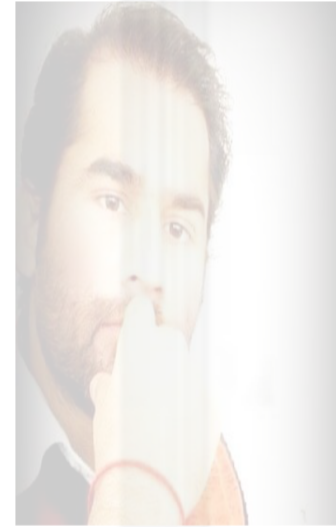
کہتے ہیں لمحہ بیتے تو رنگ، مہک مر جاتے ہیں
کہتے ہیں دیوار گرے تو نقشِ گزشتہ مٹتے ہیں

ہم نے تپتی رات بھی پہنی
چڑھتے دن سا رُوپ سہا
شہد سا عشق الاؤ پہنا
برف سا قہر اور ظلم پیا
ہم نے ہجر کی تاویلوں میں
خوابِ رفاقت راکھ کیے
ہم نے رزق کی زنجیروں میں
شب افسانے گوندھ دیے

میرے ساتھ کھڑے ہیں آج
تیری عمر کے بیس برس
زخم کے آتش دانوں میں
کیوں راکھ بھری ان برسوں کی
کیوں زعمِ رفاقت ریت بنا
کیوں چاند میں تیرتی مچھلی کا
خواب ہے اب تک خواہشِ جاں
کیوں سوکھے پتّوں کے گھر میں
بیتاب ہُوا ہے شعلۂ جاں
مرے چہرے پہ تری خوکندہ
مرے دل میں کاغذ کی چڑیا
مرے گھر پہ غم کے ورق لگے
مرے بالوں میں چاندی دریا
مَیں بیس برس کی لہروں میں
کیوں ڈوب گئی - کیوں ڈوب گئی

دوسری مَوت

تم کہتے تھے - مَیں ہوں نازک پھُول کی صُورت
جسم مرا پھولوں سے لدی ، جھاڑی کی صُورت
چال مری ہے بادِ بہاری
آنکھ مری انگور کی پیالی
اور مری باتوں میں اصلی شہد کی خوشبو
اصلی باتیں ، سچّے جذبے
گہرے پانی
جس کی تہ میں ہیرے موتی
جس کی تہ میں ریت نہ مٹی
جس کی روانی ، شرطِ جوانی

ہر لڑکی ایسی باتوں سے خوش ہوتی ہے۔

وہ وعدوں کی گرہ میں اُلجھی

عہدِ وفا کی رسّی پکڑے

ٹھنڈے گھر کی چھت کے نیچے

ریت کو پانی کا مس دے کر

کورے برتن کی صورت میں

لمس ملے تو بج اُٹھتی ہے

FATHER COMPLEX

تمھارے گہرے گھنے چمکتے سفید بالوں میں

میری خواہش کی چاندنی کی اُداس صبحیں

گداز پائیں

مَیں رُوٹھ جاؤں تو وہ منائیں

مَیں جانکنی کا نقاب اوڑھوں۔

تو دِل میں جھانکیں

مجھے ستائیں

یہ تیرے بالوں کی صبحِ سادہ

مجھے سکھائے

سفید بادل، زمیں کی پیاسی زباں کی

حدّت مٹا نہ پائیں

تمھاری پیاسوں کی شانت شاخیں
جُھلس نہ جائیں ۔

مرے لیے شرطِ جاں عجب ہے
پلٹ کے دیکھوں
تو آگ رونق بنی ہوئی ہے
جو آگے جاؤں
تو بادلوں سے نکلتا سُورج
پتہ نہ دے گا
وہ آسماں جو ہمارے کمرے کی کھڑکیوں سے
ہمارے جتھے کا جھانکتا ہے
یہ پوچھتا ہے
تمھاری قسمت کے چاند گھٹنے کے دن
کبھی ختم ہوں تو سوچو
زمیں کی کروٹ میں
زندگی کی خمیدہ دیوار
گر نہ جائے ۔

ترسی ہُوئی حدّت کے دن

وہ دن گئے
وہ خوبصورت جذبہ و حیرت کے دن
خواب رنگ بیداریٔ خلوت کے دن
جسم کی ہر خیرگی کو جانتے
محتاط رشتوں کے صدف میں جسم کی ہر
رگ کے آبی رنگ کو پہچانتے
مضطرب ترسی ہُوئی حدّت کے دن
اب کہاں
وہ بادلوں کے جھرمٹوں میں آسماں چہرہ
کہاں وہ شاخسار

نودمیدہ پھول پھل،

جن کی باتوں کا سنگھار۔

اب کہاں وہ گھر کہ جن کے صحن میں

لڑکیاں تازہ چنبیلی کے حسیں گجرے پہن کے

خواب کی چادر بنیں

اب کہاں وہ بام، جن پر کہنیاں ٹھہریں

کریں سرگوشیوں میں بات ایسے، لڑکیاں

نیچے گلیوں میں تپتے جسموں کے لڑکے ٹھہر کے اوپر کو دیکھیں

اور پھر اس زلف کے سائے کو منزل جان لیں

اب کہاں وہ گھر

کہ جن کی محبّت سے بنی ہوتی تھی۔

وہ گلیاں نہیں

عطر کی خوشبو ہوا کے رنگ میں

عریاں پھرا کرتی تھی۔

بے آہنگ و رنگ

وہ دن گئے

پر کہاں!

جلتی ہوئی سانسوں بتاؤ

انتظارِ آفتاب و گل

طلسمِ غم نمائی کیوں بنا؟

وحشتوں نے راستے کی گرد بن کر

میرے مہتابِ محبّت کو بھی گدلا کر دیا!

زخمی پرندے کی چیخ

دیکھ ری ہماری ماں!
ہم نے دیش رنگ کو
سہاگ رنگ کر لیا
ہم نے دیش رُوپ میں
بھی رَین رنگ بھر دیا
ہم نے اپنے آنسوؤں کو
پھُول رنگ دے دیا
ہم نے اپنے آنچلوں کو
رات رنگ کر دیا۔
دیکھ ری ہماری ماں!

ہم نے تیری چھاتیوں کا دودھ بھی پیا نہیں
ہم نے تیری کھیتیوں کا رزق بھی لیا نہیں
ہم نے تیرے پانیوں کا ذائقہ چکھا نہیں
ہم نے تیری پستیوں کا قرض بھی سہا نہیں
دیکھ ری ہماری ماں!
تیری عزتوں سے کھیلنے کا نام
ہے اگر بہادری، تو ہم کو بُزدلی قبول
تیری کھیتیوں کو بیچنے کا نام
ہے اگر تونگری، تو ہم کو عُسرتی قبول
دیکھ ری ہماری ماں!
ہمیں تو اپنا دُودھ بھی نہ بخشیو
کہ ہم نے دیش رنگ کو
سہاگ رنگ کر لیا۔

ہڈ بیتی

میری ماں
دھرتی سمان ، دھیرج دھیرج
بن محسوس ہی چلنے والی
میری ماں
پانی سمان ، ہولے ہولے
غم کی چٹانیں کاٹنے والی
میری ماں
چندا جیسی ، بن گھبرائے
سب گھٹائیں سہنے والی
میری ماں

برکھا جیسی ، بن بتلائے
اپنا آپ گھلانے والی
میری ماں نے
دن رنگوں کو چھاجوں برستے دیکھا تھا
میری ماں نے
شب خوابوں کو زینہ چڑھتے دیکھا تھا
اس کے ہاتھوں کے پیالے میں
سیر بھر گیہوں بھر جاتے تھے
اس کی بانہوں کے گھیرے میں
اس کے بیٹے چھپ جاتے تھے
میری ماں
ہم تیری چھایا ، کیسے کلجگ کیسے خوار
سانسیں تھکی تھکی اور بیمار
ہمارے سائے کھیتی کھیتی روپ اجاڑیں
زخم اگائیں
راہ نہ پائیں

جہاں بھی جائیں ۔

ہم تیرے ہاتھوں پلے ہیں ماں
پر تیرے جیسے گُن کیسے ہوں
پاپ ہمارے پُن کیسے ہوں ۔

پورٹریٹ

اُداسی جنگلوں کی
گفتگو بھی جنگلی لوگوں کی
ہر چہرے پہ خود آورد غم کی چھاپ
اور ہاتھوں میں تصویروں کے ڈھانچوں کے
دُھلے اندھے ورق ۔
بے خواب آنکھوں کے دریچوں سے جھلکتی جانکنی کے سُرخ ذرّے
دم بدم گھٹتے ہوئے ماحول کی زردی
ورم سے پھولی ، پیَروں کی رگیں
خاموش ویراں رات کی صُورت
سیاہی کو سفیدی میں بدلتے بال

اُلجھی گفت گو،

خاموش اشکوں کی لڑی،

بے کار تمہیدیں،

تصنّع کی تہوں میں ایک ہی فقرہ

چلو اب مان بھی جاؤ!

کُنویں کی آواز

وہ وہم تھا

پر یہ حقیقت ہے۔

جاگیریں تھیں تو کہتے ہیں، ظلم بھی تھا

تعزیریں تھیں تو کہتے ہیں، نظم بھی تھا

تعزیریں مٹیں، جاگیریں مٹیں۔

مٹی کی تقدیر کا جو بھی مالک تھا

وہ اس کا سچا مالک تھا

ہو گا

ہاں وہم نہیں، سچ ہو گا

چھوڑو۔ بوجھل بحث کے ذرّے

آنکھ میں سُرخی بن کے خون رُلاتے ہیں

رات جگاتے ہیں

شُبھوں کی گرد بہت اُڑتی ہے

سڑکوں پہ پگھلے تارکول کی صورت

خوشامد ، اُبل اُبل کے

قدموں سے خود ہی لپٹ رہی ہے

شبہے اور خوشامد ، مِل کر کیا بنتا ہے

نئے زمانوں کا آدرش یا کیا بنتا ہے

یہ مت پوچھو ، یوں مت دیکھو

جاگیروں کے رنگ نئے ہیں

جیتی جاگتی جاگیروں کی کُھلی کچہری

وہم ہے یا کہ حقیقت ہے ۔

آمنے سامنے

اے لہُو

مَیں ترے کون سے انداز کو جھٹلاؤں گی

مَیں نے دیکھا ہے کہ کانٹے کی چُبھن سے بھی ترا

دروازۂ لب کُھلتا ہے

مَیں نے دیکھا ہے کہ افزائشِ انساں سے ترا

رنگ فزوں ہوتا ہے

مَیں نے دیکھا ہے ترے رنگ کے گلزاروں کو

ذبح کے موسمِ برفاب میں

تطہیر کے سیلاب میں

خاموشش رواں !

مَیں نے عنّاب سے آہو کا چلن دیکھا ہے
جنگ کے آتشیں میدانوں میں
رنگ کے سرمگیں ایوانوں میں

اے لہو !

مجھ کو ترے گرم تنفس کی قسم
مَیں نے دیکھا ہے تجھے پرچمِ جاں بنتے ہُوئے
قرضِ ایماں تو کبھی نوکِ سناں بنتے ہُوئے
مَیں نے اے لعلِ بدخشاں
تری حرمت کی ضیا دیکھی ہے
تیری تحریر سے تسکینِ دُعا دیکھی ہے
پر مرے ہونٹ ترے لہجۂ آئندہ
کی خوشبو سے ہراساں کیوں ہیں
طائرِ خواب
ترے رنگ پریشاں کیوں ہیں
ہاں مرے لال
ترا ستیاں سوال

امتحاں میرے لہُو ، میرے جواں بیٹے کے خوں کا ہے یہاں ۔
ہم اذاں دے کے بُلاتے ہیں
بگل اور بجاتے ہیں کہ آئیں
وہ سرافراز
جنھیں بازیٔ جاں
کرتبِ امروز لگے ۔
ہاں مگر اپنے لہو
اپنے جگر گوشے کو
اس قلزمِ خوں خیز کی آنچوں سے بچانے کو
لہو روتی ہوں
کشتِ اُمید میں خوں بوتی ہوں
اے لہُو :
مَیں ترے کون سے انداز کو جھٹلاؤں گی

پہلی برسی پر

عدم آباد کی مٹی سے سجاؤ
یہ در و بام
کہ مَیں نے غمِ ہستی سے
تعلق کی گزرگاہ کی
سب حاشیہ آرائی،
تہذیب کی وادی سے پرے
درد کے پُر ہول دھندلکوں کی
سبک سیریِ موہوم کی یلغار سے آگے
کسی انجانے سفر کو رہِ مقصود بنایا،
تمھیں یہ رُخ بھی دکھایا!

کہ مجھے یاد ہے
مَیں نے ہی کہا تھا،
تمھیں تصویرِ تمنّا کا ہر اک رنگ دکھاؤں گا،
ذرا سوچو تو
یہ بھی تو سیریِ ہستی کا تماشہ ہے
کہ مَیں رنگ سے محروم ہوں
اور پھول، ہر اک رنگ کے بکھرے ہیں
مری قبر، مری شامِ تعلق کے قریں۔
مانگ میں صبح کی تحریر سجاتے ہوئے
یہ ذہن میں رکھنا
کہ تمھیں دیکھتے رہنے کی تمنا لیے
اِک شخص
تعلق کی گزرگاہ کی خواہش میں ہے
اب خاک بسر
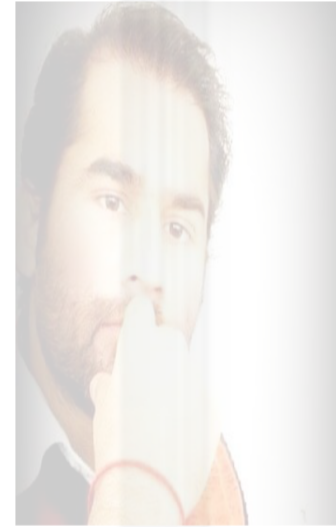
اے کاتبِ تقدیر لکھ!

میری جیسی ماں نے جنی تھی
ہیر کہ جس نے زہر پیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی
قرۃ العین جو کہلائی
جس نے علم کے سوکھے پیالے کو تن زیب کیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی
میرا بائی متواری
جس کے عشق کی گہری پیاس کو
پیمانوں نے لوٹ لیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی

نور جہاں، غم دیوانی
جس کے مزار پہ پھول نہ پتی
جس نے فراق کا زخم سہا،
میری جیسی ماں نے جنی تھی
قوس قزح سی قلوپطرہ
جس کے درد کو لذت کہہ کے
جب چاہا مطعون کیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی
نوری بستی اور سوہنی
اپنا آپ مٹا کے جنھوں نے
شہرِ وفا آباد کیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی
لمبی کھجور سی شہزادی
جس کو تیغ کی آنچ نے جھلسا
جس نے جیون وار دیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی

مجھ جیسی بھی کوکھ جلی
قطرہ قطرہ زندہ رہ کر
جس نے موت کو مار دیا

مَیں کون ہُوں

موزے بیچتی جُوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں
مَیں تو وُہی ہوں جس کو تم دیوار میں چُن کے
مثلِ صبا بے خوف ہوئے
یہ نہیں جانا
پتّھر سے آواز کبھی بھی دب نہیں سکتی

مَیں تو وہی ہوں رسم و رواج کے بوجھ تلے
جسے تم نے چھپایا
یہ نہیں جانا
روشنی گھور اندھیروں سے کبھی ڈر نہیں سکتی

مَیں تو وُہی ہوں گود سے جس کی پھول چُنے
انگارے اور کانٹے ڈالے
یہ نہیں جانا
زنجیروں سے پھُول کی خوشبو چھُپ نہیں سکتی

مَیں تو وہی ہوں میری حیا کے نام پہ تم نے
مُجھ کو خریدا مُجھ کو بیچا
یہ نہیں جانا
کچے گھڑے پر تیَر کے سوہنی مر نہیں سکتی

مَیں تو وُہی ہوں جس کو تم نے ڈولی بٹھا کے
اپنے سر سے بوجھ اُتارا
یہ نہیں جانا
ذہن غلام اگر ہے قوم اُبھر نہیں سکتی

پہلے تم نے میری شرم وحیا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی
میری ممتا ، میری وفا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی

اب گودوں میں اور ذہنوں میں پھولوں کے کھلنے کا موسم ہے
پوسٹروں پر نیم برہنہ
موزے بیچتی جوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں

عرصۂ عشق مختصر مگر اس کو بھلانے میں عمر بیت جاتی ہے

کہتے ہیں مَیں سوتے سوتے چلتی ہوں
ہنستا دیکھ کے لوگوں کو رو دیتی ہوں

خواہش میرا پیچھا کرتی رہتی ہے
مَیں کانٹوں کے ہار پروتی رہتی ہوں

گرمی کی بیکار دوپہروں میں اکثر
جلتی ہوئی زمین کی دھڑکن سنتی ہوں

جب میرا چلنے کو جی نہیں چاہتا ہے
پاؤں کی دیوار بنا کے بیٹھتی ہوں

کھال پرانی ہاتھ سے گرتی رہتی ہے
بات پرانی پیٹ میں پالتی رہتی ہوں

دیکھ کے باہر منظر نئے بُلاوے کا
مَیں کھڑکی کو اینٹوں سے چُن دیتی ہوں

فاختہ بن کے اُڑنے کو جی چاہتا ہے
پَر آ جائیں تو گھر میں چھُپ جاتی ہوں

جاگتے میں لکڑی کی طرح سُلگتی ہوں
اور سوتے میں چلتی ہَوا سے لڑتی ہوں

اپنا نام بھی اب تو بھُول گئی ناہید
کوئی پُکارے تو حیرت سے تکتی ہوں

❋
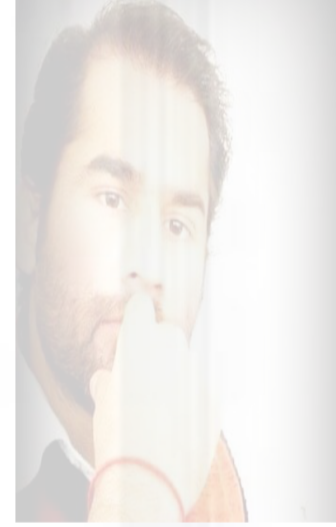
پلٹ کے آئے تو دیوار و در نے حیرت کی
ہمارے ہاتھ میں تحریر تھی ہزیمت کی

کلنک اپنے مقتدر کا رات ٹھہرا تھا
بسا لیا اسے پھر گھر میں یہ مروّت کی

مثالِ گُل ترے پیکر سے رنگ جھڑتے تھے
مہکتی شام نشانی تھی تیری قُربت کی

مکان گونجیں گے مثلِ اذاں خرابوں میں
لہُو جگائے گی آنکھوں میں شام، غربت کی

تجھے تو شوقِ جراحت نے مضطرب رکھا
بتا تو اس میں خطا کیا تھی ساری خلقت کی

زمیں پہ ٹوٹے ہوئے گھونسلے میں خون بھی تھا
چھپا لیا، در و دیوار نے مروّت کی

مزا تو یہ ہے کہ جب دوست نام پوچھیں گے
لگے گی چُپ ترے ہونٹوں کو خوں کی رنگت کی

زباں پہ لفظ کی آہٹ سے ہونٹ جاگے ہیں
یہی تو ایک نشانی ہے خوں کی حدت کی

✻

اب بات کرو بس آئینے سے
رستہ نہ ملے گا بھاگنے سے

جیبوں میں بھرو سکوں کی دولت
ٹیکوں سے لپٹ کے جاگنے سے

بدلے گا ورق ورق زمانہ
بس ایک تمھارے چاہنے سے

پہنے گی زمین میری رنگت
مٹی کو خلا میں ٹانکنے سے

پتھر میں لہو چمک اُٹھے گا
دیوانے کے ہونٹ کاٹنے سے

چہرہ ہے نقاب میں بھی عُریاں
غم اور چھُپا کے باندھنے سے

آنکھوں پہ لگا لو چار آنکھیں
منظر نہ ہٹے گا سامنے سے

اُترا ہے مرا وجُود شاید
پھُولوں کے اُداس آلنے[۱] سے

---

[۱] پنجابی میں چڑیا کے گھونسلے کو کہتے ہیں۔

✺

مکیں سے خالی مکانوں پہ سخت پہرا تھا
ہُوا بھی کانپ گئی اس قدر اندھیرا تھا

ہم اپنے گھر میں پلے سرد مہریوں کے تلے
گھروں سے نکلے تو زہرابِ لب کا ڈیرا تھا

مری ہنسی کے صنوبر سے ڈر گئے وہ لوگ
کہ جن کے دل میں شبِ زہر کا بسیرا تھا

مری تلاش میں ٹھہرا ہُوا تھا دریا بھی
سجائے تھال میں دُھوپیں، کھڑا سویرا تھا

سجا کے ریت کو ہاتھوں پہ لطف لیتے ہیں
وہ جن کو مَیں نے کھُلے پانیوں میں گھیرا تھا

زیاں ہے ذائقۂ جاں، زیاں ہے شب خوابی
پلٹ کے آئے تو دیکھا کہ زخم گہرا تھا

تمھیں تو یاد ہے سولہ برس کی وہ تابید
نزاکتیں بھی عجب تھیں بدن چھریرا تھا

٭

ہری تھی شاخ تو بیٹھا نہ اس پہ پنچھی کیوں
لگے ہے اُجڑے ہوئے خواب سی یہ بستی کیوں

مجھے خبر ہے مرے گھر میں سانپ آنکھیں ہیں
وگرنہ غم کے خزینے چھُپا کے رکھتی کیوں

تجھی سے تہمتِ عالم کی نسبتیں موسوم
تجھی کو کہتے ہیں سب لوگ سب سے اچھی کیوں

خزاں کو میرے ہی خوابوں کے نام کیوں لکھا
زمیں نے اپنی یہ دولت مجھی کو سونپی کیوں

مرا وجود بھی کیا، کچھ خُدا سے ملتا ہے
سوال و شک سے ہے بیگانہ میری ہستی کیوں

یہ اشک سلسلۂ جاں کے بولتے لب ہیں
چھپا کے دولتِ نایاب، تم نے رکھی کیوں

وجود اپنا کسے، کب عزیز تھا ناہید
ہوئی ہے شام سے پہلے ہی شام گہری کیوں

✺

بہل بھی جایا کرتے ہیں بہلانے سے
بات بنے گی یونہی بات بنانے سے

آنکھیں خواب دکھا کے روٹھا کرتی ہیں
زخم چھپے گا لپ سٹک نئی لگانے سے

جھوٹا کھایا اور جھوٹے برتن دھوئے
ہنس کے عمر گزاری یوں انجانے سے

ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ کے پھر جُڑ جائے گی
دیواریں ہل جائیں پردہ ہٹانے سے

اب کچھ کچھ سمجھی ہے دُنیا کو ناہید
اب کی بار نہیں مانی بہلانے سے

قریۂ ضبط میں تنہا ہوں میں
خواب کے جسم میں تیشہ ہوں میں

تازگی ہوں درِ گویائی کی
گفتگو کے لیے جلوہ ہوں میں

منتشر ہوں پھٹے کاغذ کی طرح
شاخِ گل تیرا ہی ثمرہ ہوں میں

بے سبب ہوں ترے گھر میں موجود
کوئی کھویا ہوا بچہ ہوں میں

مجھ سے بچھڑے گا تو رسوا ہو گا
میرے دشمن ترا پردہ ہوں میں

خود کو پہچان لو مجھ سے مل کے
شہر کا ایک ہی رستہ ہوں میں

جھانک لو غار ہوں جالوں سے تنا
دیکھ لو طاقِ تماشا ہوں میں

کر لو تسکینِ تمنا تم بھی
بات کرنے کو تو زندہ ہوں میں

میں بہت تیرے شناسا لیکن
تیری دہلیز پہ تنہا ہوں میں

جان لو قوتِ امروز ہوں میں
دیکھ لو حدتِ فردا ہوں میں

✻

زمیں کی ہم سخنی، قسمتِ صبا بھی نہیں
رہیں کہاں کہ یہاں معتبر ہُوا بھی نہیں

غم و ملال کے آنگن میں پیڑ جلتے ہیں
جُھلس کے جائیں کہاں ٹُوٹے بے ادا بھی نہیں

مکاں ہیں بے در و دیوار، بے ستوں در و بام
اُسے خبر تھی، مگر شہر میں رُکا بھی نہیں

غروبِ مہر قیامت تھا کھنڈرتے چہروں پر
دہکتے ہونٹ یہ کہتے ہیں؛ تُو بلا بھی نہیں

سکونِ بازوئے قاتل نقیبِ طوفاں ہے
یہ وہ سزا ہے کہ جس سے سوا سزا بھی نہیں

رہِ جنُوں کا بُلاوا ہے، دلِ فگار و چلو
کہ اس سفر میں مسافر تو ٹھہرتا بھی نہیں

سُراغِ منزلِ جاں کس سے پوچھنے جائیں
گھروں سے جھانکتی خلقت نے کچھ کہا بھی نہیں

⁂

آغوشِ طلب کا باب سوچوں
مَیں تیرے لیے وہ خواب سوچوں

جاگوں بن کے پلک پلک لب
شبنم کے بدن کی آب سوچوں

شامل ہوں مَیں تیرے رتجگوں میں
جاگوں بھی تو تیرے خواب سوچوں

تُو جائے تو منتظر ہوں تیری
تُو آئے تو بے حساب سوچوں

مَیں ریزہ ریزہ بکھر نہ جاؤں
کھولوں جو بندِ نقاب سوچوں

دیکھوں نہ مَیں آئینہ اکیلے
سانسوں میں بھی ہم رکاب سوچوں

بے تابئ جاں میں گھل نہ جاؤں
صد پارۂ دل کی تاب سوچوں

بانہوں کے سمندروں میں اُتروں
آنکھوں میں لکھی کتاب سوچوں

جنگل ہے طلب کا اور مَیں ہُوں
کانٹوں میں چھپا گلاب سوچوں

شیشے کی فصیل میں مقیّد
امکاں سے سوا عذاب سوچوں

بات کی تصویر میں پیکر، مری خواہش کا تھا
گلبدن وعدوں نے چہروں کی ضیائیں کیوں نہ لیں

سانس کا تھم تھم کے چلنا تھا شکستِ سازِ جان
لذتِ خواہش نے زخموں کی ردائیں کیوں نہ لیں

✺

آنکھ کو ویرانیاں بخشیں تو آنکھیں کیوں نہ لیں
گھر سے نکلے تھے تو لُٹنے کی دُعائیں کیوں نہ لیں

ذائقہ خوں کا مری آنکھوں کی دہلیزوں پہ تھا
اے مرے قاتل مرے خوں کی بلائیں کیوں نہ لیں

سر پہ تو بھٹکی ہُوئی ویرانیوں کی دھوپ ہے
جا نکلتیں جو ترے گھر پہ وہ راہیں کیوں نہ لیں

خوشبوؤں کی آہٹوں سے رنگ پگھلے خواب کے
ساعتِ جاں کو سجاتے گُل قبائیں کیوں نہ لیں

✺

پتہ ہَواؤں کا پُوچھے ہے رہبری آخر
ہٹی ہے عرضِ تمنّا کی جانکنی آخر

خزاں نے کی ہے رقم قامتِ ستم ہر جا
صبا کو مل گئی تائیدِ گمرہی آخر

سفر کے نام پہ بچھڑے ہیں ہمسفر سارے
کُھلا کہ شعبدۂ شب تھی سروری آخر

تمہارے لب تھے کٹورے ہمارے ہونٹ پیاس
وصال تھا کہ تھی تصویرِ تشنگی آخر

گماں نہ تھا کہ طلب بن کے ہجر جاگے گا
سنْور کے آئے گی خواہش کی دلبری آخر

فصیلِ جسم میں زنجیرِ دل ہلاتی ہے
تمہاری یاد کہ موجود مجھ میں تھی آخر

شکستہ خوابوں کو جھولی میں باندھ کر رکھو
فضاؤں پہ ہے ہَوا کی سپہ گری آخر

پہن کے زخم کا ملبوس، اپنے گھر جانا
سمیٹ لو کہ ہے پھر شام کو بکھر جانا

ملی نہ لاش زمیں اور پانیوں میں کہیں
اسے ہی سارے زمانے سے خوش خبر جانا

پرندے سارے اُڑے جا رہے ہیں کس جانب
تمھیں خبر ہو تو دریا کے پار، اُتر جانا

وہ جس کی آنکھ میں سچ اور زباں پہ جھوٹ بھی ہے
وہ پاس آئے تو آنکھوں ہی میں اُتر جانا

لرز رہی ہے زمیں، سہمی لڑکیوں کی طرح
پکارتی ہے کہ تنہا نہ چھوڑ کر جانا

بندھے ہیں پیٹ سے بچے بھی اور پیسے بھی
زمیں کی بیٹی کی تصویر دیکھ کر جانا

وہ جس کا شوق ہے کھلتے گلاب مل دینا
گلے ملو تو اسے بھی اُداس کر جانا

تجھ کو دل میں جھانکتے دیکھا تو شبِ تحریر کی
ہم نے اپنے ہاتھ سے زنداں کی بھی تعمیر کی

رنگ کے پھیکے لباسوں نے کیا افشائے راز
خوشبوؤں نے موسمِ گُل کی بہت تفسیر کی

غم بہت تھے کون سے لمحے میں کرتے کیا شمار
یاد پیمائی تری خاطر پہن زنجیر کی

درد کے جوبن نے آنکھوں کو کیا خوں ناب یوں
ہے کھنڈر چہروں پہ لرزاں آنچ سی تقدیر کی

میرے اندر چھپ کے بیٹھا ہے مرا دشمن کوئی
چھن گئی لذت مرے ہونٹوں سے بھی تقریر کی

ہَوا کے ساتھ چلو گے ہَوا سے ڈر کر بھی
چُھپا ہے ظلم کا محرم تمہارے اندر بھی

کوئی ملال تو ڈھونڈو خرابۂ جاں میں
بناؤ تو کوئی تسکینِ جاں کے تیور بھی

صبا صفت تھے، تو کیوں بارِ دستِ سبز ہوئے
ہَوا کی گود میں ٹھہرے نہ کیوں صنوبر بھی

ہماری بے گُنہی پہ ہمارے ہاتھ کٹے
وہ خلعتوں میں سرافراز، لے کے خنجر بھی

ثبوتِ حق کے لیے مُشتِ خاک بن جاؤں
کشیدِ خوں کے عوض کھینچ لوں سمندر بھی

ہم ایسے دشت نوردوں کو قید رکھنے کو
سلاخیں گاڑ گئے ہیں گھروں کے اندر بھی

مزاج اس کا مرے آنسوؤں سے ملتا تھا
جُھلس گئی ہوں مگر پانیوں کے اندر بھی

میری ضرورت ہے تُو ، تیری ضرورت ہوں مَیں
کُوچۂ پندار میں حرفِ ملامت ہوں مَیں

ناؤ کی صُورت چلوں موج ہَوا پہ جیوں
ساحلِ غم ڈوب جا داورِ قسمت ہوں مَیں

جاگتی آنکھوں میں بھی خواب سجاؤں ترے
رنگ لکھوں لمس کے قریۂ خلوت ہوں مَیں

جاؤں کہاں ڈھونڈتے تیری صدا کا بدن
تیری گواہی ہوں مَیں تیری صداقت ہوں مَیں

جاگتے رہنا تو اب جیسے مقدر ہوا
وہ بھی تو ہے جاگتا اس کی ہی عادت ہوں میں

عمر کی خوشبو سے تھے دل کے بھی تیور جُدا
شام کی دھوپوں میں اب زہر کی رنگت ہوں میں

✱

آپ کے بعد سحر بھی ہو گی
یہ دعا حرفِ اثر بھی ہو گی

اے شبِ ہجر سنائیں گے تجھے
خواب کی بات خبر بھی ہو گی

در بدر جس کے لیے رسوا ہو
ایسی تصویر تو گھر بھی ہو گی

آبلے رنگِ حنا پائیں گے
آخرش حدِ سفر بھی ہو گی
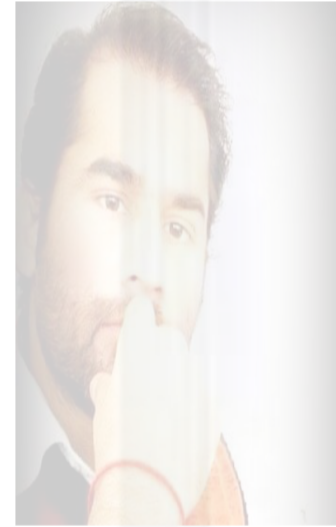
خواب میں حرفِ بصیرت ہو گا
دشت میں راہ گزر بھی ہو گی

زرد چہرے پہ سجے گی سُرخی
گھر کو رنگوں کی خبر بھی ہو گی

مقتلِ شوق سجاؤ لیکن
میرے ہاتھوں میں سپر بھی ہو گی
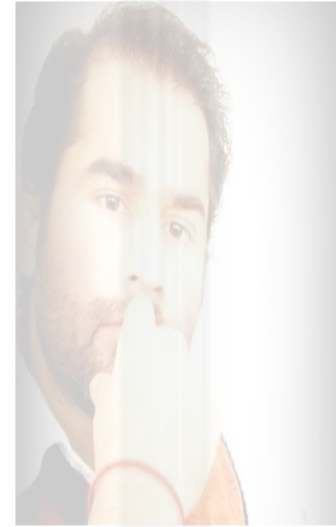
وہ خواب سا ہے تو خوابوں کو ہی سجائے کبھی
دکھا کے شکل مری پیاس ہی بڑھائے کبھی

وہ رنگ ہے تو کھِلے پھُول بن کے گلشن میں
وہ تُند خُو ہے تو موجوں کو آزمائے کبھی

بدن کا شہر ہے سُونا کبھو چلا آئے
وہ خواب بن کے مجھے رات بھر جگائے کبھی

کبھی چھٹے تو یہ کالی گھٹا جُدائی کی
دھنک کے رنگ تمنّا چُرا کے لائے کبھی

بدل کے نام مجھے آزمائے گا کب تک
مَیں اس کا نطق ہوں اعجاز آزمائے کبھی

نہ کوئی حرفِ سخن سنگ بن کے حائل ہو
وہ آئے اور یوں بے اختیار آئے کبھی

---

*

آنکھوں کی زردیوں میں چمک خواب کی سی ہے
تاریکیوں میں اب بھی جھلک آب کی سی ہے

مقتل ہے یا دھواں ہے شکستِ نشاط کا
دریا کی تند خوئی بھی زہراب کی سی ہے

دھندلا گئے بدن کہ سفر ختم ہو گیا
دستک لبوں پہ پیاس کی محراب کی سی ہے

بُجھتے الاؤ دھونکتے آنکھیں اُبل پڑیں
وحشت گھوں کی تشنگی مہتاب کی سی ہے

بدل کے نام مجھے آزمائے گا کب تک
مَیں اس کا نطق ہوں اعجاز آزمائے کبھی

نہ کوئی حرفِ سخن سنگ بن کے حائل ہو
وہ آئے اور یوں بے اختیار آئے کبھی

❋

آنکھوں کی زردیوں میں چمک خواب کی سی ہے
تاریکیوں میں اب بھی جھلک آب کی سی ہے

مقتل ہے یا دھواں ہے شکستِ نشاط کا
دریا کی تند خوئی بھی زہراب کی سی ہے

دھندلا گئے بدن کہ سفر ختم ہو گیا
دستک لبوں پہ پیاس کی محراب کی سی ہے

بجھتے الاؤ دھونکتے آنکھیں اُبل پڑیں
وحشت گھنوں کی تشنگی مہتاب کی سی ہے

ستم تو یہ ہے کہ دشمن مقابلے کا نہیں
وگرنہ حوصلۂ دل کا فیصلہ کیجے

اُڑے ہیں ریت کے ذرّوں کی شکل میں چہرے
زمیں سرکنے لگی ہے، قدم جما لیجے

تمام لفظ بھی اپنا حساب مانگتے ہیں
مٹا کے حرفِ غلط، شہر کی دُعا لیجے

✻

ہوائے وحشتِ جنوں لے چلی تو چلتے پھر
کوئی نہ ساتھ تھا یہ جان کے سنبھلتے پھر

بھلا وہ رنج ہی کیا تھا کہ جی نہ سکتے پھر
گُلال مَل کے غموں کا ہمیں نہ ہنستے پھر

غُبارِ رنگ جو چھٹتا تو شکل بھی کھلتی
حباب بن کے سہی، زندگی تو کرتے پھر

سراب آسا فسانے ہیں خوں کی رنگت کے
تمام شہر جگا کے ہیں لوگ ڈرتے پھر

لحاظِ غم سے تو آزارِ جاں نہیں مٹتا
وفورِ شعلۂ بیتاب سے پلٹتے پھر

طلب کی پیاس کو پھولوں میں بانٹ دیتا تھا
وہ خواب میں بھی مرے لب پہ اوس رکھتا تھا

اسے خبر تھی مرے مضطرب بہانوں کی
وہ حرف گر مرے کانوں میں پھول بُنتا تھا

اسے پلٹ کے بُلانے کا شوق بھی تھا عجب
وہ دائروں کی طرح ساحلوں پہ چلتا تھا

مَیں کیسے خود کو تراشوں کہ تجھ کو پا تو سکوں
تری گلی میں تو سورج بھی چھن کے آتا تھا

کہاں سے ڈھونڈوں مَیں ان صد چراغ آنکھوں کو
وہ شخص جو مرا ہر موئے تن سمجھتا تھا

بکھر گیا ھمرا اک اندیشۂ فنا ناپید
کہ میرا جامِ تمنّا چھلک کے بھرتا تھا

پھر اعتبارِ شب میں گھُلے زندگی کی شام
موجِ ہوائے تازہ بنے زندگی کی شام

تازہ رفاقتوں کی مہک سے بھیگے بدن
خوابوں کی خوشبوؤں سے سجے زندگی کی شام

معلوم ہے یہ سحر، گھڑی دو گھڑی کا ہے
پھر بھی کہو، سنبھل کے چلے زندگی کی شام

جو بوند خوں بھی جسم میں تھا، صرفِ غم ہُوا
اب اور غم بھی دو کہ بڑھے زندگی کی شام

دیکھا جو آئینہ تو بدن گونجنے لگا
ایسے ڈرا رہی ہے مجھے زندگی کی شام

شاید کہ کوئی خانماں برباد ٹھہر جائے
زنجیرِ دل بلاتی چلے زندگی کی شام

پھولوں کے آنچلوں میں تو تتلی کے رنگ ہیں
بانہوں کی کیاریوں میں سجے زندگی کی شام

گہرا ہے آج درد کی پُروا کا گھاؤ بھی
ناہید جاں گسل ہے، کہ ہے، زندگی کی شام

٭

ستم شناس ہوں لیکن زباں بریدہ ہوں
مَیں اپنی پیاس کی تصویر بن کے زندہ ہوں

طلب کی زشت نے دیوانگی مقدر کی
شفق کے رُوپ میں مَیں رنگِ آبدیدہ ہوں

زباں ہے قرمزی حدّت سے میرے سینے کی
مَیں مثلِ سنگ پٹخ کے بھی سنگ خوردہ ہوں

علاج حرفِ شنیدہ کا کس سے ہو پائے
ورق ورق ہوں مگر حسرتِ رمیدہ ہوں

شہید جذبوں کی قبریں سجا کے کیا ہو گا
کھنڈر ہوں، قامتِ شب ہوں، بدن دریدہ ہوں

وہ ماہ وسال کی شاخوں میں چھپ کے دیکھتا ہے
مَیں آئینے میں اسے دیکھ کے تپیدہ ہوں

رُکے تو غم نے بھی ہم سے ہی آگہی مانگی
قدیرِ شب نے بھی سانسوں کی چاشنی مانگی

اُتر کے آنکھ سے آنسو ہُوا روانہ جاں
اُداسیوں کے سبو نے سخاوتی مانگی

مَیں اس کی آنکھ کے زنداں میں کب تلک جاگوں
بھنور نے بھی تو ہَواؤں سے رخصتی مانگی

زمیں نے آنکھ میں ڈھونڈی ہے خواب کی رنگت
پیپٹ کے بیل نے شاخوں سے زندگی مانگی

مَیں کیسے اس کو بتاؤں بدن میں خون نہیں
عجیب شخص تھا، تصویرِ شربتی مانگی

آگے سرک رہے ہیں کہ سکتہ بھی ہے عجب
دیوار و دَر کو شوقِ تماشہ بھی ہے عجب

روزن میں اس قدر کہ توجہ محال ہے
صحرا میں تشنگی کا حوالہ بھی ہے عجب

شاید اُداس شاخوں سے پپٹا ہُوا ملے
اپنی گلی میں اس کا ٹھکانہ بھی ہے عجب

گنجان گھرے سبز درختوں نے بانٹ لی
وہ تیرگی کہ جس کا اُجالا بھی ہے عجب

دیوار و در کے رنگ ہیں آنکھوں پہ جم گئے
دہشت سے مر نہ جائیں کہ رستہ بھی ہے عجیب

بکھرے حرُوف جوڑ کے لکھ دو کوئی تو نام
اس دل کے دُکھ عجیب ہیں مسیحا بھی ہے عجیب

مَردوں کو سب روا پہ ہے عورت کو ناروا
شرم و حیا کا شہر میں چرچا بھی ہے عجیب

حرفِ وصال، حرفِ گماں تک نہ بن سکا
تہذیبِ جاں میں غم کا مداوا بھی ہے عجیب

بھیجی ہیں اُس نے پھُولوں میں مُنہ بند سیپیاں
انکار بھی عجیب ہے، بُلاوا بھی ہے عجیب

ملامتوں کے درمیاں

❋
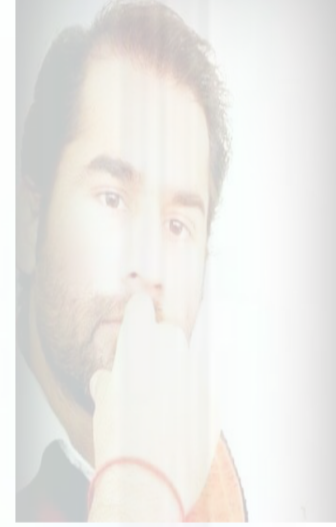
راتوں کی مہار پکڑے دن تھے
تُو تھا تو چنار جیسے دن تھے

تازہ تھا لبوں پہ شوقِ منظر
آہٹ کے سبُو میں ڈھلتے دن تھے

خوشیاں تھیں بدن میں زینہ زینہ
پوروں کے وصال جیسے دن تھے

قدموں میں ہوئی تھی شب دو زانو
ایڑی پہ کھڑے، گزارے، دن تھے

ہم زیستی

شاخوں پہ کھلے ہوں پھول پھر سے
یوں خواب و خیال جیسے دن تھے

دیوار پہ بیل چڑھ رہی تھی
خوشبو کی ندی کنارے دن تھے

اک سانس میں بات تھی، ہنسی تھی
نیندوں میں ہوا کو تھامے دن تھے

موجوں کے لہریے رنگ اوڑھے
گزرے تو گئے، مہینے، دن تھے

✺

یہ دل نے شرطِ وفا کا عجب ارادہ کیا
سفر کا قصد کیا اور پا پیادہ کیا

سنبھال کے رُخِ خورشید اپنے ہاتھوں میں
سحر نے رنگ پہن کے ہوا کو جبادہ کیا

اُسے تھا شوق سمندر کے ساتھ چلنے کا
سمجھ گئے تھے تو پھر دل کو کیوں کشادہ کیا

تمام فاصلے سمٹے تھے کوزۂ گل میں
وہ سامنے تھا کہ جب اُس کا رُخ، ارادہ کیا

بدن میں خوشبوئے جاں بھی ترے وصال سے تھی
اسی لیے تو ترا ہجر بھی زیادہ کیا

تجھے خبر بھی نہیں تیرے شب نشینوں نے
ستارۂ سحری کو زیں نہادہ کیا

مقدروں کے شجر بے ثمر رہے ناہید
اگرچہ ہم نے بہت فصلِ گُل لبادہ کیا

✺

وُہ دعوتِ سخن ایجاد، پھر نہیں آئی
شبِ وصال، ترے بعد، پھر نہیں آئی

مجھے ملو تو تمنّا سے پوچھ کر ملنا
گُلوں کے کِھلنے کی میعاد، پھر نہیں آئی

گُلاب طاقوں میں آنکھیں سجائے بیٹھے ہیں
نسیم جانبِ شمشاد، پھر نہیں آئی

پھر اس کے بعد نہ چہرہ، نہ رنگ ہی ٹھہرا
فضا میں تابِ شبِ رعد، پھر نہیں آئی

سفر نصیبِ محبت، پڑاؤ کیسے کرے
کہ کوئی چہرہ کوئی یاد، پھر نہیں آئی
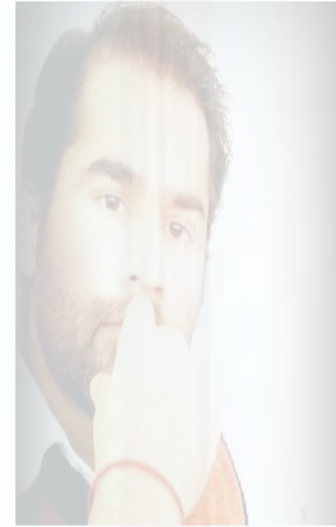
دیکھا تو زمیں کھسک رہی تھی
بیٹھے تھے بنا کے گھر زمیں پر

پانی کا بہاؤ تھم گیا ہے
نکلی ہے ندی سے وہ نہا کر

اب صرف لباس رہ گیا ہے
وہ لے گیا کل بدن چرا کر

✺

ہنستے رہے ہم اُداس ہو کر
آنسو بھی گرے تو دل کے اندر

قبروں کو بھی بسانا سیکھیں
باغوں میں نئی رُتیں سجا کر

مَیں گھر میں بھی اس سے ملتی کیسے
دیوار کھڑی تھی گھر کے اندر

مٹ جائے بدن کا جاں سے رشتہ
آئیں گے خطوط پھر بھی گھر پر

خوئے ملال نے بدلے چہرے
اشک ڈھلے اور لمحے ٹھہرے

آنکھیں دہکتے آتشداں سی
بستر جیسے بادل گھرے

محفل چڑھتے دریا جیسی
باتیں پھول گلاب سنہرے

روشنی صرف ہماری آنکھیں
پانی صرف ہمارے چہرے

ڈر، دروازے کاٹی جیسے
آنکھ پپوٹے خوف سے گھرے

دیوانوں کو پہچانیں ہیں
سنگ، سلاخیں اور کٹہرے

دلہن جیسے کورے کاغذ
گاگر جیسے بدن اکہرے

ٹوکر جس کی منکوحہ ہے
ایک بدن کے چالیس چہرے

سحر نے شب سے ملاقات میرے گھر کی تھی
اسے بے خبر یہ نشانی تو پھر سفر کی تھی

یہ کیسی ضد کہ پلٹتی ہے لہر ساحل پہ
یہ حوصلے کی نمو تھی، کہ بات ڈر کی تھی

اُفق اُفق جو تمنا کا چاند بن کے چڑھا
اُسی نے خواب کی دہلیز معتبر کی تھی

سمجھ لیا کہ بہت دے دیا زمیں کا خراج
زمیں نہ تھی، تو یہ نیت بھی، راہبر کی تھی

وہ کھینچ لایا شجر کا گداز آنکھوں میں
گلے ملا تو وہی چھاؤں مختصر کی تھی

پتہ نہ دے وہ مرے پاس دور رہنے کا
وہ چپ رہا تو یہ تصویر بھی خبر کی تھی

ہلال تھا کہ غمِ خواب تھا، نہیں معلوم
خبر یہ ہے کہ دُعا اُس کو دیکھ کر کی تھی

سمیٹ لو کہ یہی منظروں کا حاصل ہے
اُس ایک آنکھ میں تصویر پورے گھر کی تھی

ہم کل سے اُلم کریں گے اُس کا
آئے گا نظر نہ جس کا چہرہ

کھینچیں گے لکیر اپنی حد کی
رشتہ ہے صبا سے رشک ایسا

مَیں ساتھ کھڑی ہوں تیرے ایسے
سایہ بھی دکھائی دے نہ میرا

باتوں کے بھنور میں ڈوب جاؤں
آنکھوں میں چھپائے دشت پیاسا

جلتی ہیں ہتھیلیاں تو سوچو
یہ زہر کہاں کہاں پہ ہو گا

سانسیں ہیں کہ ریل پٹڑیاں ہیں
دیکھیں ہیں کہ کون کون گُزرا

پاتا ہے مُراد پانے والا
گرتا ہے وہ شاخ سے پرندہ

٭

عجب تھا مجھ سے ترے اشتیاق کا لمحہ
پگھل گیا گلِ لب میں فراق کا لمحہ

قضا کیا ترے ایوانِ جاں میں فرضِ دُعا
کھُلا ہُوا میں زہِ انطباق کا لمحہ

معاملہ تو کسی دسترس کا تھا بھی نہیں
حذر کہ اب نہیں شرطِ سیاق کا لمحہ

یہ اضطراب تو ہے موجِ بے تماشہ کا
ملے تو کہنا کہ ہے افتراق کا لمحہ

گو اس کی شکل بہت مختلف نہ تھی سب سے
پہ مختلف تھا خمِ اتفاق کا لمحہ

خود اپنے شوقِ گزیدہ کو معتبر دیکھا
ٹھہر گیا تھا لبِ طمطراق کا لمحہ

غضب یہ تھا کہ اِدھر تشنگی لبالب تھی
کشیدہ قد تو ہُوا، گُلِ طباق کا لمحہ

اُٹھائے ہاتھ تو رستے میں اُس کے ہاتھ بھی تھے
ہتھیلیوں میں سجا اتفاق کا لمحہ

وہ ساتھ ساتھ مرے مشعلیں اُٹھائے ہُوئے
چلا تو ہے، پہ مقابل ہے شاق کا لمحہ

مجھ سے اپنے نام کے معنیٰ پوچھنے آیا تھا
اپنی شکل کے آئینوں کو ڈھونڈنے آیا تھا

بانٹنے بیداری کی چھاؤں کی لذت
پُروا بن کے آنکھیں چُومنے آیا تھا

پست کے دیواروں پہ چلتے سایوں سے
وہ بھی دشتِ دُعا میں گھومنے آیا تھا

اُس کو پاس بٹھا لینا پر دیکھنا مت
میری گلی میں گھر وہ بھولنے آیا تھا

نام پتہ کیا پُوچھو ہو بس یہ جانو
دریا دیکھ کے خود ہی ڈُوبنے آیا تھا

دھڑکا تھا اُس گھر کا پہلا دروازہ
دریا اپنا رستہ پُوچھنے آیا تھا

جُھٹکی جیسی نیند میں تھی لذت ساری
خواب بھی سرشاری کو سونگھنے آیا تھا

اُس سے مل کے رونے کی لذت چکّھی
گیلا کاغذ ہَوا میں سوکھنے آیا تھا

اس کو کس کے ساتھ ملا کر دیکھوں میں
وُہ تو ہر اِک چہرہ بھولنے آیا تھا

غروبِ شام سے مَیں اس کے اختیار میں ہوں
پلٹ کے دیکھوں تو دریا کے کنار میں ہوں

وہ اپنی دھوپ مرے آنگنوں میں پھیلا کر
سمجھ رہا ہے کہ مَیں حدّتِ قرار میں ہوں

خیال ایک ہی رستے کا سو طرح آیا
گلابِ جاں تری خاطر عذابِ خار میں ہوں

وہ جس نے ڈھونڈ لیا خود کو میری سانسوں میں
وہ اب سخن کرے کیسے کہ مَیں فشار میں ہوں

سفر کے وقت اُسے بھی سفر کا خوف نہ تھا
وہ مطمئن تھا کہ مَیں قوسِ اختیار میں ہوں

نکلتے دیکھا نہ تھا پتھروں سے پانی میں
ہوا کے رُخ پہ فروزاں مَیں شبِ دیار میں ہوں

مَیں احتیاط کی حدِّ غروب پہ ہی سہی
مگر طلوع کسی مہتابِ انتظار میں ہوں

وہ جاگتا ہے مجھے دیکھنے کی خواہش میں
مَیں اُس کی خواہشِ بیدار کے حصار میں ہوں

عجیب طور تعلق ہے، زخم بھرتا نہیں
اُسے بھلانے کو نکلو تو دن گزرتا نہیں

زمیں نے عشق کیا خوشبوؤں کی آہٹ سے
یہ دیکھنے کو، کوئی آئینہ اُترتا نہیں

اُسے فسردہ دلی راس آگئی ہے بہت
سکونِ جاں ترے کوچے میں پاؤں رکھتا نہیں

کچھ اور طرزِ ستم، مشقِ ناز بے گنہی
کہ اس دیار میں پتھر سے کوئی ڈرتا نہیں

اُتر کے آنکھ میں کس جا رہوں کہ واقف ہوں
نصیبِ وسعتِ صحرا بھی دل میں رکھتا نہیں

جزیرے خواب کے، ساحل کے اس طرف آباد
سفر کا شوق ہے، کشتی میں پاؤں دھرتا نہیں

حدیثِ بذہرۂ جاں، کوئی ناوکِ تازہ
کہ اب تو کوئی بھی صدمہ اُداس کرتا نہیں

ذہن رہتا ہے بدن، خواب کے دم تک اُس کا
پھر وہی رنج وہی خیمۂ غم تک اُس کا

میری آنکھیں مری دہلیز پہ رکھ دیتا ہے
خاص ہے میرے لیے شوقِ ستم تک اُس کا

ہے مرے آپ محبت سے وہ شاداب بہت
میری پہچان میں ہے قامت نم تک اُس کا

بادباں اب تو ہواؤں کو بھی پہچانتے ہیں
ہاتھ پہنچا ہے بہت دیر میں ہم تک اُس کا

دلِ افسردہ، سرِ شام سُلگ اُٹھتا ہے
ساحلِ جاں رکھے، اب کیسے بھرم تک اُس کا

وہ تو جھونکے کی طرح آ کے گزر جاتا ہے
وحشتِ جاں اس کا ہے اور خوابِ ارم تک اُس کا

کوُئے احساس ترے حوصلے تسلیم، مگر
صحنِ زنداں ہی لگے نقشِ قدم تک اُس کا

بات آئینے سے کرنے کو بھی موقع ڈھونڈیں
خلوتِ شوق تراشے ہے صنم تک اُس کا

لبِ ساحل بھی تو اب دامنِ دریا کم ہے
شہر جلتا ہُوا دیکھوں تو تماشا کم ہے

مَیں فقط سلسلۂ شب سے گلہ مند نہیں
قوسِ خورشید، ترا خواب اُترتا کم ہے

اس کی عادت ہے کہ پتھر سے بھی باتیں کرے
اس کے آنے میں محبت کا تقاضا کم ہے

گُل فروشی میں بھی مشّاق ہیں عشّاق ترے
صحنِ گلزار بھی دیوار پھاندتا کم ہے

خواب صورت نظر آتا ہے سرِ شامِ فراق
یوں تو کہتا ہے کہ وہ گھر سے نکلتا کم ہے

حیرانیٔ اُمید نے پہلو نہیں بدلا
کچھ خواب بھی بدلے نہیں کچھ تُو نہیں بدلا

معبد سے نکلتا ہے دُھواں سانس کی صُورت
پیکر کو بدلنے سے وُہ خوشش رُد نہیں بدلا

بے خواب ارادوں کو زمیں وصل نہ کرنا
خُوں رزق تھا جس کا وُہ ترازُو نہیں بدلا

زنداں مری تہذیب کا بنیاد ہے اب تو
اندازِ شہنشاہیٔ اَبرُو نہیں بدلا

املی کے درختوں کی کوئی شاخ نہ لینا
کہتے ہیں کہ اس پیڑ کا جادُو نہیں بدلا

مَیں چُپ کی گزرگاہ پہ آنکھوں سے چلوں گی
رکھوں گی بھرم یہ کہ سخن خُو نہیں بدلا

✺

خبر ہے سانس بھی لینے کا یہ زمانہ نہیں
ہمیں بھی اُن سے تمنّائے محرمانہ نہیں

پسِ غبار نظر آؤ گے چلو تو سہی
تمہارا ساتھ جو دے وہ تو یہ زمانہ نہیں

کسی بھی ڈھب سے رہو آرزوئے دل معلوم
گزرتی شب کا زمیں آخری ٹھکانہ ہے

بدن کو سر سے جُدا دیکھنے کی فصل ہے یہ
نجیبِ شہر کا گلشن سے دوستانہ نہیں

سمندروں کی ضعیفی نہ آسماں سے چھپی
شناوروں کو بھی تائیدِ قدسیانہ نہیں

سفر کو اپنے لیے معتبر سمجھ کر تجھے
فراغِ جاں وہ ملی جس میں آب و دانہ نہیں

چٹکتے غنچوں کو قدِ خودکشی کا نام نہ دے
حذر کہ قافلۂ جاں ابھی روانہ نہیں

گزشتہ خواب ہوا نے لکھے ہوئے ہیں کہیں
نوشتہ کہ دستِ تہِ سنگ مجرمانہ نہیں

بہت دنوں کی گھٹن شعر میں ڈھلی ناہید
بہت دنوں میں کھلا شہر میں دوانہ نہیں

✱

کبھی ملال، کبھی اُس کا نام لکھیں گے
ہم اُس کے نام بھی اپنا سلام لکھیں گے

زمیں سے پوچھیں گے اُس کی بساطِ آرائش
ہوا پہ قامتِ فصلِ قیام لکھیں گے

سحر کی تیز روی اور شبوں کی کوتاہی
گزشتنی ہے جو دل پر تمام لکھیں گے

نشاطِ غنچۂ جاں، شہرِ بے اماں میں کہاں
بشارتوں کے صحیفوں کو خام لکھیں گے
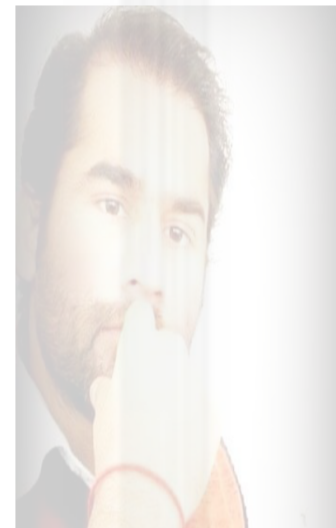
طنابِ لمحۂ دوراں ہی طوق ٹھہرے گی
حروف بول اُٹھیں گے ، غلام لکھیں گے

ہزار چہرے خمِ حاشیہ بنیں ، لیکن
سمندروں کو بھی خیراتِ عام لکھیں گے

مری سند پہ ہَوا بھی گواہیاں دے گی
تمہارے ظلم تمہارے ہی نام لکھیں گے

---

*

وہ شب کہ جس کا بدن آسماں کا گریہ تھا
قیامتوں نے بھی ایسا سماں نہ دیکھا تھا

زمیں کو شوق تھا خوابوں کے رزق کھانے کا
صلیب کو بھی گلہ ہے کہ خوں نہ ٹپکا تھا

فغاں قبا تھی مری بستیوں کے جسموں کی
وہ جب چلا تو سمندر بھی ہاتھ ملتا تھا

دُعا کی نہر میں مایوسیوں کی ریت بھری
زبانِ خواب ، فقط آبلوں کا صحرا تھا

قضا بھی سُرخ رُو، اُس کا لہُو پہن کے ہوئی
وہ جاں کا قرض بھی ہنس کے اُتار آیا تھا

صلیبِ تشنہ، تری پیاس بُجھ گئی اب تو
زمیں پہ خواب کا سایہ ترا نوالہ تھا

زمیں تپے گی ابھی اُس کے خوں کی گرمی سے
وہ بے قرار لہُو، قبر میں اُچھلتا تھا

حسابِ خُوں تو انہی آنگنوں میں ہونا ہے
رہائی کیسی، تمہیں شوق بھی رجز کا تھا

اُسے خبر تھی کہ تاریخ اس میں زندہ ہے
کہ اُس کا نام ستاروں میں کب سے لکھا تھا

✱

احکام بھی، تاثیرِ اذیت بھی اُسی کی
تحریر ہے چہروں پہ ہزیمت بھی اُسی کی

وہ خشتِ زمیں زاد نہ تھا لعلِ سخن وَر
زندانیٔ شب گیر تھی مہلت بھی اُسی کی

وہ قامتِ شمشاد، سمن بر بھی بہت تھا
دیوانہ بناتی تھی محبت بھی اُسی کی

مَیں زخم ہوں بولوں تو لہُو رِسنے لگے گا
ٹوٹے گی قضا بن کے مشیّت بھی اُسی کی

زخموں پہ تصرّف ہے تو دیوار سجاؤ
نکلی ہے ہَوا اوڑھ کے حسرت بھی اُسی کی

٭

یہ کیا خواب تمہارے نکلے اور عذاب ہمارے
چھلکی چھلکی آنکھیں لیکن دل پایاب ہمارے

یہ کیا شہر کے پھول بھی پوچھیں رنگِ بہار کی خصلت
یہ کیا خون ہمارا پہنیں خود احباب ہمارے

یہ کیا آدھے چاند پہ رونق، آدھے پہ تاریکی
یہ کیا، صبحِ تمنا ان کی، شب القاب ہمارے

یہ کیا بہتے دریا آنکھیں، جلتے صحرا پاؤں
یہ کیا بجھ گئے اب کے دلوں میں بھی مہتاب ہمارے
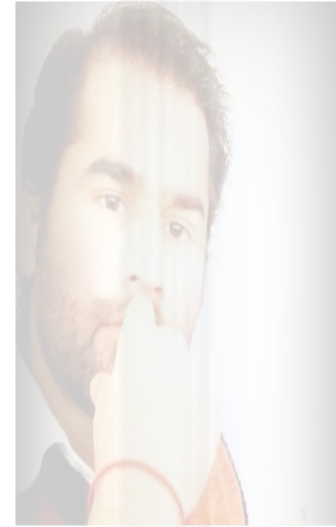
یہ کیا تجھ سے پوچھ کے اب میں اپنا حال بتاؤں
یہ کیا اپنا رزق بھی تیرا اور سیلاب ہمارے

یہ کیا جن کو دیکھنا چاہیں اور نہ دیکھیں ان کو
یہ کیا آنکھیں بھول نہ پائیں، شب آداب ہمارے

یہ کیا مہر و محبت نکلیں، قہرِ دیار کے قصے
یہ کیا آنکھ جو دیکھے اس پہ لب غرقاب ہمارے

یہ کیا کھینچ لی پاؤں تلے سے ریت بھی دریا نے
یہ کیا منزل پوچھ رہی ہے ہم سے خواب ہمارے

میرا آنگن، میری کھیتی، مجھ کم ذات سی اکثر
تم زندہ کر ٹوٹ کے بکھریں کب اعصاب ہمارے

اب کہاں رسمِ نجابت، خاک پہنا چاہیے
اس اکیلے گھر میں دیواروں کو ڈرنا چاہیے

خلعتِ شہزادگاں مقبول دیوانوں میں ہے
بے ضمیری کے سفر میں خود سے بچنا چاہیے

اب ہتھیلی پہ رکھی آنکھوں میں بینائی کہاں
اب تو احوالِ گزشتہ، کھل کے کہنا چاہیے

بے سرو سامانیٔ جاں بھی مقدر تھی مگر
شہر بھی پوچھے تو اخفائے تمنا چاہیے

اب تو موجِ خوں گزرتی ہے سروں کو کاٹتی
اب دعاؤں کو بھی ہاتھوں سے چھلکنا چاہیے

بولنا بھولا تو خوابوں نے بھی رخصت مانگ لی
اب زبانوں پہ بھی انگاروں کو رکھنا چاہیے

بیڑیاں پہنی تھیں میں نے تم نے کیوں پردہ رکھا
گنبدوں میں قید آوازوں کو چکھنا چاہیے

خوف بھی دریا کا ہے اور موج بھی دریا کی ہے
قلزمِ خود رفتگی سے اب نکلنا چاہیے

٭

ایک لمحے کی شناسائی کے تیور تھے عجب
پرسشِ غم اُس نے کی تو دل کے منظر تھے عجب

فرصتِ خوابِ تمنّا ڈھونڈتی آئی ہمیں
تھے مقفل سارے در، شہرِ مقدر تھے عجب

تُو ہَوا کے ساتھ تھا تو گھر میں ٹھہرا کون تھا
لے گئے دیوار و دَر تک، یہ مسافر تھے عجب

سنگِ خواہش اُس کے اُجلے ہاتھ میں گویا ہُوا
اُس کی خُوشبو سے تو سارے گھر معطّر تھے عجب

زندگی اپنے تعاقب میں چلے گی کب تلک
بھر گئے خود ریت سے، دل کے سمندر تھے عجب

روئے گی، غم بانٹنے آئیں گے پھر دیوار و دَر
تھے وہی عیسیٰ نفس، تیرے ستمگر تھے عجب

خزاں کو گود لیا یا اُجڑ گئیں گودیں
فسانہ ختم ہُوا ، ماہتاب لکھنے کا

پرندے صحنِ تمنّا کے سب اُڑا ڈالے
مگر ہے شوق ترا ہر حساب لکھنے کا

سفر تمام ہُوا ، شب کے خواب لکھنے کا
صلہ بھی مانگے سمندر حباب لکھنے کا

قدِ زوال تراشے ہے زخم سے پیکر
زمیں میں دَم نہیں فردِ عذاب لکھنے کا

حروف بھی تو بیاباں ہیں صورتوں کی طرح
زمانہ گزرا ، دُعا کے نصاب لکھنے کا

ہَوا بھی کہہ نہ سکے اُس پہ کیا گزرتی ہے
تقاضہ کرتی ہے دُنیا ، گلاب لکھنے کا

ذہن نے اذیت کے خواب کی بشارت دی
ہم نے دشمنِ جاں کو دعوتِ ارادت دی

کل خزاں درختوں نے اپنے ہاتھ پھیلا کر
دردِ شوقِ فردا کو دعوتِ صلابت دی

ہم اسیرِ دشنامی ہو سکے نہ خود آگاہ
زندگی نے جی بھر کے فرصتِ خجالت دی

شب فروش چہروں نے غازۂ جنوں پہنا
مصلحت نے ظلمت کو قامتِ قیامت دی

ساحلوں پہ دن نکلے ، یہ نصیب کب ہو گا
پانیوں نے آنکھوں کو بے زمیں مسافت دی

گریہ کناں تھے شام و سحر اور خستہ شب
یہ زخم میرے ہاتھ میں آئے گزشتہ شب

دیکھا تو شہر بھر کی ملامت تھی رزقِ جاں
بہلانے آئی بھی تو وہی دل گرفتہ شب

مَیں تجھ کو اپنی آنکھ سے باہر بھی دیکھ لوں
پیکر میں ڈھل کے آ تو سہی اے خجستہ شب

مَیں اپنے بام و در پہ لکھی جانکنی سہی
تُو بھی ہے زخمِ خواب مگر اے سرشتہ شب

اے عندلیبِ جاں یہی تمہیدِ گُل بہت
اپنے نصیب میں بھی تو ہو گی نہفتہ شب

✺

زخمِ آشنائی کیا، اس سے بیشتر دے گا
پھر کھُلے کواڑوں کو چشمِ منتظر دے گا

رازداریِ جاں بھی اس سے پُوچھ کر کی تھی
وہ کہ حرفِ خواہش کو قُربتوں کا گھر دے گا

رات بھر کی بیداری صُبح کھِل اُٹھی ایسے
جیسے دُھوپ کا آنگن وصل معتبر دے گا

مَیں تو اس دریچے پہ اپنا نام لکھ آئی
جس کا رُخ اُسے شب بھر دعوتِ خبر دے گا

اُس نے نام مانگا تھا، مَیں نے ہونٹ بھینچے تھے
ہر جواب اُن سے وہ اب تو پُوچھ کر دے گا

دشتِ بے محبت میں تشنہ لب یہ کہتے ہیں
سارے شہسواروں میں کون اب کے سر دے گا

بادِ بے جہت اب کے سارے گھر اُجاڑے گی
کن کے سر قلم ہوں گے کون نقدِ شر دے گا

سطوتِ تعلق میں بے ارادہ آنے پر
صبر کے صحیفوں کو کس کے نام کر دے گا

وہ بھی ہے فسردہ سا، مَیں بھی ہوں فسردہ سی
اے خُدا تُو کیسے ان پانیوں میں گھر دے گا

رات پھر بُلاوے کے آئینوں کو لائے گی
چاند اوّلیں سب کا دعوتِ سفر دے گا
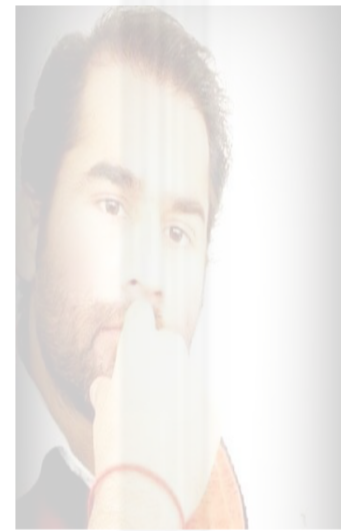
مَیں نے اس کو چاہا تو ہو گئی زلیخا سی
ہاں یہی گواہی وہ مجھ کو دیکھ کر دے گا

---

*

علاجِ زخم بھی تھا بندشِ زباں کے عوض
ہمیں نے قید نہ مانگی مگر اماں کے عوض

نہ مانگیں شب کہ جیسے چادرِ سحر نہ ملے
نہ پہنیں خلعتِ جاں، یارِ مہرباں کے عوض

زمیں پہ موسمِ خوں اس برس ہی آیا ہے
لگی ہے قیمتِ جاں، طلعتِ سناں کے عوض

خلا میں بیٹھ کے تنہائیاں بٹورتے ہیں
تلاش کرتے ہیں پہنائیاں، مکاں کے عوض

سراغ دیتا ہے لہجہ شکستہ پائی کا
فراخیٔ لبِ احساس ہے زیاں کے عوض

وہ قیدِ کوہ میں رہ کے بھی شہر شہر میں ہے
ہوئی ہے ہم سخنی کارِ بے زباں کے عوض

ہر ایک شب وہ نئے پیرہن میں ظاہر ہو
تلاشِ شعلۂ جاں لب بہ لب فغاں کے عوض

وہ سرو قد بھی تو زنجیر ہو گئے ناہید
زمیں کو اوڑھ کے بیٹھے جو آسماں کے عوض

شہر میں دیواریں تھیں اور دیواروں میں وہ تنہا تھا
خبر نہیں وہ شخص تھا کیسا، چہرہ اُس کا اچھا تھا

پہچانا تھا دستک کو اور قدموں کی ہر آہٹ کو
نہ بُجھے چراغ کو ہاتھ میں تھامے، دروازہ بھی کھولا تھا

گھر میں تھے بس سانس مسلے اور خواب دھرے تھے طاقوں پر
اُس نے گیلے فرش پہ ٹھنڈے پَیر گھما کے سوچا تھا

خواہش بھر کے پچکاری میں، من ہولی کب کھیلو گے
کُنڈی دروازے کی کُھلی تھی، چھت پہ دِیا بھی رکھا تھا

مہندی پیڑ تو سوکن گھر تھا، اُس گھر ہی دیوالی تھی
میرا گھر جیسے بالک کا ٹوٹا ہُوا کھلونا تھا

پچھلے برس کے خواب تو اب کے چوک میں بھی نیلام نہ ہوں
لوگ بسیں اس گھاٹ جہاں سے کل وہ دریا بہتا تھا

✺

عمر میں اُس سے بڑی تھی لیکن پہلے ٹوٹ کے بکھری مَیں
ساحل ساحل جذبے تھے اور دریا دریا پہنچی مَیں

شہر میں اُس کے نام کے جتنے شخص تھے سب ہی اچھے تھے
صبح سفر تو دُھند بہت تھی، دُھوپیں بن کر نکلی مَیں

اُس کی ہتھیلی کے دامن میں سارے موسم سمٹے تھے
اُس کے ہاتھ میں جاگی مَیں اور اُس کے ہاتھ سے اُجلی مَیں

اِک مُٹھی تاریکی میں تھا اِک مُٹھی سے بڑھ کر پیار
لمس کے جگنو پلّو باندھے زینہ زینہ اُتری مَیں

اُس کے آنگن میں کُھلتا تھا شہرِ مراد کا دروازہ
کُنویں کے پاس سے خالی گاگر ہاتھ میں لے کر پلٹی ہُوں

مَیں نے جو سوچا تھا یوں تو اُس نے بھی وہی سوچا تھا
دن نکلا تو وہ بھی نہیں تھا اور موجود نہیں تھی مَیں

لمحہ لمحہ جاں پگھلے گی، قطرہ قطرہ شب ہو گی
اپنے ہاتھ لرزتے دیکھے، اپنے آپ ہی سنبھلی مَیں

---

*

تیرے بخشے ہُوئے زخم آنکھوں میں تھے اور دیوار خوش تھی
گُل کے موسم کی خوش بختیوں پہ زمیں تیز رفتار خوش تھی

صحن میں لڑکیوں کو بُلا کے نہ گھر سے نکلنے کی تاکید کی تھی
دراڑوں میں سے جھانکتے ریزہ ریزہ مناظر کی یلغار خوش تھی
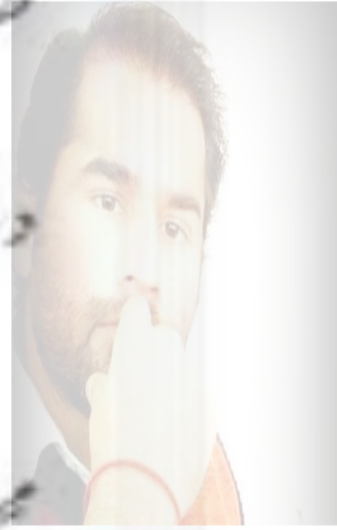
محبت کے موسم میں باتوں کی بیلیں مہک مانگتی ہیں
ڈھونڈتے اس کو جائیں گے کہتے ہوئے طبعِ دشوار خوش تھی

اس کو خوشبو سمجھ لوں تو پہنوں گی کیسے، بٹھاؤں گی کیسے
یہی وسوسے تھے کہ دہلیزِ خواہش بھی اس بار خوش تھی

تری دلکشائی کا چھینٹا لگا تو گلوں سے مُلاقات کو جی نہ چاہا
مرے چھوٹے قد کے مقابل درازی تری قامتِ یار خوش تھی

خُدا نے کہا تھا مجھے خواب دے دو زمیں کا خُدا میں تمہیں مان لوں گا
صدف ساز لمحوں میں آپ تہہ سنگ جاگا تو ترغیبِ آ[illegible] خوش تھی

✺

پھر ہم خواب کو زرد سمجھ کے روئیں شب زندانی ہوں
پھر گلِ لب کی بات نہ مانیں، سوختہ شوق کہانی ہوں

پھر ہم اس کو درسِ محبت دینے خود دو زانو ہوں
پھر اپنے گھر کی دیواروں پر آپ ہی رقص نشانی ہوں
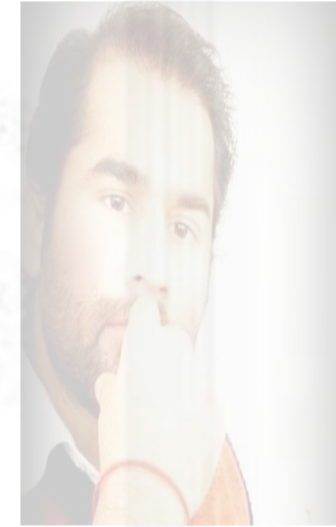
قطرہ قطرہ خواب چکھیں اور صحرا صحرا ہو جائیں
آنکھیں گیلی مٹّی جیسی، اسودِ شب پیشانی ہوں

اُتریں جاذب بانہوں والے دُھوپ کے تپتے سینے میں
وقت بھی ٹھہرے دریا جیسا، لوگ بھی خواب زمانی ہوں

روٗنی

پہلے بوسے کی یورش سے اب تک آنکھیں بوجھل ہیں
جب بھی دیکھیں، اس کی جانب، منظرِ شب امکانی ہوں

رات بہت سوئے بھی نہیں تھے، پھر بھی خواب بہت دیکھے
باتیں کی تھیں اُس لہجے میں جیسے اس سے چھپانی ہوں

پہلے اس کو دیکھا تھا، یا پہلے اس کو چاہا تھا
ایسی باتیں کیا سوچیں جب سب اقرار زبانی ہوں

اسیں بُریاں وے لوکو!

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر، دریا ، سمندر، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں
حفظ ، حفاظت دروازہ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
گھر اُجڑے اور شہر آباد
یاد کسی کو نہ اپنا نام
کاغذ جیسی دُلہنیں
ردّی بن کر بک جائیں

داسی ، ملکہ ، گھر رونق
فرنی پہ چاندی کے ورق
پانی ، بُھوک ، جلن خواہش
فردِ جُرم کی خوں بارش
دشتِ بدن کی سیاحی
خوابِ شفق کی جراحی

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں
پیٹ سے سب کے اُبلے آگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
دِل دروازہ
قلم سے جھٹکی سیاہی نشانی
کنگھی ، ٹوٹے بال ، کمائی

جھوٹی روٹی، شکر خدایا
جیوے سائیں، کیا سُکھ پایا
مٹّی گارا اور اینٹیں
سب ہیں جھوٹی بُنیادیں
مٹّی کے سینے پہ مٹّی
مٹّی چاٹے بالک
مٹّی کھائے حاملہ
مٹّی آنکھ دِکھائے
مٹّی ذائقہ اور زبان
زبان، جیسے تیرا نام
حرف کے سو بَن باس
بول بھی دُشمن
چُپ بھی دُشمن
چلو کہارو، ساجن آنگن
مَوت کے بعد بھی واپس آؤ
چلو کہارو!

فرد، اکائی، اکلاپا
لہر، دریا، سمندر، لہر
پانی، مَیں اور مَیں
دیواروں پہ ناچے کاگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
خمیازہ
شہر شگفتہ، گھر نمناک
دل کیا ہیں زخموں کے چاک
نفرت کے سب انگارے
سیپارے
گھر والی، من دیوانی
آگ لگے، کہے دیوالی
فن پیاسی، گھر کی داسی
حسب اجازت، کامنا
پانی کو بھی چھانتا

کمر، کنستر، جلا گوشت
پھول کھلے اور نکلے پوست
دن دوزخ اور شب شیطان
آدم خور رہیں انسان

فرد، اکائی، اکلاپا
لہر، دریا، سمندر، لہر
پانی، مَیں اور مَیں
پور پور میں دیپک راگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر موت کا آوازہ
دِل کا غازہ
کنٹھی، جامتی، گیروے
رشتے، بھوتڑے اور منکے
مکھن اور لوبان کی بتّی
ہرنی آنکھیں کستوری

زعفران کے سُوکھے پھُول
گردن جھٹکو کہو قبول
محل، اُداسی، بیراگی
ٹل آنکھیں، تُو ہے جاگی
سُن سناٹا رگوں کا
جاگا ہے دھن گھروں کا
دریا کی تہہ میں بستی
سنگ بھی دریا کے بستی
نیزہ جیون کا لگے
ساگر ساگر یہ کہے
سُوئی، ناکہ اور دھاگہ
یہ ہے جیون پو بارہ

فرد، اکائی، اکلاپا
لہر، دریا، سمندر، لہر
پانی، مَیں اور مَیں

آنکھوں میں سپنوں کے جھاگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
دِل شیرازہ
مٹی نے پہنی سُرخی
سوئی خلقت ہے جاگی
کانچ کلائی کھبروا
موتی ، نین بجروا
غوطہ اونچی لہر میں
گڑ میٹھا ہے زہر میں
گیان دھیان کے سب استھان
بن جاتے ہیں سب انجان
گُھاس ، زمین ، زمین بھی گھاس
انگلی انگلی ، سو سو پھانس
پَوَن جھکورا ، خواب کا
باب کُھلا سنجاب کا

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں
لال سندوری چمکے مانگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
شب اندازہ
عُمر کی گُنڈی
کھوسے کھڑکی
برف ، ہَوا ، بارش ، طوفان
جاگیں ڈر ڈر کے انسان
رشتہ ، روٹی
جذبے ، چرخی
کاتو پُونی
پُونی کاتو
کپڑا ، چادر ، بہلاوا

چھپ کے چلنے کا رستہ
رزق ، دُعا ، دیوارِ شب
ہنسلی ، پھندا ، ڈر ، گھر گھر
بھٹی ، بھُرتا ، بھاونا
شیشے میں یوں اُتارنا
شیر بھی گھاس کو کھا جائے
آگ پہ چل کے خود آئے
دُودھ سفیدی سے عاری
خون سے چہرے پچکاری

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں
سیج بنے پھولوں کی آگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر موت کا آوازہ

گھر شب غازہ
صاحب بی بی اور غلام
سب کے دام
بی بی ، غلام
بس ایک سے کام
شیلف ، سجاوٹ ، دوپہر
شام کو آتشدان میں آگ
چہرے لال ، بہت ہی لال
گھونگھٹ پٹ کُھلے اور دربند
ناچے خون کا انگارہ
گاتا جائے بنجارہ
مذہب ، دُنیا اور اللہ
جیون کی یہ دُر گھٹنا
بات میں شب کا ذائقہ
ہُنر میں زہر کا قاصدا

طوطے میں جیون رُوپا
جنگل میں ڈھونڈے دیوتا
حق اللہ طوطے کی رَٹ
کنوئیں پہ چلتا رہے رہٹ
انجن دُھواں نکالے جائے
بادل ہَوا، اُڑائے جائے
بند، بندھے کِس کنارے
پار اب کون اُتارے

فرد، اکائی، اکلاپا
لہر، دریا، سمندر، لہر
پانی، مَیں اور مَیں
خواب گئے آنکھوں میں جاگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اُندر مَوت کا آوازہ
لب ہیں تازہ
شبنم، شاخ، شجر، سمن
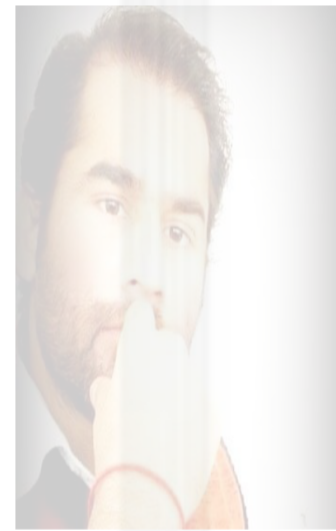
مہندی ہاتھ اور پھُول لگن
دِل کا حال کبوتر سا
کوندا مارے جی ڈر کا
نرگس سی اُس کی مرضی
دُنیا پھیلے وہ سمٹی
لشکر، لشکر وہ سجنے
پیاسی دریا سی وہ بہے
خیمۂ جاں، دھجی دھجی
شیشۂ دِل، کرچی کرچی
نخلِ تمنّا، برگِ خزاں
وصل کا لمحہ، وہم و گماں
قند تو کیا گلقند بھی زہر
ایک ہیں اب تو جنگل شہر
دیکھ کے زرد ہو زعفران
آنکھوں کو بھولی پہچان

اوس سے پیاس بُجھے گی کب
جاگے گی شب مجرئی کب

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں
چاہے دیکھو سُکھ بھی تیاگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
غم خمیازہ
کالی پکّی جامنیں
لگے ہیں لڑکیاں رات میں
بانس کے جنگل جوانیاں
کچّا ، کٹورا کہانیاں
میٹھے آڑو کے غنچے
دِل میں کوندا سا لپکے

آڑوچے کے پھول بھی پیازی
سندر لاگے آتش بازی
کالی بیل کے کالے پھول
آنکھیں ، ہاتھ ، تمنّا ، دُھول
عورت جب جل جائے ہے
کڑوا کشٹل بن جائے ہے
سُورج سے نکلے بپتا
پانی سے ڈھونڈے رشتہ
دُکھ سے بُنے خیالوں کو
خود ہی تانے جالوں کو
نالی میں خوں کا چھینٹا
پنکھے سے لٹکا پھندا
پانی پہ ٹھہری کائی
خاموشی ہے سچّائی
خواہش کرتے کمر جُھکی
زینہ زینہ جاں نکلی

پیر دباتے شب گزرے
گھوتے کھاتے دن بیتے
فسردہ ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، میں اور میں
گائے دِل اب یہ بیراگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر موت کا آوازہ
دل غم سازہ
کلموہی اور نصیبوں جلی
سُنتے سُنتے گھر میں پلی
ڈر ڈر دیکھا بدن کو
گندا سمجھا لگن کو
بِن بر دیکھے بیاہی گئی
مَیں سوچوں مَیں چاہی گئی

چمڑی ، پونجی بنے چاہت
لوگ کہیں ہیں دسراہت
گھر کایا دیواروں سے
بات کروں انگاروں سے
پتھر پیٹ بجنے نکلے
ساتھی بھی سائے نکلے
لیے سفیدی بالوں کی
صحرا شرط ، غزالوں کی

خود کلامی

مجھے سزا دو
کہ مَیں نے اپنے لہُو سے تعبیرِ خواب لکھی
جنُوں بریدہ کتاب لکھی
مجھے سزا دو
کہ مَیں نے تقدیسِ خوابِ فردا میں جاں گزاری
بہ لطفِ شب زادگاں گزاری
مجھے سزا دو
کہ مَیں نے قاتل کو وصفِ تیغ و عَلَم سکھایا
سروں کو اوجِ قلم سکھایا
مجھے سزا دو

کہ مَیں عدو کی صلیب کی محتسب رہی ہوں
ہَوا کی زد پہ جلے چراغوں کی روشنی ہوں
مجھے سزا دو
کہ مَیں نے دوشیزگی کو سودائے شب گماں سے رہائی دی تھی
گھروں کے بجھتے دیوں کو شانِ خدائی دی تھی
مجھے سزا دو
کہ مَیں جیوں تو تمہاری دستار گر نہ جائے
مجھے سزا دو
کہ میرے بیٹوں کے ہاتھ اُٹھے تو تم نہ ہوگے
کہ ایک بھی تیغِ حرف تورِ میاں سے نکلے تو تم نہ ہوگے
مجھے سزا دو
کہ مَیں تو ہر سانس میں نئی زندگی کی خُوگر
حیات و بعدِ حیات بھی زندہ تر رہوں گی
مجھے سزا دو
کہ پھر تمہاری سزا کی میعاد ختم ہوگی

پہلی پیاس اور آخری گھونٹ

محبت کے آراستہ
مینا بازار میں
مری خواہشیں بک رہی تھیں۔
تعلق کی خواہش
کہ جو جنس کی واگذاری میں
صرفِ جہنم ہوئی
دیکھنے میں مگر سطوتِ شب ہوئی۔
تبسم کی خواہش
ملالوں کے کہنہ خرابوں میں
مکڑی کے جالے کی صورت
لبوں پہ تنی
مگر تتلیوں نے عجب رنگ چھوڑے
کہ یہ کہنگی وجہِ حیرت ہوئی۔
تکلم کی خواہش
ہوا نے فضاؤں میں جو لفظ لکھے
وہ آہنگ و لہجے میں تبدیل ہو کر
زماں آشنا داوروں کے لیے
قلزمِ خوں بنی۔

مگر ایک خواہش
جسے بیچنے کی تمنا
نہ اُن کو کہ جو بیچتے ہیں
نہ مجھ کو کہ جو بک رہی ہوں۔
کباڑی کی دُکان میں
بے ضرورت بھری بوتلوں کی طرح
بے وقعت سنگریزے

تمنّا کے نیزے۔
کبھی قفلِ اُمید کی کھوئی چابی
ملے گی اسی غم زدہ ڈھیر سے۔
آؤ اندھوں کی صورت ٹٹولیں
کہ اب جانیں کب روشنی ہو!

انبوہی

گلاس لینڈسکیپ

ابھی سردی پوروں کی پہچان کے موسم میں ہے
اس سے پہلے کہ برف میرے دروازے کے آگے دیوار بن جائے
تم قہوے کی پیالی سے اُٹھتی، مہکتی بھاپ کی طرح
میری پہچان کرلو
مَیں ابھی تک سبز ہوں
مُنہ بند الائچی کی طرح۔
مَیں نے آج، تمہاری یاد کے کبوتر کو
اپنے ذہن کے کابک سے آزاد کیا
تو مُجھے اندر کی پتاور دکھائی دی۔
چاند پُورا ہونے سے پہلے تم نے مجھے چُھوا
اور بات پُوری ہونے سے پہلے
تم نے بات ختم کردی۔
جانکاری کے بھی کتنے دُکھ ہوتے ہیں
بن کہے ہی تلخ بات سمجھ میں آجاتی ہے۔
اچھی بات کو دُہرانے کی سعی
اور بُری بات کو بُھلانے کی جدوجہد میں
زندگی بیت جاتی ہے۔
برف کی دیوار میں
اب کے مَیں بھی چُنوا دی جاؤں گی
کہ مجھے آگ سے کھیلتا دیکھ کر
دانش مندوں نے یہی فیصلہ کیا ہے۔
مَیں تمہارے پاس لیٹی ہوئی بھی
پُھلجھڑی کی طرح سُلگتی رہتی ہُوں۔
مَیں تم سے دُور ہُوں
تب بھی تم میری لپٹوں سے سُلگتے اور جُھلستے رہتے ہو
سمندر صرف چاند کا کہا مانتا ہے

سرِ شام جب سُورج اور میری آنکھیں سُرخ ہوں
تو مَیں چاند کے بُلاوے پہ سمندر کا خروش دیکھنے چلی جاتی ہوں
اور میرے پیروں کے نیچے سے ریت نکل کر
مجھے بے زمین کر دیتی ہے۔
پَیر بے زمین
اور سر بے آسمان
پھانسی پر لٹکے شخص کی طرح ہو کے بھی
یہی سمجھتی ہو
کہ مُنہ بند الائچی کی طرح ابھی تک سبز ہو

سمندر تو ایک آنسو ہے

آنکھیں کھولتی اور بند کرتی گڑیا کی طرح
مَیں نے زندگی کے سارے منظر دیکھے ہیں۔
کٹے درخت کی سُوکھی جڑ کی طرح
میرے زمین سے وابستہ رہنے پر
کسی کو اعتراض نہ تھا۔
بیچ دوپہر میں اندھیری رات
میرا مقدر تھی۔
آدھی رات کے بعد کی بارش
کہ جس کی کسی کو خبر نہیں ہوتی ہے
میری آنکھوں میں تھی۔

آنسوؤں کی سیڑھیوں سے
مَیں قطرہ قطرہ نیچے اُتری تھی
اور آتشدان میں جلتی
لکڑیوں کے بیچ مُسکرا رہی تھی۔
میری ہڈیاں بھی میرے اندر بولتی ہیں۔
مجھے گزشتہ غموں کو رخصت کرنے سے
اتنی فرصت بھی نہیں ملتی ہے
کہ مَیں تازہ غموں کا شمار کرسکوں۔
مَیں نے کاغذ پہ اپنے لیے کتنے ہی سُورج بنائے
مگر رات نے مجھے پہنے رکھا۔
رات کی دیواریں بہت اُونچی تھیں
اور دروازے لوہے کے تھے۔
مَیں نے کہانی شروع کی تھی
مگر کسی نے مجھے ختم کرنے نہیں دیا۔
صحرا میں چیلوں کے پروں کی طرح
میرے دل کی دھڑکن نے

میرے ہاتھوں میں پکڑے ہُوئے گیت کو
آنسوؤں میں بدل دیا ہے۔
سمندر اور مَیں
ایک دوسرے کا خروش سُن کر
خاموش ہونے کے لیے، وصال چاہتے ہیں

خلوتِ زخم

خوابوں کو چھانتے چھانتے
اب تو افواہیں بھی مرنے لگی ہیں
یہ سب موسم کا قصور تو نہیں
کہ درخت بھاگے ، اور دریا کاٹی لگتے ہیں
معلوم نہیں غلطی پہلے مجھ سے ہوئی تھی کہ خدا سے
کہ مَیں آگ کے بطن سے پیدا ہوئی۔
مَیں ہر روز کیلنڈر سے سودے بازی کرتی ہوں
آگ کو پھول بنانے کی،
مگر میرے جوتوں کی گھستی ایڑیوں
پر رکھے تلوے
اور بھی کھردرے ہو چکے ہیں۔
میری طرح پیاسی کھڑکیاں
پھولوں سے لدی شاخوں کی مہکار کی منتظر ہیں۔
گھوڑوں پہ سوار ہو کے جانے والوں کو
آشیرباد ملتی تھی۔
ہم جو روز بسوں کے کنڈوں کے ساتھ
لٹکنے کے لیے نکلتے ہیں،
ہماری تو خالی جیب بھی کٹ جاتی ہے
اور ہمارے بدن کا کوئی چیتھڑا
سولہ گز لٹھے میں لپٹنے کو گھر واپس آ جاتا ہے۔
جس کے پاس بس کا کرایہ نہ تھا
اُن کے گھر لٹھا کیسے آئے گا!
یہ کتابوں میں نہیں لکھا ہے۔
باہر سیلاب ہو
اور کوٹھے پہ چڑھے لوگ پیاسے ہوں
تو کیا ، کیا جائے

یہ کتابوں میں نہیں لکھا ہے
سمندر کی طرح میرے اندر بھی
کتنے ہی خوابوں کے جہاز ڈوب گئے ہیں
یہ بھی کتابوں میں نہیں لکھا ہے۔
مجھے کتابوں کے حوالے نہ دو
کہ جرابیں پہن کے چلنے والی قوم
نقش قدم نہیں چھوڑتی

بجھتے بدن کی نیلاہٹ

ایک سچ جو سب کو معلوم ہے
اس کے بتانے میں حرج بھی کیا ہے
ساحل پہ ٹھہرے ہوئے ہر جہاز میں
نہ مسافر بیٹھتے ہیں نہ خزانہ ہوتا ہے
پھر بھی جب زمین سانس لیتی ہے
تو لہریں ان کھوکھلے اژدھوں کو بھی نہال کر دیتی ہیں
پہاڑیوں کے درمیان رہ جانے والے بادل
برسا نہیں کرتے ہیں
کہ دریا کے سوکھتے سوکھتے
درختوں پہ پتے کم اور چڑیں زیادہ

ہو گئی ہیں۔

زمین کی بھوک اتنی بڑھ گئی ہے

کہ جو بیج ڈالو، وہ کھا جاتی ہے۔

ہر دفعہ جب بھی میرے حصے کی دھوپ کا وقت آیا

سورج کے سامنے بادل آگیا۔

میری کمر دہری ہونے تک

خواہش کا سایہ میرے پیچھے رہا۔

آسمانوں پہ چمکتی بجلی

جب بھی میرے دل میں کوندی

میرے آنکھوں میں ٹھہرے خواب جل گئے۔

پہلے پہل خواب تتلیوں کی طرح ہوتے تھے

پھر انہوں نے قوس و قزح کا رنگ لیا

اور اب ڈوبتی شام کی شفق پہنے

میری پرانی کتابوں کی

پھٹی ہوئی جلد کی طرح پھٹی ہوئی ایڑیاں لیے

کتابوں کی پچھلی شیلف میں

کہ جہاں نہ کام آنے والی کتابیں رکھی جاتی ہیں

صرف محفوظ ہیں۔

کس سمت جائیں

کہ جس سمت بھی چلو سامنے دیوار آجاتی ہے

وہ دیوار جو میں نے نہیں بنائی

وہ دیوار جو میری حفاظت نہیں کرتی

وہ دیوار جو مجھ پر آن گرتی ہے

زہر کا ڈنک

مَیں نے آگے جانے والی شاہراہ پر
پیچھے چلنا شروع کر دیا ہے
اور سُورج میرے کپڑوں کے راستے
مُجھ میں تپش منتقل کر رہا ہے۔
سفید رنگ کے کپڑے جو میرے وجود کا
رنگ جذب کر کے، پیلے پڑ چکے ہیں
واپس آنے والے راستے کا
ساتھ کیسے دیں گے!
مگر سُنو
گلاب کی سُوکھی شاخ کو کاغذ میں لپیٹو
میرا وجود بن جائے گا
کوٹ کی خالی جیب کو باہر نکال کے جھاڑو
میرے سارے لفظ مجسّم ہو جائیں گے
پھٹے ہُوئے بُوٹ سے جھانکتی زخمی انگلی دیکھو
میری ہنسی یاد آ جائے گی
آدھی رات کو اُٹھ کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھو
میری آنکھوں کی بے خوابی تمہاری غنودگی میں جاگ رہی ہو گی
کتابوں میں مَری ہُوئی مکڑیوں کی طرح
تم میری ذات کو اُٹھا کر باہر کیسے پھینکو گے
کہ ہزیمت کے جالے تمہاری آنکھوں پہ تنے ہوئے ہیں

آگ کا رقص

دریا کی طرح اب میرے دل کی تہہ میں
ریت بھر گئی ہے
وہی جو پہلے میرے بالوں
اور میری آنکھوں میں تھی۔
کبھی لفظ میری تمنا کی کشتی بن کے
خوابوں کے دریا پار کر جاتے تھے
ہَوا بادلوں کو لپیٹ لیا کرتی تھی
اور رات چاند کو عُریاں کر دیتی تھی
ستاروں اور چاند کی عریانی نے
مجھے حُسنِ بدن کی تقدیس سکھائی تھی

مَیں نے اُس وقت تک ہَواؤں کا نوحہ نہیں سُنا تھا
مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ ہَوائیں نفرتوں کے بیج لیے
میرے صحن سے گزر رہی ہیں۔
اب مَیں اپنے اندر کے وحشی کو
تنگ قمیصوں، کسے ہُوئے بلاؤزوں
اور ہائی نیک کے سوئیٹروں میں قید کرنا چاہتی ہوں۔
مَیں نے سر جھکانے کی عادت ڈالنے کے لیئے
نماز پڑھنے کی بھی کوشش کی
مگر جُھکنے سے مرے زخموں کے ٹانکے ٹُوٹ گئے۔
ہونٹ کاٹنے والے، ناخن کترنے والے
سگرٹ اور شراب پینے والے
اور لڑکیوں کی لذّت میں بدمست رہنے والے
سبھی لوگ اچھے ہیں
کہ اپنے اندر کے کیسلے آدمی کو پیرہن
تو دے دیتے ہیں۔
آسمان سے رزق دینے والے کو خُدا

اور زمین پہ رزق دینے والے کو مجازی خُدا کہنے والوں نے
مجھے یہ منطق نہیں سکھائی
کہ سردیوں میں آگ کے گرد ناچنے والوں کی
آنکھوں کو رزق دینے والی کو
کس زمانے کا خُدا کہا جائے گا!

تمہاری خاموشی - میرا جُرم
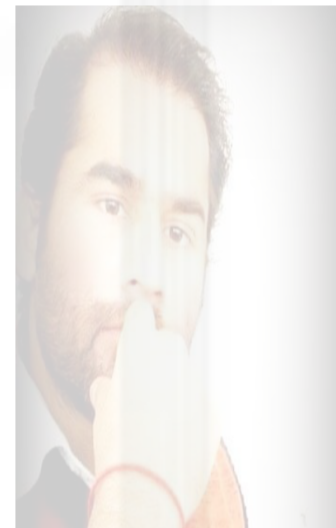
بدسلوکی ، آکاس بیل کی طرح
میرے وجود کو چُوس رہی ہے۔
والٹ وٹمن نے کہا تھا
نیچ لوگوں کی اولادیں
اپنی ماؤں سے بدسلوکی کرتی ہیں۔
ہم تیسری دُنیا کے لوگ
سب نیچ لوگ ہیں
کہ ہماری مائیں ، ہماری بیٹیاں
ہماری بیویاں ، ہماری بہنیں
صرف غرض اور ہوس کی بھٹی کا ایندھن ہیں۔

لوگوں نے تمہارے ہاتھوں پر بھی
محبت کی سُرخی دیکھی ہے
مگر مَیں جانتی ہوں،
میرے مُنہ پہ تمہارے تھپڑ نے
میری غیرت کا سارا خون مرتسم کر دیا ہے۔
اب بھی مَیں خود کو غیرت مند کہتی ہوں
بدسلوکیوں پہ لال بھبھوکا ہو کے
اپنی نسوں، اپنی رگوں اور اپنی باتوں کو
زندہ ہونے کا یقین دلاتی ہُوں۔
کہیں سے پوتا مٹی مِلے
تو تڑخے ہُوئے جسم پر لیپ کر کے
یہ عیب تو چُھپا لوں۔
اب تو سوچ کے گُنڈے میں لگی
نمائشی مسکراہٹ کا ہیرا
چُور چُور ہو چُکا ہے۔
کیا مَیں اُسی عمر کی سمت لوٹ جاؤں
جہاں بچّے کو بولنا نہیں آتا
کہ اب پلٹ کے دیکھنے والا پتھر بھی نہیں ہوتا
مَیں نے بیج ڈالا
فصل بھی اُگ آئی
مگر فصل کی کٹائی میرے مقدّر میں نہیں تھی
کہ بدسلوکی کی درانتی نے
میری آنکھوں میں سلائیاں پھیر دی تھیں۔
خنجر بے نیام ہو کے بھی زنگ آلود ہُوں۔
تم اس دریوزگی کو روایت کے
کس جُزدان میں لپیٹو گے
کہ میرے ہلکان ہوتے جذبوں کی مسیحائی ہو سکے

سُورج، سوا نیزے پر

شہر اور مُلک بدلنے کے خیال کے آنگن میں

دیواروں پہ چاندنی اور صحن میں اندھیرا ہے

مَیں تو صحن میں ہوں

دیواروں پہ صرف میرے سر کا سایہ نظر آتا ہے

سر کوئی بھی ہو، سایہ ایک جیسا ہوتا ہے

مگر چیونٹیوں کی قطاروں کا سایہ تو نہیں بنتا ہے۔

کہتے ہیں جس کا سایہ نہ ہو وہ عظیم ہوتا ہے

وہ خواب جو ہم نے رزق کے نام پہ دیکھے تھے

ان کا سایہ بھی نہیں ہے،

تو کیا خواب کی عظمت پہ ایمان رکھتے ہوئے
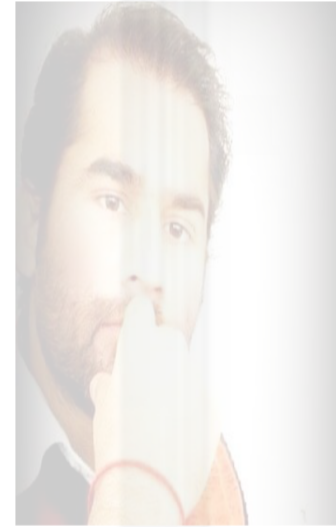
بھوک کو زندگی سمجھ لیں

غلام کب سمجھتا ہے کہ اُسے غلام بنایا جا رہا ہے

یہ تو دوسروں کو علم ہوتا ہے

مگر نہیں، بیاہی ہونے کے باوجود مطلقہ عورتیں

اب بھی اپنے اپنے گھروں میں بظاہر آباد نظر آتی ہیں۔

دیواروں پہ سروں کے سایوں کی طرح

شاید ان کا بدن عظیم ہے

اور ذہن غلام

میری اپنی بازگشت ہیں
بازگشت تو زندگی بھی ہے
جو میرا انتخاب نہیں

تثلیث

مَیں اس راستے سے گزرتی ہُوں
جو پہاڑوں کی آماجگاہ ہے ۔
مَیں اس آواز کو سُنتی ہُوں
جس کا خمیر بُزدلی اور خوف ہے ۔
مَیں اس شخص سے ملتی ہُوں
جس کی رگوں میں خون بھی برف ہے ۔
یہ میرا اپنا انتخاب ہے
ریت بھی نامرادی کی چادر اوڑھے اوڑھے
پہاڑ بنی تھی
آواز اور شخص

کھڑکی کے اندر کا منظر

کہیں تمہارے گھر میں مرے ہونٹ رہ گئے تھے
تم کو بھی نہیں پتہ چلا نا !
ہاں بلاٹنگ پیپر کے رنگ کی کوئی چیز
کہ جو ہر رنگ جذب کر کے بھی شگفتہ و تازہ
اور اسی طرح گلابی تھی
تمہیں اپنا نام نہ بتا سکی۔
سُنا ہے تم نے میرے ہونٹ اُٹھا کر
جیب میں رکھ لیے تھے
مگر ظاہر رہنے والی چیز چھپی کیسے رہے !

نیند میں لپٹے شہر کے نام

مجھے گُنہ میں زندہ رہنے دو
کہ میں نیکی کا نام لے کر
سراب آلود زندگی بسر کرنے سے بیزار ہوں۔
دھندلے شیشوں کے باہر کچھ نظر نہیں آتا
مگر شیشہ پھر شیشہ ہوتا ہے
ذرا سی ضرب سے چکنا چور ہو جاتا ہے۔
میز پر پڑی گرد صاف کرتے
اور گرد آلود ہاتھ دھوتے دھوتے
مَیں تو خود گرد جیسی ہو گئی۔
نکلتا اور ڈوبتا سورج اُفق پہ ایک جیسا لگتا ہے

صرف شعاع کا فرق

آفت وخیز کا فرق بن جاتا ہے ۔

تم بھی سمندر کی طرح

پتھروں کو اور زندوں کو

اُٹھا اُٹھا کر پھینکتے ہو ،

سمندر اپنی مسلسل بے خوابی سے نالاں ہے

وہ اپنی وسعتوں کو سمیٹ کر کسی کے سپرد نہیں کر سکتا

یہی اُس کا المیہ ہے

یہی اُس کا خواب ہے ۔

میرے خواب بھی سمندر جیسے ہیں

تم اور مَیں ،

سمندر ۔ سمندر

بول میری مچھلی کتنا پانی

حضرت نوح کے زمانے کی کہانی

بدنمائی نہیں دیکھنی چاہتے ہو

تو ایک آنکھ بند کر لو

اب بھی نظر آتی ہے

تو دوسری آنکھ بھی بند کر لو

دلخراش آواز سُنائی دیتی ہے

تو دونوں کان بند کر لو

کہ کانوں میں گونج رہ جائے

تو کان کھولنے کی ہمت ہی نہیں رہتی ہے

طوفان آنے کا خدشہ ابھی بہت دُور ہے

فلڈ کنٹرول سیل کام کر رہا ہے ،

پانی کی زیرِ زمین گزرگاہوں کو
بند کرنے کا ،
کاغذ پہ لکھی تحریر منع ہے تو
پتوں کو پڑھ لو
کہ زمین بھی تو انسان کو شراب کی طرح
پی کر مدہوش ہونے کا شوق رکھتی ہے

تیرے پیچ — میری ڈھیل

مجھے علم ہے تمہیں پتنگ کاٹنے کا بہت شوق ہے
میری پتنگ فضا میں اکیلی نہیں
اور بھی بہت ، رنگ برنگی پتنگیں
فضا میں لہرا رہی ہیں
میری ڈھیل دیکھ کر تم نے سوچا تھا
اتنی ڈور پہ پیچ پڑیں
تو پتنگ نہیں سنبھلتی ہے ۔
مجھے یہ علم تھا کہ میری ڈھیل اور میری اُڑان
نئی پتنگوں والوں کو
شوقِ رزم آرائی میں اُڑائے لیے جا رہی ہے

آڑ کر کھلی فضا کا معرکہ
رجز بن کے گونجتا ہے۔
مجھے معلوم ہے
میری ڈور پہ میرے ناخن اور میرے دانت
گھس کر لگائے گئے ہیں
اور تمہاری ڈور پہ
دیواروں پہ لگے حفاظتی شیشوں کی ٹکڑیوں کو بھی
پیس کر لگا دیا گیا ہے۔
اپنے آنگن سے جھانکتے آسمان کے کنارے کو
مَیں اپنے پتنگ سے ڈھک دیتی ہوں
اور تم دوسروں کی چھتوں پہ کھڑے ہو کر
پتنگ اونچی کرنی چاہتے ہو!
مَیں تو یہ سوچ رہی ہوں
تمہاری پتنگ کٹے گی تو تمہارے مانجھے سے
لوگوں کے سروں کی چادریں نہ کٹ جائیں
گردنیں نہ کٹ جائیں
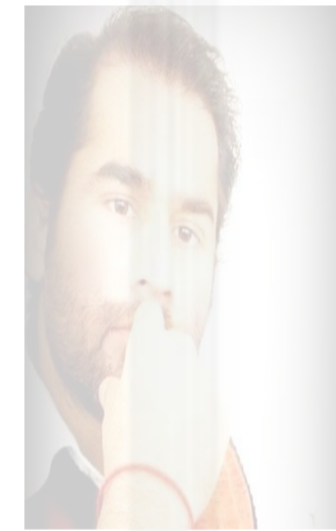
بس اسی لیے
مَیں اپنی اُونچی پتنگ کو اور ڈھیل دیتی جا رہی ہوں

تخمِ خوں

چاند کی شکل کے
چاندی سے روپے
بنک بھی لینے سے انکار کرتا ہے
اور چاندی سے چہرے
انگیٹھیوں پہ کٹورے، گلاس اور پلیٹیں سجائے
خوشبو میں بسے
مہک کے خواب لانے والوں کا
انتظار کر کر کے
چاندی ہو گئے ہیں۔
میرے چہرے کی طرح کے سفید ململ کے رومال
اب کوئی استعمال نہیں کرتا ہے
وہ زیتون کے پھول جمع کرنے والی لڑکیاں
کہ جن کی کمر میں ہوائیں ہاتھ ڈال کر
اپنائیت کا احساس دلاتی تھیں
وہ اب بھی کوری ململ کی طرح ہیں۔
پیوند۔ لُقمہ، گھونٹ
کیا زندگی یونہی بیتے گی!
بچپن میں ہم چلنا سیکھتے ہیں
اور سب اس بات پر ناز کرتے ہیں
کہ ہم اپنے پیروں پر چل سکیں
مگر جب جوان ہو جائیں
تو دوسرے اپنے پیروں کے نقوش پر چلا کر
ہماری اپنی چلنے کی حس مار ڈالتے ہیں۔
ہوا نے زہر بارات سجائی ہے
ہر گھر میں دمکتی لو کو زنجیر کرنے کا آخری حربہ،
چڑیاں پتھرا رہی ہیں

اور درختوں کے اندر

بانسریاں بج رہی ہیں

اس سے پہلے کہ ہوا پہاڑوں پر دَم توڑ دے

لہروں میں چمکتی روشنی کی آخری کرنوں کو

زنجیر کر لو !

شیشے پہ گری ہوئی پھول کی پتّیاں

زندگی کی آخری نشانیاں ہیں

پَر کٹے پرندے

سُنا

وُہ کہتے ہیں کہ کٹی ہوئی شاخوں کے درختوں پہ

چڑیاں آ کر نہیں بیٹھتی ہیں

نہیں چہچہاتی ہیں

تمہارے کٹے ہوئے بالوں کے شجر پہ

میری آرزو کی چڑیاں کیسے بیٹھیں

کیسے چہچہائیں

سُنا

وہ کہتے ہیں دُھواں دیتی آرزوؤں کے زنداں میں

پھول کھلنے کا موسم نہیں آتا ہے
تمہارے دانتوں کے زنداں میں
میری زبان کو ذائقہ نہیں ملتا ہے
میرے خواب کو راستہ نہیں ملتا ہے

سُنا
وُہ کہتے ہیں
خُدا بنتے انسانوں کے بیچ
خُدا کبھی نہیں آتا ہے
کبھی مہرباں نہیں ہوتا ہے
تمہاری آنکھوں میں خُشک سالی کا موسم
ہونٹوں پر پپڑیاں بن کر جم گیا ہے
خون آنکھوں سے بھی کم گیا ہے

سُنا
وہ کہتے ہیں
آنکھ بھی سب کچھ دیکھنے سے ڈرتی ہے

ہمیں
درخت چلتے ہُوئے اور گاڑی ٹھہری ہُوئی معلوم ہوتی ہے
نہ کہیں قیام نہ کوئی فاصلہ،
کہ جس کو طے کریں
تو خُشک سالی کا موسم ختم ہو

ہم سب ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں
اور نہ ایک دوسرے کو مار ڈالتے ہیں
آنکھوں کو قتل گاہ سے فیض یاب کرنے کے لیے
ہم بائبل کی تلاوت کرتے ہیں۔
وہ دیکھو درخت کی ایک شاخ
دیوار پھاڑ کر ادھر آنکلی ہے
کہ موت کے بستر پر درختوں کے خواب
مجھے جگا رہے ہیں
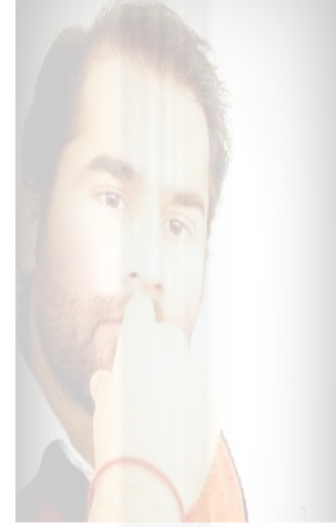
بند مٹھیاں — بھنچے ہونٹ

آنگن کی دیوار کی ایک اینٹ اُکھڑی
تو بچوں نے خالی جگہ کے سہارے
ساری اینٹیں اُکھاڑ ڈالیں۔
گلی کے سارے رستے
کسی کے بیاہ کے جشن میں بند تھے۔
مجھے پتھروں پہ چل کے دریا کنارے جانا پڑا
دریا میں سارا شہر اُلٹا نظر آ رہا تھا
گھروں کی چھتیں دریا کی تہہ میں نظر آ رہی تھیں
کیا یہی اصل ہے:
اصل تو یہ بھی نہیں کہ میں، میں ہوں

اے رات تُو بتا!

دوستی کی صبح طلوع ہو تو

آنگن میں گزشتہ کے سوکھے

پتوں کے ڈھیر تلے

سانس لیتی کونپل کی رُونمائی ہو۔

زندگی کے سمندر میں تُو

لوگ رات سے دوستی کا رشتہ

باندھا کرتے تھے

اندھے جہازوں کو رستہ دکھاتے تھے

اور گھروں کی دیواروں پہ

چراغ جلا کر

انتظار کا تعویذ پہن کر

مجسم دُعا بن جاتے تھے۔

اس زمانے میں

گھروں سے نکلنے والوں کو

شک کی وردی نہیں

درویشی کی قبا پہنائی جاتی تھی۔

اُس زمانے میں میرے گنہ کا شاہد

بس میرا خُدا ہوتا تھا

کہ پردے رکھنے کی گواہی

کبھی انحراف میں تبدیل نہیں ہوئی تھی۔

اُس زمانے میں بھی

اگر دس بجے رات کے بعد گھروں سے نکلنے والوں کی

تلاشیاں لی جاتیں

تو پھر

ستاروں کے ذریعے راستہ تلاش کرنے والے

منزل پہ کیسے پہنچتے

ہمیں بھی منزل اسی لیے نہ ملی
کہ ہم ستارۂ سحری کی صداقت
کی گواہی نہ بن سکے
اور سوتے رہے ۔
ہمیں بھی منزل اسی لیے نہ ملی
کہ کوتوالِ شہر
خود اپنی تلاشی کے خوف سے
گھروں سے باہر نکل کر
خلقت کی ڈیوڑھیوں پر
مفلسی کی ڈائنوں کا رقص نہ دیکھ سکے ۔
قیامت کے دن
جب ہم اپنی اپنی قبروں سے اُٹھائے جائیں گے
تو ان حق تلفیوں کا کفّارہ کون ادا کرے گا
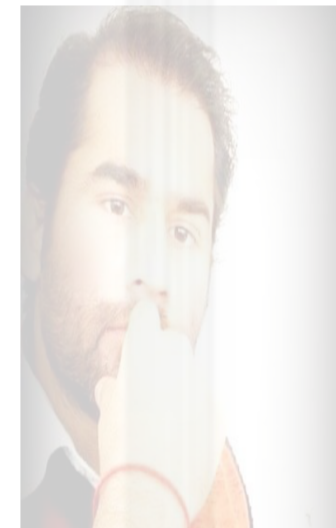
روزنامچہ

میرے ہر آج کو گزشتہ بنانے والوں نے
اپنے ناموں کے سامنے اوصاف
اور میرے نام کے سامنے دُشنام لکھی ہے ۔
میری تاریخ کو زنجیر پہنانے والوں نے
میرے گھر کے سامنے سلاخیں
اور اپنے گھر کے سامنے
عشق پیچاں کی بیل سجائی ہے ۔
میری گویائی کو تصویر بنانے والوں نے
اپنے لیے لونگ پلے
اور میرے لیے کنویں بنا لیے ہیں ۔

سروں کے ڈول سے
گویائی کی رسّی باندھ کر
سچائی کا پانی بھرنے
پنہارنیں کب آئیں گی !
کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد
دُنیا میں مرد کم ہو گئے تھے
تو عورتوں نے ہی چھنی چھنی
دھوئیں کے بادلوں سے
خوشحالی کا مینہ برسایا تھا ۔
امن کا میگھ
خوش حالی کا مینہ ،
اندھی اور دیکھنے والی آنکھوں سے نکلتے آنسو
بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں ۔
ان ہاتھوں کو بلند رکھو
کہ نیچے آئے
تو بریدہ ہوں گے

ان ہونٹوں کو مصروفِ گفتار رکھو
کہ خاموش ہوئے
تو سی دیے جائیں گے ۔
سنو !
آگ کو آگ نہیں بجھا سکتی

آخری فیصلہ

کانٹوں کی چٹان پہ کھڑی
مَیں آنکھوں کی سوئیاں نکال رہی ہوں
یہ علاقہ کس سلطنت میں شامل ہے۔
ملوکیت، میری زبان پہ کانٹے
حلق میں پھندا
آنکھیں باہر،
شاہ بلوط کے لمبے درختوں جیسے
لمبے پُوت، بہت ہو گئے ہیں۔
جنگل میں درخت زیادہ ہو جائیں
تو آگ لگا کر درخت کم کر دیے جاتے ہیں

باہر نکلی ہوئی آنکھ سے زعفران کا کھیت
اور کٹے ہُوئے بازوؤں سے گنّے کی پوریاں بن گئی ہیں۔
ہم نے ایک جھوٹ بولا تھا نا!
اب ساری عمر اُس کو سچ ثابت کرنے میں گزار دیں گے
ہم کہ جو زندگی بھر
اپنے حصّے کی روٹی کمانے کی کوشش کرتے ہیں
اور بھُوکے رہتے ہیں۔
جھوٹی آس کی چھتری تلے
بُلبُلے جیسے آنسو
بتاشوں کی طرح تھال میں سجائے
کب تک یہ بتلاتی رہو گی
کہ وہ تمہارا قاتل نہیں ہے
قتل محض ثانیے میں
زندگی کا رشتہ ختم کرنے کا نام نہیں
موجود سے انکار بھی
تو قتل کے مترادف ہوتا ہے۔

میرا جی کرتا ہے
وہ جو سب میرے قاتل ہیں
میں انھیں ہوا کی طرح نگل جاؤں

موت کا بیج

سُنا تھا جنگ کے زمانے میں
دھوپ بھی خُونی ہوتی ہے
ہمارے زمانے میں جنگ نہ تھی
مگر دھوپ خُون روتی تھی
سڑکیں خنجر تھیں
کہ قاش در قاش
جسموں کے ڈھیروں پہ
امن کی سفید چادر ڈال دیا کرتی تھیں
قبر میں دماغوں کو دفن کرنے
اور مٹی کھانے کے لیے

کر گنے کی طرح

ہم اپنے بچپن کو چُوس کر

زندگی میں مٹھاس گھولتے رہے ہیں

سائرن' ہمارے معاشرے کی آواز ہے

اور اندھے آئینے ہماری تصویر۔

عجیب الخلقت بچے جننے والی ماؤں کی نسل

ہم لوگوں کے چہروں کی بے چہرگی بھی دیکھ رہی ہے

آگ اور برف کے درمیان آنکھیں

یورپ کے شہر برف تلے دبے ہیں

اور میرا دل بھی

سُنا ہے وہاں لوگ ٹرینوں میں

پھنسے رہ گئے

تو اخباروں کی شہ سُرخیاں بنیں

ہم کہ یہاں بے جہت رواں ہیں

اور نہیں جانتے کہ کہاں جانا ہے

ہماری خبریں اخباروں میں کیوں نہیں آتی ہیں

مُردوں کی آنکھیں زندہ لوگوں کی بینائی تو بن رہی ہیں

مگر زندہ لوگوں کی زندہ آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں
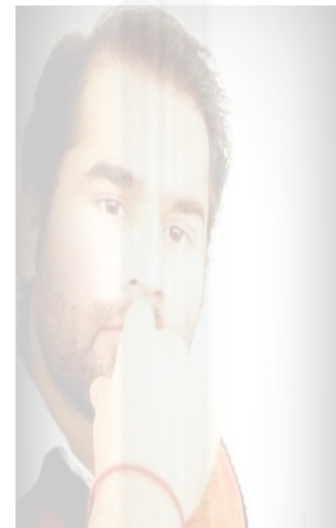
سچ کو جھوٹ کی میزان میں تُلتے
کہ شہروں کو امن کے نام پر
لاشوں سے پٹتے ۔
یقین کرو بارش نہیں ہوگی ۔
رحمت میرے رب کی
خبیث لوگوں کے لیے نہیں ہے

دیپک راگ

جانے والے چلے جاتے ہیں
کبھی بُلاوے پہ
کبھی بن بُلائے ۔
کہتے ہیں بن بُلائے جانے والے
نصیبوں والے نہیں ہوتے ہیں
مگر وہ تو بڑا سوہنا
بڑا نصیبوں والا تھا
اُس کے بدن میں پیاس بھری تھی
اس کی آنکھوں میں بولتا دیپک راگ
سُلگ اُٹھا تھا

اس کا انگ انگ سلگ اُٹھا تھا
جہنم کی آگ سے ڈرانے والوں نے
اس آگ کو گلزار بنانے کی دُعا کیوں نہیں کی
آتش پرستوں نے اِس آگ کو
سجدہ کیوں نہیں کیا
خواب میں آگ دیکھ کر تعبیر بتانے والوں نے
جاگتے میں آگ دیکھ کر تعبیر کیوں نہیں بتائی
مجھے بتاؤ
کیا لفظ بھی اُس کے ساتھ جُھلس کر مر گئے تھے!

محاسبہ

جو تم نہیں سمجھتے وہ ازل ہے
اور جسے تم سمجھ کر انجان بننا چاہتے ہو
وہ ابد ہے۔
ستاروں کی گنتی کس نے کی
جس نے بھی کی، اُس کو
اپنے اندازے کے ستاروں کا علم ہُوا۔
علم کیا ہے
جب پوچھو آسمان نیلا کیوں ہے
سمندر نیلا کیوں ہے
گھاس کا رنگ گہرا سبز

اور کونپلوں کا رنگ ہلکا سبز کیوں ہے
تو کوئی اسے سائنسی مکاشفے کا نام دیتا ہے
تو کوئی قدرت کی صناعی کا ۔
لوگ تو قبر میں چٹختی ہڈیوں کی آواز کو بھی
قدرت کا کرشمہ سمجھ لیتے ہیں ۔
ذرّوں کی طرح گرتی برف
زمین کے وصال سے کس قدر سخت ہو جاتی ہے
ہم درخت تلے ہوں تو ہمارا سایہ
کتنے حصّوں میں بٹ جاتا ہے
ہم سب خواہشوں کے درختوں تلے
حصّوں میں بٹے ہوئے سائے ہیں ۔
پچھلے برس کے کپڑے مجھے تنگ ہو گئے ہیں
اس وقت میرا سایہ میری گرفت میں تھا
ڈھیلی گرفت اور تنگ کپڑے
دیکھنا کہیں زمین بھی تو تنگ نہیں ہو رہی !

تیسرے درجے والوں کی پہلی ضرورت

بولنا ہماری ضرورت ہے
چاہے زمین میں مُنہ دے کر ہی کیوں نہ بولنا پڑے ۔
میری بے گنتی زمین میں منہ دے کر
اپنی صفائی پیش کر رہی ہے
کہ زندگی کے سارے راستوں پر
قاضیِ شہر کے فیصلے کے مطابق
خوف بچھایا جا چکا ہے ۔
بولنے والے ہمارے شہر میں کتنے رہ گئے ہیں
ان کے سر کاٹ کر واقعی سجا لینے چاہئیں
کہ پھر دیکھنے کو بھی ایسے لوگ نہیں ملیں گے

خدا کی قسم
میری آنکھوں کی جگہ آبلے بھی لے لیں
تو بھی مَیں گریہ کروں گی
کہ میرے کھیتوں میں چیخیں اُگ رہی ہیں
میرے آنگنوں میں ٹھہری خاموشی
میرے بچوں کی ہنسی لوٹ رہی ہے
میرا چپڑاسی وردی پہننے سے انکار کرتا ہے
کہ وردیاں تیسرے درجے کے شہری کی علامت بن چکی ہیں۔
بات تو علامت سے بھی آگے نکل چکی ہے
چھپکلی کی کٹی دُم کی علامت ہو کر
بُوٹے خوں کی علامت
اب سب خوف کے دوسرے نام ہیں
ہم لوگوں کو اپنے ہی وطن میں جلا وطن کر دیا گیا ہے
کہ ہم بے رُوح جاندار، قصدِ گویائی سے بھی منحرف ہیں

"نائٹ میئر"

بکری، ذبح ہونے کا انتظار کرتی ہے
اور مَیں صبح ہونے کا۔
کہ مَیں روز دفتر کی میز پر ذبح ہوتی ہوں
جھوٹ بولنے کے لیے
یہی میری قیمت ہے۔
تازہ قبروں کی طرح، پاؤڈر سے پلے ہوئے چہرے
مجھے ملنے آتے ہیں
ذہنوں کے قبرستان میں ایسی سجاوٹیں ہی
زیب دیتی ہیں
مَیں اور میرا وطن ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے

مگر دونوں کی بصارت بچپن ہی میں ماری گئی ۔
میں نے روٹی دیکھی نہیں
اپنے تصور میں اس کی شکل بناتی اور کھاتی ہوں
میرے بہت سے ہم عمر، روٹی صرف خواب میں دیکھتے ہیں ۔
میرے ملک میں عورتیں پہلی کا چاند دیکھ کر دعائیں مانگتی ہیں
اور باقی ساری دعائیں اگلی پہلی کے لیے اٹھا رکھتی ہیں ۔
دوسری شادی کے اجازت نامے پہ انگوٹھا لگانے کے بعد بھی
وہ پہلی کا چاند دیکھ کر دعائیں مانگتی رہتی ہیں،
شاید ہم جیسے جھوٹ بولنے والوں کی عاقبت سنوارنے کے لیے ۔
ہم اپنی جنگجویانہ بہادری کے گُن گاتے ہیں
اور مکھیاں ہم پر یلغار کرتی رہتی ہیں ۔
ہم اپنے قد سے لمبی تلوار کو اسلاف مانتے ہیں
اور ان کا زنگ اپنی زبانوں پر سجا لیتے ہیں
زنگ خوردہ زبانوں اور زمانوں میں زندگی کرنے والوں کا نام
دفتری بابو ہوتا ہے ۔
جانے والے کا ہر حساب غلط
اور آنے والے کا ہر حساب درست
زنگ خوردہ زبانیں ہی کہہ سکتی ہیں
اب تو تلوار بنانے والا آہن گر، یہ سمجھتا ہے
کہ فتح، وہ تحریر کرتا ہے

کوکلا چھپائی

اندھیرے میں دیکھنے میں بڑا مزہ آتا ہے
اپنے اندازے کے مطابق
تصوّرات ڈھلتے، بڑھتے اور سنورتے ہیں۔
اندھیرے میں چلنے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے
کسی بھی ٹھوکر کو انجانے میں کہہ کر
قابلِ معافی سمجھا جاسکتا ہے۔
اندھیرے میں رونے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے
ہنستے ہونٹوں اور روتی آنکھوں کا بہروپ
نہیں بھرنا پڑتا
ہاں سسکیوں کو قہقہوں کا آہنگ
دینا پڑتا ہے۔
اندھیرے میں بھاگنے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے
نہ گھبراہٹ عریاں ہوتی ہے
نہ خوف کا پردہ چاک ہوتا ہے
چڑھا ہُوا سانس، بیٹھتی جھاگ کی طرح
قطرہ قطرہ ماتھے سے گرتا ہے۔
اندھیرے میں ڈوبنے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے
زندگی سے ٹوٹتے رشتے کی آخری گرہ کھلے
تو درختوں سے پرندے بھی ڈر کر اُڑ جاتے ہیں
میرے ہاتھوں پہ اندھیرے کی لکیریں
اندھیرے میں ہی پڑھ لو
روشنی جانتی ہے
کہ میلے ہاتھوں کے مقدّر، کتنے میلے ہوتے ہیں

سونے سے پہلے ایک خیال

مجھے نومبر کی دُھوپ کی طرح مت چاہو
کہ اس میں ڈوبو تو تمازت میں نہا جاؤ
اور اس سے الگ ہو تو
ٹھنڈک کو پور پور میں اُترتا دیکھو۔
مجھے ساون کے بادل کی طرح مت چاہو
کہ اس کا سایہ ، بہت گہرا
نس نس میں پیاس بجھانے والا
مگر اس کا وجود پل میں ہوا
پل میں پانی کا ڈھیر۔
مجھے شام کی شفق کی طرح مت چاہو
کہ آسمان کے قرمزی رنگوں کی طرح
میرے گال سُرخ
مگر لمحہ بھر بعد
ہجر میں نہا کر ، رات سی مَیلی مَیلی۔
مجھے چلتی ہوا کی طرح مت چاہو
کہ جس کے قیام سے دَم گھٹتا ہے
اور جس کی تیز روی قدم اُکھیڑ دیتی ہے۔
مجھے ٹھہرے پانی کی طرح مت چاہو
کہ مَیں اس میں کنول بن کے نہیں رہ سکتی ہوں
مجھے بس اتنا چاہو
کہ مجھ میں چاہے جانے کی خواہش جاگ اُٹھے!

پیوند

یہ موسم کے سرد اور ویران دنوں کی بات ہے

تم نے میری عمر کی شاخ کی قلم کاٹی

اور ایسے لگایا

کہ وہ سرسبز، ہری بھری جھاڑی بن گئی۔

مگر تمہاری زبان کے ذائقے میں

میرے علاوہ اور کون شریک ہے

کہ میری زبان کبھی کبھی کڑوی ہو جاتی ہے۔

مَیں اپنی ٹھنڈی سانسوں کو

کئی دفعہ آزاد کرتی ہوں

کڑواہٹ سے آزاد ہونے کے لیے

شعلگی سے بچنے کے لیے

مگر مجھے یُوں لگتا ہے

جیسے مَیں دریا میں ایک ٹانگ پر

کھڑی ہوں، اور میری ایک آنکھ میں روشنی

اور ایک میں تاریکی ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں

تمہارے دانتوں پر برف کا گمان ہوتا ہے

کندن کا نہیں

تبھی تو، خشک اور سرد ہواؤں سے

جسم چٹخنے لگتا ہے

مگر تم نے تو

ایسے ہی چٹخنے موسم میں

میری عمر کی شاخ کی قلم لگائی تھی۔

برف کے ٹوٹنے اور پگھلنے کا اگلا موسم

پھر آگیا

ذائقہ تحریر کرتے کرتے
ذائقے میں تحلیل ہونے کے دن
چاند کے بڑھنے کے دنوں میں
مجھے سکھا رہے ہیں ،
شام کی سیاہی کا پہلا عکس
خوش نما
اور صبح کی سیاہی کا آخری عکس
خوش کن ہوتا ہے
تم ان دونوں سیاہیوں کو
اپنے ہونٹوں میں لپیٹ لو
میرے ہونٹوں پر تمہارا ہاتھ
ساری سیاہیوں کو دھو دے گا

سمندر کی پیاس کا بُلاوا

تم جب آتے ہو
تمہارے ہاتھ میں سفید پھول ہوتے ہیں
میرے پیار کی گرمی انہیں سُرخ کر دیتی ہے
تم میرے دہکتے لفظوں سے ڈر جاتے ہو
بھلا آئینے میں آگ کا عکس بھی
خوف زدہ کر سکتا ہے
میں ہر روز اپنا کمرہ صاف کر کے
اور اپنے آپ کو سنبھال کے بیٹھتی ہوں
کہ تم آؤ گے ۔
جب درختوں کے وصل سے مغلوب ہو کر

رات بھیگ کر سو جاتی ہے

مَیں پھر کمرے کو بے ترتیب کر دیتی ہوں

مگر تم ہمیشہ کی طرح پُر سکون

ہاتھ میں سفید پھول لیے

میرے اندر کے پت جھڑ سے بے خبر

رات اور دن کی ساری حلاوتوں کو سمیٹے

چلے آتے ہو ، جب چاہتے ہو

اور مجھے ، اس وقت ، سمندر کی پیاس کا احساس ہوتا ہے ۔

تمہیں معلوم ہے نا !

ساحل پہ رہ جانے والی جھاگ میں

تموج نہیں ہوتا ہے

میرے اندر کی مَوجیں

جب تمہیں پُکارا کریں

آجایا کرو

تم نے آسمان جیسا ، بے وصال رنگ

میری موجوں میں پرو دیا ہے

تمہاری آنکھوں کی نیلاہٹ

میرا لباس ہے

مگر سُنو

میرے اندر کی موجیں جب تمہیں پُکارا کریں

آجایا کرو !

زمین میری ہم عمر

جن زمینوں پر، ہر چیز مائل پرواز ہو
وہاں سے گزر کر جاؤ
تو پھر تمہیں قبرستان ملے گا
تم کیا جانو، یہ درخت، یہ پتھر
یہ چٹانیں
تمہاری نسلوں سے پہلے
انسانوں جیسے ہی تو تھے
قبروں جیسے، دیکھنے آنے والوں کے منتظر
یہ پہاڑ، یہ پتھر، دیکھتے ہیں،
مَیں لیٹوں تو یہ زمین میرے برابر کی لگتی ہے

اور جنگل میرے اندر سانس لیتے ہیں
پھر بھی مَیں
پتھر جیسی، قبروں جیسی
اور سوکھے پتوں جیسی بن کے
سچ مچ قبر نہ بن جاؤں

تم نے مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا ہے
تم نے مجھ سے ملنے سے پہلے
وہ لفظ سیکھے جنہیں اڑن کھٹولہ بنا کے
جہانوں پار جایا جا سکتا ہے
پھر تم نے اپنے وجود کی کشتی
بحرِ مراد میں ڈال دی
اتنے بھروسے کی تسبیح کہاں سے آئی
کہ اب مجھے تمہارے بنا
روشنی اور تاریکی میں تمیز کرنی نہیں آتی ہے
تم نے میرا انتظار

اپنی قوتِ انتظار سے بڑھ کر لیا ہے

یہ درخت ، یہ پتھر، یہ چٹانیں

تمہاری قوتِ انتظار کے آئینے ہیں

ساحلوں پہ بکھرے سارے پتھر

تمہارے انتظار کے لمحے سمجھ کر

میں نے جمع کر لیے ہیں

مَیں نے تمہارے سارے راز چکھ لیے ہیں

آؤ میری جانب

پرواز کرتے ہوئے آؤ

تمہاری اونچی چٹانوں پر

میرے سانسوں کے درخت

کتنے سرو قد لگ رہے ہیں

مَیں نیند میں بھی نیند کی کیفیت

کے خواب دیکھتی ہوں

اور اس وقت

مجھے زمین اپنے برابر کی لگتی ہے
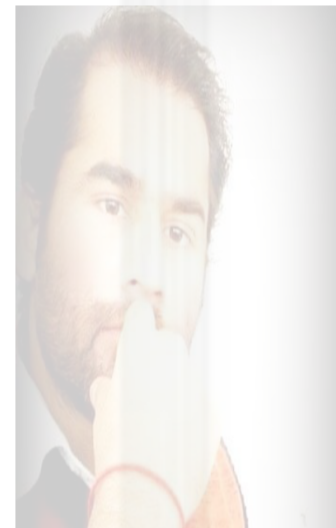
بہت سے قصّوں میں سے ایک قصّہ

کھانے کی میز پہ گرد پڑی تھی

مَیں نے اسے کھایا تو نہیں

البتہ اپنی انگلی سے

اس گرد سے وہ لکھ دیا

جو تم کو بتانے کا حوصلہ نہیں پاتی تھی

زرد دائرہ

چراگاہوں سے پلٹتے ریوڑ
اور گھروں سے رخصت ہوتی دُلہنیں
ایک سا منظر ہوتا ہے۔
گلے میں بندھی ہُوئی گھنٹیاں زبان بن جاتی ہیں
گلے میں لٹکی گھنٹیاں اور چلتے پاؤں
میرے مولا! کیا ہم زندہ ہیں
شہد کی مکھیوں کے چھتوں کی طرح
حُجلۂ عروسی
خوشیوں کے گیس چیمبرز بن جاتے ہیں۔

مرے رزق میں میرا ایمان شامل نہیں رہا

کہ میری اپنی آنکھ
خواب کچھ دیکھتی ہے اور بیان کچھ کرتی ہے

آنکھ مچولی کے اس موسم میں
تم مجھ سے مت ملنا
مُنہ پر ہاتھ رکھ کر اور انجان بن کر
مَیں تمہیں ڈھونڈنا نہیں چاہتی ہوں
مَیں نے تمہیں دیکھا ہے اور دیکھتے رہنا چاہتی ہوں۔

آنکھ کا رُتبہ مرے خواب کی خواہش تھی
اب جب کہ میری بات، مرے ہاتھ
سب خالی ہیں
ان کو شہرِ مُراد کا رستہ کون دکھلائے گا
مرے رزق میں میرے ایمان کو کون شامل کرے گا
کہ ہَوا کٹے ہُوئے پَروں کو اُڑنا نہیں سکھا سکتی
کہ ہَوا جاگتی آنکھ میں نیند کا رُتبہ نہیں پا سکتی۔
مَیں شہر کی تاریکی کس رنگ میں ڈبو دوں

کہ میری آنکھوں کا یرقان ڈھل جائے

کچّے ناریل کے چھُپے جسم کی طرح
تم رزق کی چٹانوں سے کب نکلو گے
کہ میں آنکھ مچولی میں ہاتھ لگ جانے والے شخص
کا مقدر نہیں بننا چاہتی ہوں
کہ میں گلے میں بندھی ٹوٹی گھنٹیوں کی زبان
بننا نہیں چاہتی ہوں
میں کیا بننا چاہتی ہوں
کہ چراگاہوں سے پلٹتے ریوڑ
اور گھروں سے رخصت ہوتی دُلہن
ایک سا منظر ہوتا ہے

تاریخ اپنے آپ کو نہیں دُہراتی

کہتے ہیں
مائیکل اینجلو
ایک بوسے سے
جیتا جاگتا انسان بن گیا تھا
انسان بنانے کے لیے
آدمی کے سامنے
موت کا رقص کرو
کہ زہر کا پیالہ پیو
مگر وہ تو بوسہ لیتے ہی
پتھر کا آدمی بن جاتا ہے

مُجھ سے ملو تو پہلے
میرے اُن لمحوں سے ملنا
کہ جن کی رفاقت نے
میرے آنسوؤں کو شبنمستان بنایا ہے
تم مجھے ملو، بے خوف ہو کر
کہ مَیں تمہیں بھی وہاں چھپا کر رکھوں گی
جہاں مَیں اپنے وعدے چُھپا کر رکھتی ہوں

ری اشورنس

مَیں اتنی بُزدل ہوں
کہ تمہارا نام نہیں لے سکتی
مَیں اتنی بہادر ہوں
کہ تمہارے تصور کو اپنے اندر آباد رکھتی ہوں
تمہارے وجود کو لفظوں میں تخلیق کرتی ہوں
اور ہنستی ہوں
تم بھی تو میری ہنسی کو وجود سمجھے تھے
وجود کہ جس کے اندر اُترو تو پتہ چلتا ہے
کہ کچھ کچّے پھل
پکنے سے پہلے ہی گل جاتے ہیں

تمثیلِ تمنّا

اُس کی ہتھیلی پہ لکھے
میرے ٹیلی فون کے نمبر پھیل گئے ہیں
لمس نے رنگ دُہرا کر دیا ہے
سب سے چھپا کے لکھے گئے
ٹیلی فون کا نمبر
سب کے سامنے ہے
کہ اضطراب میں کھلتی، بند ہوتی
ہتھیلی نے سبھا سجائی ہے۔
گرمی اور بڑھے گی
تو یہ نمبر بھی ڈھل جائے گا

مگر کیا وہ نقش بھی
ایسا ہی ہے
جو اُس نے میرا ٹیلی فون نمبر
لکھنے سے پہلے
اپنے دل میں بنایا تھا
کیوں کہ اس کی آواز
اس کا دل ہے
وہ نہیں بولتا
وہ پہلو بدل کے
صرف لب کھولتا ہے
اور اس کا سانس
میرے وجود کے پاتال کو چھُو لیتا ہے۔

ریت پہ تصویر کے بنانے کے دن
تو صحرا نوردوں کی قسمت میں
آتے ہی نہیں

مگر تشنگی کو
آنسوؤں سے بجھا لینا
ان کا مقدر ہوتا ہے۔
وہ ہتھیلی پہ لکھے
ٹیلی فون نمبر کو گھمائے گا
اور وصال کی چھاگل اُلٹ دے گا۔

وہ برف کی تہوں میں چھپے
گھر میں ہے
اور مَیں کھُلے آسمان تلے
جلتی زمین کے سینے پر،
مگر سارے موسم
ٹیلی فون کی لائنوں میں گھُل کر
مجھے ور مالا پہنا رہے ہیں

بشارتوں کے لیے ایک نظم

درخت، جنگلوں میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں
ستارے، کہکشاؤں میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں
قطرے، سمندر میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں
دیواریں گھروں میں
اور رونقیں بازاروں میں
ایک دوسرے سے بات کرتی ہیں
مَیں
اَدھ کھُلی کھڑکیوں کی اَدھوری بات
مَیں نہ قصّہ تھی، جسے بیان کیا جا سکتا
نہ صدا تھی، جسے سُنا جا سکتا

نہ روشنی تھی، جسے دیکھا جا سکتا

میں

تنہائی میں پر کھولنے والے

کبوتر کی طرح تھی

پرواز کے بعد پلٹنے والے راستے سے

مجھے کوئی سروکار نہ تھا

اور ابر پارے کی مانند

ہوا سے رسم و راہ

صرف آوارہ خرامی تک تھی۔

میں

خوش ہوں، کہ تیری آگ میں جل رہی ہوں

خوش ہوں، کہ تیرے خیال سے پابستہ ہوں

خوش ہوں، کہ میری دشت نما راتیں

نخلستان کی مانند گلفشاں ہیں

خوش ہوں، کہ میری بے کنار خصلت

ساحل کی آغوش میں عافیت کو جان گئی ہے

خوش ہوں، کہ تیرے وصال کے بعد

عشقِ بے زوال سے آشنا ہو جاؤں گی

اب کھڑکی بند کر دو!

نہ روشنی تھی، جسے دیکھا جا سکتا
میں
تنہائی میں پر کھولنے والے
کبوتر کی طرح تھی
پرواز کے بعد پلٹنے والے راستے سے
مجھے کوئی سروکار نہ تھا
اور ابر پارے کی مانند
ہوا سے رسم و راہ
صرف آوارہ خرامی تک تھی۔
میں
خوش ہوں، کہ تیری آگ میں جل رہی ہوں
خوش ہوں، کہ تیرے خیال سے پابستہ ہوں
خوش ہوں، کہ میری دشت نما راتیں
نخلستان کی مانند گلفشاں ہیں
خوش ہوں، کہ میری بے کنار خصلت
ساحل کی آغوش میں عافیت کو جان گئی ہے

خوش ہوں، کہ تیرے وصال کے بعد
عشقِ بے زوال سے آشنا ہو جاؤں گی
اب کھڑکی بند کر دو!

نہ روشنی تھی، جسے دیکھا جا سکتا

میں

تنہائی میں پر کھولنے والے

کبوتر کی طرح تھی

پرواز کے بعد پلٹنے والے راستے سے

مجھے کوئی سروکار نہ تھا

اور ابر پارے کی مانند

ہوا سے رسم و راہ

صرف آوارہ خرامی تک تھی۔

میں

خوش ہوں، کہ تیری آگ میں جل رہی ہوں

خوش ہوں، کہ تیرے خیال سے پابستہ ہوں

خوش ہوں، کہ میری دشت نما راتیں

نخلستان کی مانند گلفشاں ہیں

خوش ہوں، کہ میری بے کنار خصلت

ساحل کی آغوش میں عافیت کو جان گئی ہے

خوش ہوں، کہ تیرے وصال کے بعد

عشقِ بے زوال سے آشنا ہو جاؤں گی

اب کھڑکی بند کر دو!

یہ میرے اندر کی نہیں، دروازے کی گھنٹی ہے
بھولنے والے کو یاد کرانے کے لیے
مگر بستر پر پڑی ہوئی بلی کے پنجوں میں
چھپے ہوئے ناخنوں کی طرح
بوتل کی کرچیاں مجھے خود سے وابستہ رکھنے پر
مُصر ہیں۔
ڈوبتے بدن سے بازو بغاوت کرتے ہیں
مگر باہر سے دھندلے شیشے کو ناک چپکا کر
بھی دیکھو تو کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے۔
خلا میں لٹکے بازو تھک کر گر جائیں گے۔
شام پڑتے ہی کوچ کرتے پرندوں کے ساتھ جانے کو
اب میرا بھی جی کرتا ہے
مگر ان پرندوں کو تو اپنے بسیرے کا علم ہوتا ہے
مَیں کہاں جاؤں گی
بارش میں بھیگی سڑکوں پہ روشنیوں کا عکس
میری آنکھوں میں بھی تیر رہا ہے، تارِ عنکبوت کی طرح

دُھند اور سمندر، ایک ساتھ سانس لیتے ہیں
دُھندلی آنکھوں سے دُھند میں پلٹتے سمندر کو دیکھو تو
وسعتیں بھی ہانپتی ہوئی نظر آتی ہیں۔
میرے اندر کا خلا
باہر کے خلا کو گھور رہا ہے
گھنٹی بجتے ہی، خندۂ ناآشنائی
میرے ساتھ کمرے کے رنگ کو بھی زرد کر دیتا ہے۔
کپڑے بھی جاگ اُٹھتے ہیں
اور بدن کے سمندر کے باہر دُھند کو
وصل کی تمازت میں تحلیل کر دینا چاہتے ہیں۔
اب تم رُکی نہیں ہو
جنگل کی سمت مت جاؤ
دن اپنی ساعتوں، عمارتوں اور خصلتوں کے ساتھ
طلوع ہوتا ہے

مُجھ سے چُھپے رہو

میرے تمہارے درمیان لاتعلقی کا جنگل
پھیلتا جا رہا ہے
اپنی مدافعت میں گونگا بن کے بھی
چاند کے چہرے سے خون رِسنا بند نہیں ہُوا۔
سُنا ہے آسمان پر ہمکلام ہونے والے
میری زبان مانگ کر لے جایا کرتے تھے
کہ اس کی چاشنی میں
آسمانوں سے اُترتے حروف لپٹ لپٹ کر
آتے تھے
مگر اب، تو خامشی کی قبر میں لیٹے لیٹے

چمنیوں سے نکلتے دُھوئیں کی طرح
میری انا اور میرا وجود تحلیل ہو چکا ہے
مقبروں کی طرح ویران
اور خوابوں کی طرح کھوکھلے
آنکھوں کے پٹ
پلکوں کے وصال سے بھی محروم ہیں
مَیں ہر جبر کے باوجود
تم نہ بن سکی
مگر تم نے مجھے
مجھ سا بھی کہاں رہنے دیا ہے

ایک نظم اجازتوں کے لیے

تم مجھے پہن سکتے ہو
کہ مَیں نے اپنے آپ کو
دُھلے ہُوئے کپڑے کی طرح
کئی دفعہ نچوڑا ہے
کئی دفعہ سُکھایا ہے
تم مجھے چبا سکتے ہو
کہ مَیں چوسنے والی گولی کی طرح
اپنی مٹھاس کی تہہ گُھلا چُکی ہوں
تم مجھے رُلا سکتے ہو
کہ مَیں نے اپنے آپ کو قتل کرکے
اپنے خون کو پانی پانی کرکے
آنکھوں میں جھیل بنا لی ہے
تم مجھے بُھون سکتے ہو
کہ میری بوٹی بوٹی
تڑپ تڑپ کر
زندگی کی ہر سانس کو
الوداع کہہ چُکی ہے
تم مجھے مسل سکتے ہو
کہ روٹی سوکھنے سے پہلے
خستہ ہو کر بُھربُھری ہو جاتی ہے
تم مجھے تعویذ کی طرح
گھول کر پی جاؤ
تو مَیں کلیساؤں میں بجتی گھنٹیوں میں
اسی طرح طلوع ہوتی رہوں گی
جیسے گُلِ آفتاب!

گود میں لحد

اب مَیں

سونے سے پہلے خود کو مار دیا کرتی ہُوں

کہ میرے اندر سوئی خواہشیں

مجھے سوتا دیکھ کر باہر نہ آجائیں

کہ میرے اندر ٹھہرے

قوّتِ برداشت کے سمندر

بپھر کر مجھے بہا نہ لے جائیں۔

یاد ہے:

مَیں نے تمہارے سگرٹوں کے بجھے ٹکڑوں سے

اپنا وجود بنانے کی کوشش کی تھی

مسلے ہوئے ٹکڑوں سے

مَسلا سا وجود بن تو گیا تھا

مگر اس میں آگ جیسی تپش دُور دُور تک نہیں تھی

پھر مَیں نے جوتوں کے گِھسے ہُوئے تلوں سے

اپنا وجود بنانے کی کوشش کی

یہ کام آسان بھی تھا

کہ ہر تلے پر میرے جسم کے کسی نہ کسی حصّے کا

نقش موجود تھا

مگر اس سارے وجود میں

کوئی حرکت، کوئی دھڑکن نہیں تھی

پھر مَیں نے اپنی آنکھوں کا پانی نچوڑ کر

دھنک بنانے کی کوشش کی

دھنک نے مجھ سے کہا

اپنی قاش قاش کو

میری طرح کماندار بنا لو

کُوڑے کے ڈھیر جیسے میرے وجود نے

اس خیال کو بھی خواب سمجھا

اور میں کمرے کی تنہائی، پہن کر بیٹھ گئی

سانس اور پھانس

مرنے والے کے اعزاز میں

دو منٹ کی خاموشی

اس کی عزت و احترام کا اظہار ہے

مگر جیتے جی

ایک ہی گھر اور ایک ہی چھت کے تلے

عمر بھر کی خاموشی

کس کی تکریم کی نشانی بنتی ہے

ماچس کی تیلیوں کی طرح

آتش گیر مادے کے باوصف

آپس میں بے چون و چرا منسلک

بقائے باہمی ۔ کولڈ وار ۔ ڈپلومیسی
بارش سے بیٹھ جانے والی قبر
اور ہونٹوں سے جھڑ جاتے والی بات میں
کوئی خاص فرق تو نہیں ہوتا ہے ۔
زیادہ دیر سوؤ تو خواب بھی
ساتھ چھوڑ جاتے ہیں
پانیوں میں چھپے غیر آباد
جزیروں کی خبر کون لائے گا
اندھیروں نے تو دماغوں ، گھروں
اور شہروں پر ایسے تسلط جمایا ہے
کہ روشنی کی کمر بھی دوہری ہوگئی ہے
روشنی اپنے آپ کو کہاں کہاں تقسیم کرے !
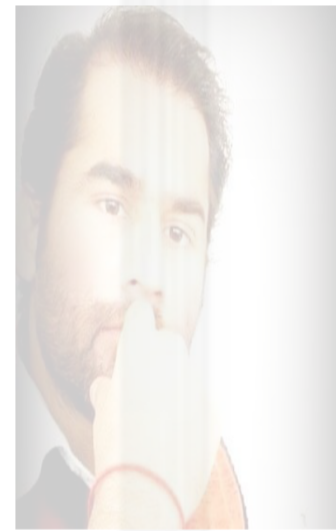
بارھویں شب کا چاند

تمہارے خیالوں سے میرا کمرہ بھرا ہے
اور مَیں تمہارے سانسوں میں سانس لے رہی ہوں
میرے ہاتھوں میں میخیں ٹھکی ہیں
اور میرے پَیر بندھے ہیں
آسماں کا تیز دھار اُفق
میری آنکھوں کے منظر کو کاٹنا چاہتا ہے ۔
کہتے ہیں پورے چاند کو گہن لگ جاتا ہے
مگر آج تو بارھویں شب ہے
پورے سے ذرا سا کم چاند !
گہن کا جوالامکھی کہیں اور پھٹے گا

مگر شغلیں تو میرے ہاتھ میں ہیں

اور تنہائی میرے گھر میں۔

خواہش میرے اندر انگڑائی لیتے لیتے

مُردہ سی ہو گئی ہے۔

مرے آخری خواب میں مری آخری خواہش کا نوحہ تھا

اور اس وقت میرے ہونٹوں پر زہر کا رنگ۔

تم ایک رات سے اتنی ساری توقعات

کیوں وابستہ کرتی ہو!

خیالوں سے بھرے کمرے میں

تنہا کیسے ہو گئیں

شام بغیر کہے چپکے سے چلی جاتی ہے

میرے اندر کوئی ہے جو یہ جانتا ہے

ریل کی پٹڑیوں کے نیچے کٹی ہُوئی نظم

کورے کاغذ پہ بن لکھے رشتے

مَیں نے پڑھ لیے ہیں

ہم تو بِن مانگے مل جانے والوں میں سے ہیں۔

جُھنگے میں دیے گئے مال کی بھلا کیا قیمت!

رشتوں کے بہت سے نام ہیں

آخر قاتل و مقتول کا بھی تو رشتہ ہوتا ہے

میرے تمہارے رشتے میں

خون کی مہک اور جذبے کی ارزانی نہ تھی

وہ تو حرف کی پازیب بجاتا

ز ہ زینہ لب تک پہنچتا تھا

کورے کاغذ

کورے جذبوں جیسے نہیں ہوتے ہیں

وہ تو جذبوں کے اجاڑ بن کی

خزاں آلودہ شاموں جیسے

اور طاقوں میں جلے دیوں

سے کالی ہوئی دیوار جیسے ہوتے ہیں

کورے کاغذ

اور دُھلی ہوئی آنکھیں

کورے کاغذ

اور سوکھے ہونٹوں کے بوسے

کورے کاغذ

اور بستروں کی بے شکن چادروں کا اتصال۔

آخر زمانہ کورے بدن کی چاہت میں

اتنا بے چین کیوں ہو جاتا ہے

کیونکہ شہر میں پہلے داخل ہونے والے

کے گلے میں مالا پہنائی جاتی ہے

کہ درخت کا پہلا پھل

شگن کے طور پر تقسیم کیا جاتا ہے

کہ پہلا پیار

سن خوردہ اعصاب کا نوسٹیلجیا ہے۔

چابی کھو جائے

تو نئی چابی بازار سے بن جاتی ہے

زمین خشک ہو تو

نہر کا پانی سیراب کر دیتا ہے

آنکھیں جاتی رہیں

تو دوسروں کی آنکھیں لگا دی جاتی ہیں

جب ہر چیز کا بدل ممکن ہے

تو پھر انسان کا بدل کیوں ممکن نہیں

کہ ہم واپس اسی کی طرف لے جائے جائیں گے

چاہے ریل کی پٹڑیوں کے نیچے آن کر مریں

کہ کندھوں پر لے جائے جائیں

مگر کس کی طرف

کہ جس نے میرا مقدر
زندگی میں ریزہ ریزہ بکھرنا
اور مر کے بھی بوٹی بوٹی
ریل کی پٹڑیوں سے اُلجھنا لکھا ہے
وہ لوحِ محفوظ
اس کورے کاغذ کی طرح ہے
کہ جسے آگ دکھاؤ
تو حرف روشن ہو جاتے ہیں
میں نے تمہارے کورے کاغذ کو بھی
دل کی آگ دکھائی
مگر اس برف نے پگھلنے سے انکار کر دیا

مَیں اور مَیں

مَیں کتابوں کے جنگلوں میں رہتی ہوں
کہ سبز شاخوں جیسی کتابیں
لفظ و معنی کے گھنیرے سائے میں
میرے وجود، میرے جسم کے الاؤ کو
سمیٹتی ہیں اور آسودہ کرتی ہیں
مَیں ایک اکیلی تو نہیں
میرے اندر کئی عورتیں قید ہیں

ایک وہ کہ جس نے نسلِ آدم کی
تخلیق کے سلسلے کو اپنے خون سے
مربوط کیا

مگر گھر میں سب کا بچا ہُوا کھا کر
رب کا شکر ادا کیا

ایک وہ کہ جس نے مرد کی دُنیا میں
دخیل ہو کر
آمنے سامنے اور آگے پیچھے کے
سارے بوجھ اُٹھا کر
اپنے لیے اور زمانے کے لیے
خوف کی دیوار کھڑی کی
اور شبہے کی دُھول اُڑا دی

ایک وہ کہ جس نے اپنے وجود کے غازے سے
زندگی کو آبدار کیا
اور تحیّر میں پڑے زمانے نے
آغوش وَا کیے اُس کا انتظار کیا

ایک وہ کہ جس نے
یشودھرا بننے سے انکار کیا
نورجہاں بننے سے انکار کیا
ممتاز محل بننے سے انکار کیا
جس نے قرۃ العین کی طرح
اپنے لب آزاد رکھے
مگر اس سے پہلے کہ اُسے
بال باندھ کر زمین پر گھسیٹا جاتا
اُس نے خود ہی بال کٹوا دیے

ایک وہ کہ جس نے
دنوں میں بہادری
اور راتوں میں بُزدلی کی کہانیاں
تحریر کیں
جس نے اندھیروں میں
مٹھیاں بھینچیں
اور روشنیوں میں
خود چراغ بن کر آویزاں ہوئی

ایک وہ کہ جس نے
معشوق کے ملبوس کو ترک کیا
آپے رانجھا ہوئی
خوابوں کی بشارت نہیں مانی
اور سرگوشیوں کو شہرِ ممنوع
کی زبان سمجھا

ایک وہ جو اب تک
کوئلے سے چلنے والے انجن کی طرح
پانی پیتی اور دھواں اُگلتی ہے
چلی جا رہی ہے، چلی جا رہی ہے

دوسری پیدائش

عورت نے دہلیز کی خاک بن کے جینا سیکھا
تو مرد نے کوٹھے پہ تنتے لہریا دوپٹوں سے،
جھانکتی دھانی بانکوں سے اپنا رشتہ جوڑا
عورت نے مُنہ میں گھنگھنیاں ڈال کے
زندگی سہنے کا عہد کیا
تو مرد نے باتوں کے شگوفوں اور قہقہوں
کے فواروں میں
اپنے آپ کو بھگونے کو
سوسو کوس کی مسافت کاٹی
اور خاموش پجارن کے قدموں میں
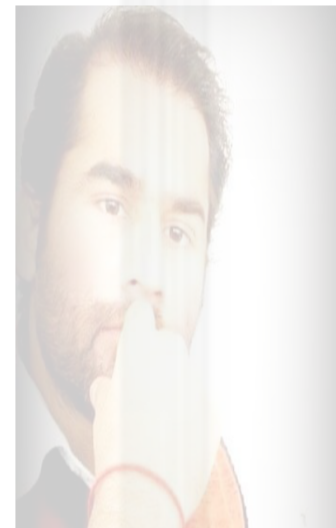
تنہائیوں کے طوفانوں کے رُخ موڑ دیے۔
گھر میں بیٹھی عورت صبح کاتتی رہی
اور کوٹھے پہ بیٹھی عورت صبح چھانتی رہی۔
عورت نے دہلیز پار کی
کہ خون تھوکتے تھوکتے
اُس کی آنکھوں میں بھی خون اُتر آیا تھا۔
شہر میں ہر چیز کی قیمت تھی
تنہائی کی بھی قیمت تھی۔
رونق بہت تھی
دھکم پیل میں پَیر چھلے جاتے تھے۔
خاکستری رنگ
نارنجی رخساروں میں ڈھلا
خوف کی دیوار گری
اور یقین کے لہلہاتے کھیت میں
آنکھوں کے خوشے چمکنے لگے۔
صبح کاتنے والی

فصل کاٹ رہی تھی
مگر پھر اکیلی تھی
کہ اب مرد
گھر بیٹھنے والی، معصوم بے شعور کی تلاش میں
مَے بدمست تھا

ایک کہانی

کاٹھ کے گھوڑے پہ بیٹھ کے
بچہ ہلکورے لیتا ہے
گھوڑا لکڑی کا ہے
لمس نا آشنا ہے
وہ بے جان کو خُوب مارتا ہے
خُوب اُلٹا سیدھا کرتا ہے
اور خوش رہتا ہے
جوان ہوتا ہے
پھر کاٹھ کے گھوڑے پہ سوار ہوتا ہے
اور نفیریاں بجوا کر اپنے جوان ہونے کا اعلان کرتا ہے

رات گزرتے ہی کاٹھ کا گھوڑا بدل جاتا ہے
مارنے والا اور خوش ہونے والا، وہی رہتا ہے
ہمارا تمہارا مجازی خُدا

میں —— ایک اور

غصے میں بڑبڑانے کی عادت
بچپن سے تھی
یہی عادت سوتے میں
دانت پیسنے میں منتقل ہوگئی
یہی عادت جاگتے میں
ہونٹ کاٹنے میں منتقل ہوگئی
جذبے، آواز میں منتقل ہونے سے ڈریں
تو رگوں کا زہر بن کر
ثمرآور قوتوں کو مفلوج کر دیتے ہیں
گھنے درختوں کے بیچ بھی سورج جھانک لیتا ہے
کبھی تم بھی جھانکو
کہ میں اب سوتے میں مسکرانا چاہتی ہوں
لمبی گھاس میں بارش اپنا آپ چھپا لیتی ہے
آؤ! میں تمہیں چھپا لوں گی
کلائی پہ بندھی گھڑی کی طرح
کوئی نشان میرے جسم پر نہ چھوڑنا
کہ میں آنکھوں کی سلاخوں سے
پہلے ہی بہت زخم زخم ہوں
مرے دن اور مرے ہونٹ جاگنا چاہتے ہیں
اپنی تجسیم یادوں میں مست کر دو
کہ بے اعتبار ساعتوں کا موسم گزر چکا ہے

انٹی کلاک وائز

میری آنکھیں، تمہارے تلوے بھی بن جائیں
تو بھی تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ میں دیکھ تو نہیں سکتی
جسموں اور فقروں کو
خوشبو کی طرح محسوس تو کر سکتی ہوں

میری ناک، اپنے تحفظ کی خاطر
تمہارے سامنے رگڑ رگڑ کر
بے نشان بھی ہو جائے
تو بھی تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ میں سونگھ تو نہیں سکتی
مگر کچھ بول تو سکتی ہوں

مرے ہونٹ، تمہاری مجازیت کے گُن
گا گا کر
خشک اور بے رُوح ہو بھی جائیں
تو بھی تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ میں بول تو نہیں سکتی
مگر چل تو سکتی ہوں

مرے پیروں میں زوجیت
اور شرم وحیا کی بیڑیاں ڈال کر
مجھے مفلوج کر کے بھی
تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ میں چل تو نہیں سکتی

مگر سوچ تو سکتی ہوں

آزاد رہنے ، زندہ رہنے
اور مرے سوچنے کا خوف
تمہیں کن کن بلاؤں میں گرفتار کرے گا

پرسونا I

آسمان کے بوڑھے ستارے
اور پہاڑ کی چوٹیوں پہ کھڑے
درختوں کے بے امان تنے
صدیوں کا صبر اپنے سینے میں دبائے
مُنہ بند تنور کی طرح
بے زبان سے نظر آتے ہیں
جس لکڑی سے کشتی بنتی ہے
اس کو پانی پسند نہیں
مگر ساتھ رہنے کے لیے
پسند کا مسئلہ ثانوی ہو جاتا ہے۔

رے بغیر، مُردوں کی طرح زندگی گزارنے کا عمل
تمہارے جُوتوں کے پنجوں کی اُڑی کھال پہ
پڑی گرد سے ظاہر ہوتا ہے۔
انگیوں کے سہارے ڈھلکی چھاتیوں کو
رُوپ نہیں ملتا ہے۔
کند چھُری اور بیٹھی مٹی جیسے
نمی خوردہ بدن پہ
بُزدلی کی نیلی رگیں اُبھر آئی ہیں۔
دو ترچھی لائنوں کا اتصالی نقطہ
مبہم رشتوں کو منطقی ثابت کرنے کا
مجہولی عمل۔
وہ پروٹیکٹر بنا
اتصالی نقطے کے گرد حصار کھینچتا رہا
اور مرے وجود سے انکار کی لائن گہری ہوتی چلی گئی۔
غار اور قبر میں کیا فرق ہوتا ہے
ایک قدرتی اور ایک ارادی
ارادی منصوبے اپنا ماضی رکھتے ہیں
اور مستقبل بھی۔
تنہائی سیلن کی طرح
مرے وجود کے اندر سرایت کرتی چلی جا رہی ہے۔
مَیں کیا دھند میں پیدا ہوئی تھی
کہ میرے اندر ہر عکس، ہر رشتہ
اور ہر جذبہ دھندلا ہے۔
جیل کے قیدی نے کبھی رات کا آسمان نہیں دیکھا
اور سُورج نے کبھی رات نہیں دیکھی
مَیں نے دن نہیں دیکھا
مَیں نہ قیدی ہوں اور نہ سُورج
مَیں تو بچپن میں
بڑے بہن بھائیوں کے پُرانے کپڑے
پہنا کرتی تھی
اور تجربوں کی جھریوں کے اِس زمانے میں
یادگار لمحوں کے سنبھالے ہوئے کپڑوں کو

تھوں سے اُڑی رنگتوں کے باوجود
کھول کھول کر پہن رہی ہوں
میری آنتوں کی رسیاں بنا کر
اور جھولا جھولو
کہ میں نے اپنی زبان کا تنور
بند کر دیا ہے

پرسونا II

رشتوں کی آبجو میں کوئی گہرائی نہیں ہوتی ہے
مگر پھر بھی سرگشتہ ہیں جیسے رابطوں سے
آگے کی منزل کی تلاش میں
ہم ایک، دوسرے کے لیے بے چین رہتے ہیں
مجھے معلوم ہے
بابوں کے جنگل میں ایک درخت کا نام
مرا باپ تھا
اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر
گزرتی ہواؤں کو دیکھو، تو سوچو
انھی میں سے کسی کا نام میری ماں تھا
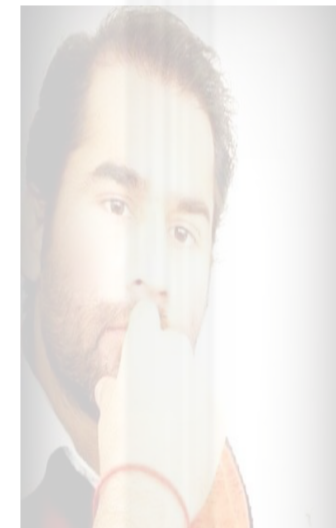
کہ بغیر پتہ لکھے خط، بالکل ایک جیسے لگتے ہیں
مَیں، اپنے سب سے سہانے خوابوں میں بھی
ایسے پتّھر پہ کھڑی نظر آتی ہوں
کہ جس کے نیچے میرا دل ہے۔
میرے زخموں میں سے جھانک کر
خُدا دُنیا کو دیکھتا ہے
اس دُنیا کو کہ جہاں لوگ
کھڑے ہوتے ہیں تو کھانے کے لیے
اور بیٹھتے ہیں تو مرنے کے لیے۔
تلخ لہجے میں کہے ہوئے شیریں لفظ
اور بھی تلخ ہو جاتے ہیں۔
میرا جی کرتا ہے
مَیں وقت بن جاؤں
اور تم کائنات
یوں تو تم میرے ساتھ چلو گے
وقت سے پیچھے رہ جانے والوں کو

بہاریں نہیں ملتی ہیں۔
سوکھی گھاس کہ جسے کوئی بھی
چنگاری بھسم کر سکتی ہے
تمہارا آنگن کیوں بنے۔
آؤ بارش کا پہناوا پہنیں
شاید یونہی نکھر جائیں
مگر کیسے کہ ہم تو خواب میں بھی
خواب دیکھنے والوں جیسے نہیں ہوتے ہیں۔
مجھ جیسے وقت میں
اور تم جیسی کائنات میں تو
خاموشی بھی بولتی ہے۔
ہم کہاں جائیں کہ سناٹے کی گونج
ہمارے کڑھے ہوئے کرتوں کے نیچے
چھپے زخموں کو آشکارا کر رہی ہے
وہ سارے رنگ کہ جنہیں مَیں
خوابوں اور کھلی آنکھوں دیکھتی ہوں

میری مدد نہیں کر سکتے

میری آنکھیں بوڑھے وحشی درندے کی

آنکھوں کی طرح کھلی بھی ہیں

تو کیا فرق پڑتا ہے۔

کسی شخص کی ہذیانی ہنسی کو

ایک سنجیدہ کُتّا، اسی طرح حیران ہو کر دیکھتا ہے۔

خود احتسابی

جب آخری مرغ کی آخری آواز آئے گی

جب ستارۂ سحری۔ آخری رات کے سفر

کے اختتام کا اعلان کرے گا

اور آخری دن کا سورج

خون تھوکتی صبح کا پیغام لے کر آئے گا

میں اپنا سر تکیے سے اُٹھا کر

اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں گی

جب آخری سیاست دان، آخری آدمی کو بھی

قتل کر دے گا

جب آخری بچّہ بھی چاول کے ایک دانے کی
تلاش میں بلک بلک کر مر جائے گا
جب آخری قطرۂ خون بھی
مادرِ وطن کے تحفظ میں صرف ہو جائے گا
جب دُعا کا آخری حرف بھی ختم ہو جائے گا
جب آخری گولی بھی سینے کے پار اُتر جائے گی
مَیں اپنا سر تکیے سے اُٹھا کر
اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں گی

جب آخری بچّہ، آخری لاش کے سوکھے پستان
کو چھوڑے گا
جب یتیم بچّہ بھی اپنی ماں کا نام لے کر
فرماں رواؤں کو کوسے گا
جب انسان، آخری قدم، آخری چاند
پہ رکھے گا
مَیں اپنا سر تکیے سے اُٹھا کر

اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں گی

جب آخری بوسہ، زندگی رقم کرے گا
جب نسلیں اپنے خوف کو لذت سمجھ کر
برداشت کرنا سیکھ لیں گی
اور خلا بھی تصنّع کی تصویر ہو گا
مَیں اپنا سر تکیے سے اُٹھا کر
اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں گی

پورٹریٹ ۱۹۸۰

موسم بدلنے کی رُت میرے اندر نہیں آتی ہے
مَیں تو سمندر کی موجوں کے
پُرسکون ہو جانے کے وقت
ساحل کی سمت جاتی ہوں
شاید اس لیے آگ میری زبان کی ساتھی ہے
اور مَیں دوستوں کی رُخصتی کا نوحہ
ویسے تو، ہر نیا اندوہ، گزشتہ کی تجدید ہی کرتا ہے
مگر، پھر بھی نیا لگتا ہے
بالکل ایسے، جیسے اک نیا دوست!

جتنے مہین لمحے کہ جن کے آر پار
ایک سا دکھتی دے
تعلق کی عمریں سنبھالے ہوتے ہیں
گلاب کا رنگ میرے چہرے پہ نہیں ٹھہرتا
اور میری زبان کی سُرخی
لال پنسل سے بنی لگتی ہے
کہ موسم بدلنے کی 'رُت' میرے اندر نہیں آتی ہے

افزونی

گُنّار ایکلوف کی نظمیں

(۱)

اپنے خوابوں میں مَیں نے ایک آواز سُنی
حبیب! کیا تمہیں یہ پیاز پسند ہے
یا پھر اس کا ایک ٹکڑا ہی تم لوگے
یہ سُن کر مَیں مضطرب ہوگیا
یہ جلا دینے والا سوال ہی تو
میری زندگی کا سوال تھا
کیا مَیں کُل پر جُزو کو فوقیت دیتا ہوں
یا پھر کُل کو جُزو پر
نہیں مَیں چاہتا ہوں کہ دونوں پر میرا اختیار ہو
کُل کے سارے اجزا بھی میرے
اور کُل بھی میرا
اور یہی خواہش ہے جو تضاد سے پاک ہے

(۲)

مَیں تم سے مخاطب ہوں
مَیں تمہارے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں
اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے
مجھے معلوم ہے کہ تم جواب نہیں دیتی ہو
تم جواب بھی کیسے دے سکتی ہو
جبکہ اتنے سارے لوگ تمہارے مشتاق ہوکر
نوحہ خواں ہوں
مَیں تم سے صرف اس اجازت کا طلبگار ہوں
کہ تم مجھے یہاں کھڑے ہوکر انتظار کرنے کی اجازت دے دو
وہ انتظار جو میرے اندر سے ہی
تمہارے وجود کا اعلان کرے گا

(۳)

کچھ نہیں

تم اے مہربان اور نرم رو

تم وہ ہو جو مرد کے ہاتھ تلے اُوپر

توازن کے لیے رکھتی ہو

تمہاری اُنگلیوں کے پوروں میں شگوفے کھلتے ہیں

میرے سارے ہوش و حواس کو سانس کی طرح

چھو کر جان جاتی ہو

تمہاری جلد، تمہاری آواز اور تمہاری محبتوں کی خوشبو

تمہارے وجود سے زیادہ مسحور کُن ہے

(۴)

مَیں تمہارے حمائل بازوؤں کی گرمی کو محسوس کرتا ہُوں

یہ بازو دکھائی نہیں دیتے مگر موجود ہوتے ہیں

تم نے مجھے اپنی ایک، چھاتی کو چُومنے کی اجازت دے دی

وہ چھاتی جو دِل کے اُوپر تھی

پھر میری پلکیں چُوم کر تم چلی گئیں

(۵)

مَیں تمہارا باطن، ظاہر میں دیکھنا چاہتا ہوں

کیا یہ سُرخ تھا یا سفید

مجھے تم اپنا باطن، ظاہر میں دکھلاؤ

کیا یہ سفید ہے یا سُرخ

ظاہر میں، کیا تم دلیر ہو

باطن میں، کیا تم دلیر ہو

بتاؤ تم کونسا سوانگ بھرتی ہو

تم خود کو اتنا سُرخ اور اتنا سفید کیسے بناتی ہو

کہ تمہارے رُخسار اتنے خوبصورت لگیں

تمہارے پاؤں ننھے ننھے معلوم ہوں

اور اگر پاؤں ننگے ہوں تو

تمہارے پھُولوں سے لدے لباس کے نیچے سانس لیتے دکھائی دیں

(۶)

صبر و تسلّی کی ملکہ

تم وہ ہو کہ جس کے ساتھ کوئی نہیں

تم وہ ہو کہ جسے کسی کا انتظار نہیں

تم وہ ہو کہ جس کا معصوم چہرہ

کمبل میں سے جھانکتا ہے

تم وہ ہو کہ جس کے پاس سب کچھ ہے
تم وہ ہو کہ جو سب کی ماں ہے
تم وہ ہو کہ جس کی چھاتیاں
سارے عالم کے لیے بھری ہوئی ہیں
تم وہ صرف تم ہو
تم وہ کہ جو تمام آدمیوں کے خوف کی ریکھا ہو
تم وہ ہو کہ جو سب کے لیے ، سب کے لیے ہو

(۷)

سڑک پر چلتے چلتے ، ہماری گفتگو
پیاس اور پانی کا رشتہ
مجھے اپنی جوانی کے جھکتے دن
یاد آجاتے ہیں
مَیں نے اپنے آپ سے کہا
پچاس سال کی خود شناسی
اور خود تشکیک کے بعد
مَیں ایک پَر کٹی چڑیا کی طرح
لاچار ہو گیا ہوں
مجھے اپنا آپ دیکھ کر
پانی کے دو دھاروں کے درمیان
بے آباد سڑک یاد آرہی ہے
ہاں .... نہیں
اور تمہیں یاد ہے
ہم نے اپنے اونٹ کیسے پہاڑوں کے اُوپر
چڑھائے اور اُتارے تھے
اور مَیں نے کیسے میدان میں ان کے لیے
آگ روشن کی تھی
مَیں نے شجرِ نیستی
اور شجرِ ہمہ اوست سے
باہم شاخیں رگڑی تھیں

(۸)

ہاں ! مجھے معلوم ہے
تم نے مجھے کس قیمت پر بیچا تھا
میری بولی موت جیسی اونچی قیمت لگی تھی
موت کے دروازے کے اندر
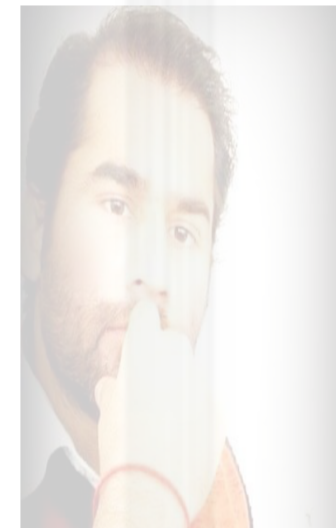
آئینہ خانۂ عالم میں
مَیں اپنے آپ سے
اپنے بچے کی طرح ملوں گی
وہ گانا گاتے ہوئے
کہ جو تم نے مجھے سکھایا تھا
اُس خوب صورتی ، اُن کہانیوں
دُور بین نظروں اور پوتر دودھ کے ساتھ
اپنی رضاعی ماں کے پسینے کی خوشبو کے ساتھ
اس کی آغوش میں ـــــ تحفظ کی مہک لیے

٩

پیدائش بہت سادہ سی بات ہے
تم ، تم بن جاتے ہو
مَوت بہت سادہ سی بات ہے
تم ، تم نہیں رہتے ہو
اس کے بالکل برعکس بھی ہو سکتا تھا
اس آئینہ خانۂ دُنیا میں
یوں بھی تو ہو سکتا تھا

کہ مَوت تمہیں پیدا کرتی
اور زندگی تمہیں خاکستر کر دیتی
دونوں طریقے اپنی اپنی جگہ درست ہیں
اور شاید یہی دستورِ حیات ہے
تم مَوت کی گود سے اُبھرے ہو
اور زندگی تمہیں نابود کر رہی ہے

٠

تم اپنے غموں اور خوشیوں کے خود شاہد ہو
تمہارا اپنا آئینہ
اور آئینے میں تمہارا اپنا تصور
ایک دوسرے میں عاشقوں کی طرح
یک جان ہوتے نظر آتے ہیں
جہاں عفریت سے لڑتے شاہزادے کی
آواز کا گزر نہیں ہو سکتا ہے
تم اور تمہارے درمیان
خاموشی راج کرتی ہے

ابدی خاموشی، عامل و معمول کی
عظمت و عرفان کی
وہ تمہاری ذات کا عشق
جو خود غرضی اور خودستائی نہیں
بلکہ آئینہ نگری ہے

(۱۱)

مَیں ایک سیاہ عورت ہوں
میری گود میں ایک سفید بچّہ ہے
سو جاؤ، راج دُلارے سو جاؤ
مگر تم کسی صورت نہیں مانتے ہو
کیا تمہیں دودھ چاہیے
سو جاؤ ____ سو جاؤ
مَیں تمہارے لیے روتی ہوں
سفید بچّہ مر رہا ہے
سفید بچّہ مر گیا ہے
میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا

سفید بچّہ دودھ بھی مُنہ میں لینا نہیں چاہتا
مَیں تمہیں اپنے پیٹ سے لگا کر گرم کروں گی
مَیں تمہیں اپنی گود کا جھولا جُھلاؤں گی
مَیں تمہاری آنکھیں باری باری چُوموں گی
یہ دیکھنے کو شاید تم یونہی آنکھیں کھولو
میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا
یہ بچّہ مر چکا ہے
مَیں بھولی بھالی عورت
اس سفید بچّے کا اب کیا کروں
مجھے تو اسے دفن کرنے کا بھی اختیار نہیں ہے
چل بھاگ کُتّے کہیں کے
تُو کچھ نہیں جانتا

سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ

۲۸ سالہ بنجمن ملائسی کے نام
جسے ۱۸- اکتوبر ۱۹۸۵ء کو پیری ٹوریا جیل میں
حُریت پسندی کے جُرم میں پھانسی دے دی گئی۔

پہلی فصل

مجھے معلوم ہے پنجرے میں بند چڑیا کیا گاتی ہے

نیم وحشی کبوتر کی آزردگی

میرا ریفریجریٹر بھرا ہوا ہے
اور میرا گھر خالی ہے
جس گھر میں تم رہتے ہو
اس میں اگر صرف وہ روحیں آئیں
جن کے ساتھ تم نے زندگی بسر نہیں کی ہے
تو بھی
ملاقات کا عالم رہتا ہے
ورنہ اذیت کا۔

میری آنکھیں بھری ہوئی ہیں
اور میرا گھر خالی ہے
جو زندگی تم بسر کرتے ہو

اس بار اگر صبح شام کا تسلسل نہ بھی ہو
تب بھی ایک شام ہی
یا ایک صبح ہی
ذائقہ بن سکتی ہے
اذیت نہیں۔

دروازے کھلے رکھنے سے کوئی آ تو نہیں جاتا ہے۔
اس سے پہلے کہ نادیدہ روحیں بھی آنا جانا بند کر دیں
کوئی صبح کوئی شام نہ رہے
میزبانی کرو ان کی
جو خالی کمروں میں دکھائی تو دیتے ہیں
وائپر چلاؤ، آنکھیں صاف کرو
ابھی سفر کی کئی منزلیں باقی ہیں۔

HOME SWEET HOME

اس نے گھر جا کر کہا
آج اس کی ملاقات ایک بہت دل آویز
خاتون سے ہوئی
وہ خوش لباس اور خوش گفتاری میں
بے مثل تھی
وہ بہت کچھ جانتی تھی اور جاننا چاہتی تھی
اس کے ساتھ چلتے رہنے کو جی کرتا تھا
مگر،
رات گہری ہو رہی تھی۔

اس نے گھر جا کر کہا
آج اس کی ملاقات ایک بہت با اعتماد
خاتون سے ہوئی

وہ ہوا کو مُٹھی میں بند کر لیتی تھی
نگاہوں سے سمندر ساکت کر دیتی تھی
اور بات کا لمس
گلاس پہ چھوڑ دیتی تھی
وہ چلتی بھی الگ طریقے سے تھی
اور رہتی بھی الگ طریقے سے تھی
اس کی آنکھوں کے سامنے ٹھہرنے کو جی کرتا تھا
مگر،
رات گہری ہو رہی تھی۔

اُس نے گھر جا کر کہا
آج اس کی ملاقات ایک خاموش
خاتون سے ہُوئی
وہ چاہتی تھی
کوئی اُسے ادھوری بات سمجھ کر پُوری کر دے
کوئی اس پہ ٹھہری دھول ہٹا کر
مہکی بہار آراستہ کر دے
کوئی اس کے بستر کے منجمد سالوں میں
ارتعاش پیدا کر دے
اس کے وجود کے سامنے میرا وجود
معدوم ہونا چاہتا تھا
مگر،
رات گہری ہو رہی تھی۔

تھکان سے پہلے کا لمحہ

مَیں نے جب تمھیں جنم دیا
تو دراز قد ٹہنیوں کے درمیان
نئی بہار کے شگوفوں کی طرح
تم آویزاں ہُوتے۔
مَیں نے جب تمھیں جنم دیا
تو بادل کی تتلی نے
زمین کے پھُولوں کا مُنہ چُوم لیا تھا۔
اور میری پرچھائیوں کے درمیان
چھُپی وادی پہ
تم نے اپنے ماتھے کا نشان ثبت کیا تھا۔
مَیں نے جب تمھیں جنم دیا
تو تمھیں دودھ پلا کر

مجھے اپنی بھوک مٹنے کا احساس ہُوا تھا
تمھیں سلانے کے لیے، جاگتے رہنا
مجھے چراگاہ میں آزاد بکری کی معصومیت
معلوم ہُوا تھا۔
میری ماں نے مایوسیوں کی دردوں سے رہائی پانے کے لیے
مجھے جنم دیا تھا
اور غصے نے مجھے گود لیا تھا
مَیں طُوفان سے بیاہی گئی تھی
اور تمھاری پیدائش، غروبِ آفتاب سے پہلے ہُوئی تھی۔
اندھیرے کو اذیت کے عالم میں
قبول کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا
تاریخ، شرمندہ بچے کی طرح
مجھے لوریاں دے رہی ہے۔

پاؤں کی بیڑیاں

جب کوئی خط نہیں آتا
تب بھی ڈاکیہ گھنٹی بجا کر
اس کا اعلان کیوں کرتا ہے
جب کوئی شخص نہیں آتا
تب بھی ہوا، اپنی سرسراہٹ سے
اس کا اعلان کیوں کرتی ہے
جب کوئی بھی خوف نہیں ٹھہرتا
تو میرا وجود جاسوس کی طرح
میری تلاشی کیوں لیے جاتا ہے

چھت پر اکیلے ٹہلتے ہوئے
مکالمہ یا غصہ
میرے اندر کے اندھیرے کے خلاف
لڑنے کا عمل تھا
مجھے بار بار یہ یقین اس ضد پہ اکساتا تھا
کہ کسی سرزمین پہ، کسی جگہ تو
خوشگوار صبح طلوع ہو رہی ہوگی۔
میں اسی تلاش میں اپنی آواز کے پیچھے
بھاگتی رہی
میں اسی تلاش میں
انکار کی ہر سرحد عبور کرتی گئی۔
میں اسی تلاش میں
ستاروں، چاند اور سورج کی ماں بن گئی

اپنی اپنی موت کی الگ الگ ریہرسل کرنے
اور اپنی اپنی موت کو نامعلوم واقعہ بنانے کی کوشش کے باوجود
میری تلاش اور تمھاری پت جھڑ کی سنکھیا کا قصہ
ہر کتبے پہ لکھا ہوا تھا
اس اعلان کو دہرانے کو
ڈاکیہ اب بھی گھنٹی بجا دیتا ہے۔

پیدائش سے پہلے کی دعا

میری پیدائش سے پہلے، میرا کہا مانو
گلاب کو ہلدی کے رنگ میں ڈبو کر
اور بات کو پتھر کے تعویذ میں پرو کر
آنے والوں کو
مجھے دیکھنے مت دینا

میری پیدائش سے پہلے، مجھے تسلی دو
مذہب کو میرے کانوں میں بند نہیں کیا جائے گا
میری ماں بیٹی کی پیدائش پہ دربدر نہیں ہو گی
انسانیت کی دیواریں مجھے چن دینے کے لیے نہیں
مجھے تحفظ دینے کے لیے ایستادہ ہوں گی
میرا خون نہانے کے لیے
اور میرا لباس، بے لباسی کی تحریر کے لیے
حوالہ نہیں بنے گا

میری پیدائش سے پہلے، مجھے مہیا کرو
وہ پانی — جس کی یافت میں میرے بزرگوں کا پسینہ شامل ہو
وہ گھاس — جسے میری زمین کے سینے کی قربتوں کی مہک نے آسودہ کیا ہو
وہ درخت — جن کی چھاؤں میری دہلیز ہو
وہ آسمان — جس کی پناہ میری وسعتیں ہوں
وہ پرندے — جن کا وجود میرا سکون ہو

میری پیدائش سے پہلے، مجھے معاف کر دو
ان گناہوں سے جو دنیا، آلودگی کے جنگل میں
میرے نام اور میرے زمانے کے نام پر
میرے لفظوں اور میرے خیالوں کو
بوڑھے کی کہانی کا نام دے کر
اپنے خالی پن کو، سکون کا نام دینے کو
روا رکھے گی

میری پیدائش سے پہلے مجھے سکھاؤ
دھان بھرے کھیتوں کا سنہری پن کیسے یاد رکھوں

[illegible] حصول کی شرمندگی، میرا رزق نہ بن سکے۔
کیسے یاد رکھوں
ہونٹوں کو خواہش کا دروازہ سمجھ کے
استعمال کرنا
کیسے سوچنا
کہ کوئی چہرہ مٹاتے ہوئے، مجھے اپنا چہرہ مٹتا نظر آتے
کیسے ہنسنا
کہ اندھیرا، گجر سمجھ کے واپس پلٹ جائے۔

میری پیدائش سے پہلے، میرا کہا مانو
جو شخص خود کو خدا سمجھتا ہو
اور جو شخص وحشی اور ظالم ہو
اسے میرے قریب مت آنے دینا۔
کسی پیوند لگے جسم سے کوئی پیوند اُدھار مانگ کر
میرا بدن لپیٹ دینا

میری پیدائش سے پہلے وعدہ کرو
مجھے اس پانی کے قریب نہیں لے کر جاؤ گے
جو کھیتوں کے سجائے، گھروں میں پھیل جانے کو بڑھتا ہے۔
اُس دُھوپ کی پہچان نہیں کراؤ گے
جو قحط بن کر، میرے جیسے آنگنوں کو بھوک میں بدل دیتی ہے۔
ان بزرگوں سے محفوظ رکھو گے
جو دُعا بھی معاوضے کی دہلیز پہ ارزاں کرتے ہیں۔

اس شہر میں آباد نہیں کرو گے
جہاں اپنی ہی گلیوں سے چوروں کی طرح
چھپ کر گزرنا پڑتا ہے۔
میری پیدائش سے پہلے وعدہ کرو
مجھے ستر سال کا پیدا نہیں کرو گے
مجھے بوڑھا بچپن نہیں دو گے۔

داغدار شیشے کا زخم

چوالیس سالوں کے جتنے بھی گھنٹے بنتے ہیں
اتنے گھنٹوں سے مَیں شُولی پر ہُوں ۔
خود سے انکار اور دوسروں کے کہے پر چلنے کا موسم
تو بچپن ہی میں شروع ہو گیا تھا ۔
مگر میرا پہلا انکار
ماں کے پیٹ میں مرنے سے تھا ۔
مجھے سیہ رات کی گود میں
زندگی کا ذائقہ چکھتے ہُوئے
یہ احساس ہو گیا تھا
کہ جہنم میرے ارادوں کی خاک میں شامل ہے ۔
دوسروں کے کہے پہ چلتے ہُوئے
مَیں لوگوں کے گھروں کے لاکھوں کمروں میں

ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعہ داخل ہوتی ہوں
مگر میرا یہ داخلہ سٹیج پہ آنے والے ان اداکاروں کی طرح بھی نہیں ہوتا
کہ جو دوسروں کے لفظ پہن کر چہرہ بنا سکتے ہیں
خود سے انکار اور دوسرے کے کہے پہ چلنے کے موسم کی خزاں
چیک بُک تک پر
[illegible]، دستخط کروالیتی ہے ۔

گُنگ شہزادی

آج میں نے تمہارا کوٹ پہنا تھا
یہ دیکھنے کہ کیا میرے کندھے بھی
یہ کوٹ پہن کر خود کو ہی عظیم سمجھنے لگتے ہیں۔
مَیں نے تمہارے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے۔
یہ دیکھنے کہ وہ راز جو تم مجھ سے چھپا کر رکھتے تھے
وہ نکال کر دیکھ لوں، پڑھ لوں۔
وہ سارے فون نمبر، وہ سارے پتے
وہ ساری چابیاں، وہ سارے نام
مَیں نے ہوا کی نوٹ بک میں لکھ دیے ہیں
کہ آج کل تو لوگ، مکان، فون اور نام
سبھی بہت جلد بدل لیتے ہیں۔

پُرانا کھاتہ

میری زندگی میں سب سے زیادہ ساتھ
میرے تکیے نے دیا ہے
آرام اور سکون کا جو لمحہ بھی کیلنڈر میں
نشان زدہ ہے
وہ تکیے کی رفاقت کی داستان ہے۔
جن دنوں میں تم میری کھال
کاغذ کے لیبل کی طرح چٹکی سے پکڑ کر
اُدھیڑ دیا کرتے تھے
یہی تکیہ میری مسیحائی کرتا تھا۔
پھٹی ہوئی جراب کی طرح
مَیں نے اپنے بدن کو جگہ جگہ سے رفو کیا تھا۔
زندگی کے زخموں کو

اُمیدوں کے چاند کی طرح گھٹتے اور بڑھتے دیکھنے
اور چھپانے کا حوصلہ بھی اسی تکیے کو ہُوا تھا۔
میری طرح، اس تکیے کی رُوئی بھی پُرانی ہو کر
جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی ہے۔
پیاس کی شام گہری ہو رہی ہے۔
مرغی چونچ میں پانی بھر کر
آسمان کی طرف دیکھ کر پانی پیتی ہے
میں آنسو بھری آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھا کر
آنسوؤں کو پی جانا چاہتی ہُوں
کہ تم نے آج
میرا تکیہ ہی میرے مُنہ پہ دے مارا ہے!

سانپ کینچلی

ہمارے مُلک میں پرندوں کو پیار کرتے دکھانے کی اجازت ہے۔
ہمارے مُلک میں انسانوں کو پیار کرنے اور پیار کرتے دکھانے کی
اجازت نہیں۔
وہ شاید اسی لیے شادی کرتے ہیں۔
ناخنوں کی پوروں تک دہکتے خوُن
اور آنکھوں کی لووں تک پھیلے جذبوں کو
شادی کا نام دیتے ہُوئے
میری اُنگلی میں پھانس بہت چبھ رہی ہے۔
مجھے آسمان کا رنگ آنکھوں میں دیکھنے کی تمنّا ہے
مجھے گلاب کا رنگ ہونٹ بنتے دیکھنے کی آرزو ہے
مجھے موج موج بدن کی بے چینیوں سے
مغلوب ہونے کی وحشت دیوانہ کیے ہُوئے ہے۔

مگر ہمارے ملک میں انسانوں کو پیار کرنے اور پیار کرتے دکھانے کی
اجازت نہیں۔
اسی لیے تو آستین سے ناک صاف کرتے بچے بھی
نالی پہ بیٹھی لڑکی کو دیکھ کر باولوں کی طرح ہنستے ہیں۔
خواب دیکھتے ہوئے لڑکیاں ڈر جاتی ہیں
اور چیخ مار کر اٹھ بیٹھتی ہیں۔
اور لڑکے شیطان کو کنکر مار مار کر بے حال ہو جاتے ہیں۔
ہمارے ملک میں بے شرمی کی ممانعت ہے
اسی لیے ہمارے ملک میں انسانوں کو پیار کرتے دکھانے کی اجازت
نہیں۔

اعتقاد

جب تم میرے ساتھ ہوتے ہو
تو ہوا میرا نام نہیں پوچھتی ہے
بارش مجھ سے بغل گیر ہو جاتی ہے
دریا مجھ سے لپٹنا چاہتا ہے
چڑیاں مجھ میں بولنے لگتی ہیں
سیپیاں میری کوکھ جیسی لگتی ہیں
مجھے لگتا ہے
میرے کمزور لمحوں میں
خدا مجھ سے اور زیادہ پیار کرتا ہے۔
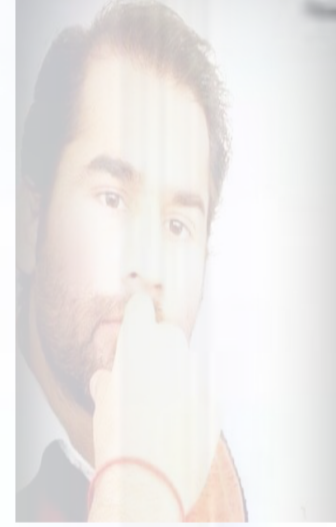
اپنے قتل کا اعتراف

میرے سمندر جیسی کو وعدوں کے گھلتے نمک نے
تلخ کیا ہوا ہے
زندگی کے سارے راستے ایک ہی سمت جاتے ہیں
ان تمام راستوں پر طلب کا بورڈ آویزاں ہے
مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے
مگر میرے چلنے کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے.
خلا سے بات کی جا سکتی ہے
تصویر بھیجی جا سکتی ہے
پیغام روانہ کیا جا سکتا ہے
مگر خط نہیں بھیجا جا سکتا
جو نہ ہو، اس کی طلب، اس کی چاہت
اس کا خیال :
شاید میرے چلنے کے لیے کوئی اور راستہ نہیں ہے.

تمنّا کا پہلا حرف

زمیں کے آخری کنارے کے پاس بھی
آسمان کا وہی ٹکڑا تھا
جو میرے صحن کے چھوٹے سے چوکھٹے سے
نظر آتا تھا.
وہاں کی ہوا، البتہ، مجھے لمبے لمبے
سانس لیتے دیکھ کر خوش ہوتی تھی
میرے منہ میں کپڑا نہیں ٹھونستی تھی
وہاں کے سمندر کو بھی
یہاں کے انسانوں کی طرح غصّہ نہیں آتا تھا
شاید اسی لیے وہاں سورج کو نکلنے سے
خوف آتا تھا
دلوں کا اندھیرا، دلوں میں جاگزیں نہیں تھا.

FAREWELL TO UTERUS

میرے اندر پھیلی ریل پٹریوں پہ
جذبوں کے کتنے ادھورے مسافر
اور حوصلوں کے غیر مطلوبہ بیگیج
کسی آنے والی گاڑی کے انتظار میں ہیں
اور نہ راستہ بھولے ہوتے ہیں۔
ریل پٹریوں پہ نہ آوازوں کا شور کم ہوتا ہے
نہ چہروں کا،
محبت کی تابناکیاں بھی لہو گداز کرتی ہیں
اور رنج کی پیوستہ کاریاں بھی وجود کو فنا کا آموختہ پڑھاتی ہیں۔
کبھی کبھی سورج کی چھاتی میں میری آنکھیں
اور کبھی میری آنکھوں سے لب تک سورج کی تمازت۔
میرے باہر کے اس منظر میں دریاؤں کا سا سماں ہوتا ہے

روشنی کی تیز دھار، رشتوں کی طنابیں
کاٹنے کے لیے نہیں
جسم کی گرہوں کو کھولنے کے لیے لہراتی تھی
عقل کی انگلیاں، جرم شمار کرنے کے لیے نہیں
احساس کی گرفت کے لیے پناہ گاہ بنتی تھیں۔
موسم کا سبز فرغل اور بھی سبز لگتا تھا۔
جذبوں کا ادھیڑ پیرہن، گرسنگی کی نہیں
طمانیت کی درگاہ دکھائی دیتا تھا۔
وہاں خواب بھی تھے اور خواب دیکھنے والے بھی
وہاں حساب بھی تھے اور حساب رکھنے والے بھی
منظر کی صاف گوئی نے مجھے بھی صاف گو بنا دیا ہے
مجھے سمندر کے کنارے بیٹھی مرغابیوں کی سی آزادی چاہیے
میری آنکھ اور میری ذات دونوں قید سے رہائی چاہتے ہیں!

کئی سمتوں سے آتے، پھیلتے، ملتے دریا
منظروں کا منظر،
دُھرا عالم
اندر بھی منظروں کا منظر۔

ایک منظر، میرے چُنری رنگنے کا
چُنری کے رنگ سکھاتے سکھاتے
میری زندگی نے لہریا ہونا سیکھا
میرے وجود نے موجیں مارنی سیکھیں
میرے پیٹ میں میرے بچوں نے ہمکنا سیکھا
جب گود کی انگنائی میں پھلواری مہکی
تو مجھے یہ بھی بھول گیا
میرے کس کس انگ نے میرے اندر کا بوجھ سنبھالا تھا۔
مجھ ہرجائی کے ریجھنے کو پیار سمجھ کے
میری میگھ دیوتا جیسی کوکھ نے
بچوں کو پاکیزگی کی مدھرتا میں لپیٹ کر
مجھ سے کہا تھا:
لو تم چاہو تو اسے اپنی محنت کا پھل کہہ دو!

باہر کے منظروں کا منظر
مجھے اپنے ساتھ لے کر چلتا رہا،
اور میرے اندر کے منظروں کا منظر
مجھے بھولتا چلا گیا۔

مَیں تنہائی کے ڈوبتے سُورجوں کی پالی تھی
مجھے خدا بنانے، اور خدا نابُود کر دینے کی آشفتگی
گناہ اور ثواب کی تھالیوں میں بانٹ رہی تھی۔
میرے اندر کی پٹڑیوں پر
جذبوں کے غیر مطلوبہ پیکج کے علاوہ
میرے وجود کے غیر مطلوبہ بنائے گئے
موجود وجود،
ترازو لیے، میری نیت تول رہے تھے۔
مَیں نے اپنی محنت کا دودھ بلو کر
سارا مکھن اتار کر
سنبھالا ابھی نہ تھا
کہ دھکتا کوئلہ، اس میں آن گرا۔
مَیں نے صبر کی انگلی، منہ پر رکھی
اور اچھے دن کی تصویر، اُسی آنکھ میں بنانے لگی
کہ جہاں تنہائی کے ڈوبتے سُورجوں نے ڈیرہ کیا ہوا تھا۔
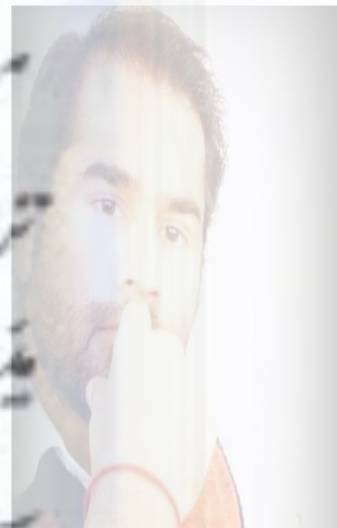
آنکھ کو صحرا ہونے اور بنتے رہنے کا ہنر آ گیا تھا
مگر اپنی حق تلفی پہ رونے کا آزار
میری میگھ دیوتا جیسی کوکھ نے پال لیا
میں اپنے وجود کی قادرِ مطلق تھی۔
مجھے یہ بھی خبر تھی کہ حق کے لیے کہی جانے والی
ساری دلیلیں، بے تکی ہی کہلاتی ہیں۔
مجھے یہ بھی احساس تھا کہ باہر کے منظروں کو
اکتاہٹ کی کائی سے بچالو
تو اندر کی کال کوٹھری میں سر اُٹھانے کی ہمت
کس کو ہوتی ہے
اور ہو تو، بھلا تماشہ کیسا!

میرے قادرِ مطلق وجود نے
رحم کی فریاد کو سزا بجانب کرنے کو
قتل کا حکم دیا
اور اپنے باہر کے منظر نامے کو
آراستہ کرنے کو
مَیں نے اپنے اندر کی ریل پٹری
دھماکے سے اُڑا دی
اس دھماکے میں

میری سماعت زائل ہوگئی
میرے اندر کا وجود، میرے باہر کا وجود۔
سُن نہیں سکتے
کہنے والا سُنے نہیں، تو کہہ نہیں سکتا

غیر مطلوب وجود
غیر مطلوب بیج
ریل کی پٹریاں
بلا سمت چلتی گاڑی میں کون بیٹھا ہے!

پلٹ کر دیکھنے کا انجام

یہ گرمی کے آغاز کا موسم تھا
مَیں درخت کے نیچے سو رہی تھی۔
میرے خواب نے اِک ایسے مرد کا ہیولا بنایا تھا
جس میں بہار کی باس اور ہوا کی حواس خیز تازگی تھی
مَیں جاگی تو گھاس، جگہ جگہ، میرے کپڑوں پر تھی۔

درخت سے چھنتی سُورج کی کرن نے
میری ہتھیلی پہ خواب جیسے کئی منظر نامے پھیلا دیے
آپریشن تھیٹر میں مرتبان میں بند
بے جان بچے کا بدن
بوتل میں آراستہ پلنگ
اور پیپر ویٹ میں شگفتہ نظر آتے پھول!
درخت سے چھنتی سُورج کی کرن نے
میرے گرد جالا سا بن دیا تھا۔

گھاس پہ برف کی دبیز تہیں ہٹاؤ
تو بھی تازہ، شگفتہ گھاس
پُورے وجود کے ساتھ آشکار ہوتی ہے۔
مَیں روشنی کے وجود میں لپٹ کر بھی
خواب میں ہیولے بنا رہی تھی
مسجدوں میں اذانیں ہو رہی تھیں
چرچ سے کنفیشن کے بعد لوگ باہر آ رہے تھے
آرزوؤں کی رکابیاں، ہاتھوں ہاتھ بانٹی جا رہی تھیں
اور میرے کپڑوں پر گھاس کی ٹوٹی ہوئی پتیاں تھیں۔

پیاس بہت تھی، اوک سے پانی پیا
کہنی تک بہتے پانی کی لکیر نے بھی
درخت سے چھنتی سُورج کی کرن سے مکالمہ کیا۔
مَیں نے چاہا کہ مَیں زندگی سے
اس خواب کا ورق پھاڑ دوں
مگر زندگی کسی ایک کتاب ہی میں تو
اپنا حساب کتاب نہیں رکھتی ہے۔
مَیں نے سامنے کی سُوکھتی بیل سے

اپنے رشتے کو نامکمل جانا
اور زندگی کی ساری کتابوں
سارے رستوں
سارے رشتوں
سارے مکالموں
اور سارے دہکتے لمحوں کو
باتوں کے الاؤ کے گرد اکٹھا کیا۔
باتوں کے گتھے کے گچھے
سلجھاتے سلجھاتے
رستے بھی بھول گئے
رشتے بھی بھول گئے
خواب بھی بھول گئے
اور وہ مرد بھی۔
مگر میری سوچوں کے چوک پہ
یہ کون سپاہی کھڑا ہے!

ساحل سے آگے صحرا

میرے بے زبان غموں کی چیخیں
میرے آنگن کی دھوپ ہیں۔
میری سماعت کے دروازے چوپٹ کھلے ہیں
مگر نہ کوئی اندر آتا ہے
نہ ان کو بند کرتا ہے
اور نہ ان پر دستک دیتا ہے۔
میری آنکھوں کی چوکھٹ پر
اکتائے ہوئے لمحوں کی سونی بارات
پلکوں سے یاقوت چنتی ہوئی
رگ رگ میں اداسی اتارتی ہوئی
سورج کے نکلنے کی سرخوشی سے انکار کرتی ہے۔
رات کی آسودگی کو خیمۂ غم سمجھتی ہے

اور یہ ماننے سے انکار کرتی ہے
کہ موت کے جنگل میں
کوئی چڑیا نہیں بولتی ہے۔
کوئی صبح
پلکوں کو جدائی کے راستے پہ لاکر
کھڑی نہیں کرتی ہے۔
یہاں فاصلے دوست
اور تنہائیاں رفیق ہوتی ہیں۔
نہ روشنی راستہ دکھاتی ہے
نہ اندھیرا راستہ روکتا ہے
درختوں سے باتیں کرتی ہوائیں
وہاں کیا کرنے جاتی ہیں؛
میرے کانوں میں تو اس کی آواز
سیپی میں بند موتی کی طرح محفوظ ہے۔
میرے بدن کی کروٹوں میں اس کی محبت
دلدل میں کھلے کنول کی طرح مسکراتی ہے۔
چھوٹے تالابوں کا پانی
صحراؤں کی زمینیں پی جاتی ہیں
ننگے درختوں اور چٹیل چٹانوں پر

بادل کے سائے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے؛
اکیلے میں رونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا ہے
رائٹنگ ٹیبل کی دراز میں نے کھولی
البم میں لگی تصویروں میں پورا خاندان تھا
سب خوش تھے، سب ہنس رہے تھے
آج میری آواز خالی کمرے میں گونج رہی ہے

تابوت

جس درخت پہ چڑیوں کے بیاہ ہوتے تھے
اس درخت کی لکڑی کو اس نے اپنے آخری سفر کے لیے منتخب کیا تھا۔
جس سیمیں رنگ میں نوبیاہتا جوڑوں کو ایک دوسرے سے منسوب کیا جاتا تھا
اس نے وہی رنگ بانکپن کے ساتھ اپنا آخری ملبوس بنایا تھا۔
جس اندھے یقین کے ساتھ، دوسرے کی انگلی پکڑ کر چلنا عبادت ٹھہرتا تھا
اس نے ویسے ہی آنکھیں بند کر کے سپردگی کو ایک نئی معنویت دی تھی۔
جس لب بستگی کا تقاضہ، محبتوں کو چھپانے کی بے چینیاں کرتی ہیں
اس نے ویسے ہی پہاڑوں جیسی خاموشی کو وقار بخشا ہوا تھا۔

ہم پانیوں میں چھپی گھاس کی طرح
اپنے چہروں پہ چپیلی لہروں کو سمیٹتے ہوئے
اسے دیکھ رہے تھے
وہ سمندر ہوتے ہوئے بھی
محدود لگ رہا تھا
ہم دریا ہوتے ہوئے بھی
کناروں سے چپک رہے تھے
وہ اگلی نسل کی چڑیوں کے بیاہ ہونے تک
اس درخت کے وجود میں رہے گا
ہم اپنی کم فہمی کے جزیرے پہ اس کو تلاش کریں گے
مگر وہ تو اگلی سے اگلی
اور اس سے بھی اگلی
نسل کی چڑیوں کے بیاہ ہونے تک
اس درخت کے وجود میں رہے گا۔
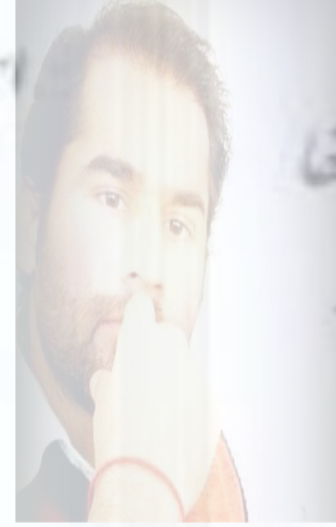
دائروں میں پھیلی لکیر

اس نے جب بھی بہانوں کے چراغ روشن کیے
میں نے اپنے یقین کی شمعوں کی لو نیچی کر دی
اس کے بہانے بھی تو عجب طرح کے تھے
وہ تیرنا نہیں جانتا تھا
مگر اپنے ملبوس کے پسینے میں تر ہونے کو
تالاب میں نہا کر بدن خشک کیے بنا
کپڑے پہن لینے سے تعبیر کیا کرتا تھا۔
وہ لڑ نہیں سکتا تھا
مگر اپنی قمیض کے پھٹے ہونے کو
وہ کسی سے لڑائی ہونے کی نشانی بتایا کرتا تھا
وہ بھولتا نہیں تھا
مگر کیلنڈر کی تاریخوں کے الٹ پھیر میں
دن کو سکیڑ کر لمحوں میں بدل دیتا تھا۔
وہ قید بھی نہیں رکھتا تھا
آزاد بھی نہیں کرتا تھا
وہ بھول بھی نہیں سکتا تھا
یاد بھی نہیں رکھتا تھا۔
اسے دیوار پہ دیوار اٹھانی آتی تھی
خواب کو خواب بنانا آتا تھا۔
بہتے پانی میں سائے تلاش کرنا اس کا شوق تھا
سانس روک کر پانی کی تہہ میں اتر جانا اس کا مشغلہ تھا۔
وہ سانس روکنے کا بہانہ کر رہا ہے
مگر چراغ ہیں کہ بجھتے چلے جا رہے ہیں
میں نے اپنے یقین کی مشعلوں کی لو بڑھائی
دیکھا کہ میرا وجود بھی اس کے بے جان سکڑے وجود کی طرح
سکڑتا چلا جا رہا تھا!

اُداسیوں کے چٹخنے کی آواز

موت ایک دروازہ ہے جو زندگی سے جلا وطنی کی سرزمین پہ کھلتا ہے۔

موت ایک روشنی ہے جو ہماری آنکھوں سے کشید کر کے مٹی میں بو دی جاتی ہے۔

موت ایک چراغ ہے جو بارشوں میں جلتا ہے اور آندھیوں کو اپنا رزق بناتا ہے۔

موت ایک آہٹ ہے جو دیکھی جا سکتی ہے، سُنی نہیں جا سکتی۔

موت ایک عنوان ہے جو کتاب کے ہر ورق پر ہر نئے نام کے ساتھ ہویدا ہوتا ہے۔

موت خامشی کا وہ لباس ہے جس میں کوئی تار نہیں کوئی گرہ نہیں۔

موت عاجزی کا وہ نوحہ ہے کہ جس میں لفظ بھی نقاب پہن لینا چاہتے ہیں۔

موت رخصتی کا وہ منظر ہے کہ جہاں آسمان بھی اپنی لامکانی کو خاک کر دیتا ہے۔

موت آگہی کا وہ لمحہ ہے کہ فراموش گاہوں میں پڑے دُکھ بھی مسرتوں کے آشیانے معلوم دیتے ہیں۔

بھولنے کے لیے ایک لمحہ بھی گراں ہوتا ہے

یاد رکھنے کے لیے ایک عمر، ناکافی ہوتی ہے۔

عُمر کے لمبے سائے

عُمر کے گلابی لمحوں میں
اندھیروں پہ الزام دھر کر بری الذمہ ہونے میں کتنا مزا آتا تھا
طوطے کی طرح پنجرے میں بند رہ کر
لوگوں کی واہ واہ پہ سکھائے ہوئے فقرے دہرا کر
کتنا سکون ملتا تھا۔

عُمر کے تپتے صحنوں میں سے ہو کر
سرنگوں جیسے اندھیرے جذبوں کو جاننے
کی سرسراہٹ
اور کسی کو پا لینے کی تنہائی کی طمانیت
اپنے ہی نام کے اگلے حصے کو خالی چھوڑ کر
مُسکراہٹ کے بھنور سے ٹوکریاں بھرا کرتی تھی

عمر اور خوف، دونوں کے سائے
میرے اندر لمبے ہو رہے ہیں
ایک ڈوبتے آدمی کی طرح
رینگتے جذبے
میری سانسوں کے زینے پہ
سیڑھی در سیڑھی
دھواں اُمیدوں کے ساتھ، دھواں میں نہا کر
میرے موم وجود کو پگھلا رہے ہیں۔

میں ہوں تم ہو اور وہ سب ہیں!

غوطہ لگاتے ہوئے اور تیرتے ہوئے
میرا دم گھٹنے لگتا ہے
اور میں باہر نکل آتی ہوں
حالانکہ مجھے موت سے خوف نہیں آتا ہے
ہر بلند عمارت پہ چڑھ کر
نیچے دیکھتے ہوئے مجھے لگتا ہے
میں گر جاؤں گی اور میں پیچھے ہٹ جاتی ہوں
حالانکہ مجھے موت سے خوف نہیں آتا ہے۔
سوتے سوتے، ایک دم گرنے کی دھمک سے
میں جاگ کر لرزتی رہتی ہوں
حالانکہ مجھے موت سے خوف نہیں آتا ہے۔
مذاق کرتے لوگوں کی باتیں سن کر

رو پڑتی ہوں
اُن کے ہنستے ہونٹ قبر کی طرح کھُلتے ہیں
میں اُن کے ہونٹوں پہ کافور کی سی تہہ دیکھتی ہوں
حالانکہ مجھے موت سے خوف نہیں آتا ہے۔
بارش سے سڑکوں پہ پھسلتی گاڑیوں میں
میں بھی ہوتی ہوں۔
اندھیرے میں رسی کو سانپ سمجھنے والوں میں
میں بھی ہوتی ہوں۔
میں ہوں، تم ہو اور وہ سب ہیں
کہ جو رسی پکڑ کر اوپر چڑھنا چاہتے تھے
مگر رسی اُن کے گلے پہ آ کے ختم ہو گئی۔
میں ہوں، تم ہو اور وہ سب ہیں
جو کہتے تھے
ہمیں موت سے خوف نہیں آتا ہے۔

آگ کی تپش سے گُلنار

میرے پاس ہر خیال کو بیان کرنے کے لیے لفظ تھے
رُوح کی تصویر اور تصویر کی رُوح کو بیان کرنا
مجھے آتا تھا
دل خوشی مانگتا تھا
ہونٹ لفظ مانگتے تھے
آنکھیں منظر چاہتی تھیں
راتیں بستر چاہتی تھیں
ایملی ڈکنسن کی طرح
میری بھی زندگی بھری ہُوئی بندوق تھی
جس میں کارتوس مَیں نے خود گِن کر بھرے تھے
مَیں نے اپنے ذہن میں جنازے کا بوجھ محسوس کیا تھا
اور بیان بھی کیا تھا۔

کہ میرے پاس ہر خیال کو بیان کرنے کے لیے لفظ تھے۔
درختوں پہ بھاگتی گلہریوں کی طرح
مَیں تم سے ملنے جاتی تھی
تم نے میری خامشی میں بھی اپنا گھر بنایا ہُوا تھا
اور میری گفتگو کی کھڑکیوں سے
تمھیں وصال کی خوشبو آتی محسوس ہوتی تھی
تمھارے فیصلے کی دیوار میں کہیں شگاف نہ تھا
لاکھوں سالوں کی روشنی
تمھاری آنکھوں میں ایسے مرتکز تھی
کہ مَیں اُسے بیان نہیں کرسکتی تھی۔
مَیں کہ جس کے پاس ہر خیال کو بیان کرنے کے لیے لفظ تھے!

جنم پتری

تمھارے پاس اعتماد کی خالی چھاگل ہے
اور میں چالیس برس سے پیاسی ہوں۔
تمھارے پاس مستقبل دیکھنے کو محدب شیشہ ہے
اور میں آج کے صحرا میں، شاہراہ کی متلاشی ہوں۔
تمھارے پاس اطمینان کی گھری پتاور ہے
اور میں بے چینی کی دھوپ میں جھلس چکی ہوں۔
تمھارے پاس شبنم جیسی محبت کے پتوار ہیں
اور میں سمندر میں ڈوبتے شخص کے ہاتھ کی طرح
لمحاتی زندگی کی شفق بن کر ظاہر ہوں
تمھاری مٹھی میں خوابوں کے جگنو چمک رہے ہیں
اور میرے ہاتھوں میں سوئی اُداسی
ہاتھ کی لکیروں کے راستے بدن میں اُترنا چاہتی ہے۔

تمھارے ہونٹوں کی بہار دستک دے رہی ہے
میرے دل کا بند دروازہ
آندھی بھی نہیں کھول سکی تھی
سیلاب میں بھی نہیں بہا تھا
زلزلے سے بھی نہیں ہلا تھا۔
اعتماد کی خالی چھاگل لیے
تم اس دروازے پہ کب تک کھڑے رہو گے!

سانول موڑ مہاراں

غلار ہن کے ہوا میں پر مارنا
زندگی ہوتی
تو میرا آشیانہ سب سے اُونچا ہوتا۔
بل کھاتی سڑکوں، گھنے جنگلوں
بہتے دریاؤں اور اُترتی آبشاروں میں سے
کوئی بھی تو تم سے رشتہ نہیں بناتا ہے،
تمھاری دستار چاقو کی سی تھی
مگر صرف چاقو کا دستہ بن کر
تم نے خود ہی پناہوں کے پردے چاک کیے
تمھاری زندگی کی ہر صبح
سورج کی منڈی میں بے بھاؤ اُٹھالی گئی
تمھیں پرمٹ پہ جتنی آزادی ملتی ہے

اس کا راشن تو ایک صبح کے لیے ناکافی ہوتا ہے۔
مَیں اب سمندر کی سب سے اُونچی لہر میں خود کو تحلیل کر کے
ریت بن کے بکھر چکی ہوں۔
ساحل سمندر میری وسعت
اور آنسوؤں کی طرح نمکین پانی میری حیات۔
[illegible]ل لگے پروں کے ساتھ تڑپتی چڑیا
[illegible]رے سینے پہ آگرتی ہے۔
ہوا اور تیز چلتی ہے۔
[illegible]ت اور گہری ہوتی ہے۔
[illegible]بت، مرنے کی قیمت دے کے، حاصل ہوتی ہے۔
[illegible]سمندر کی سب سے اُونچی لہر اور مَیں!
[illegible]احل پہ بکھری ریت اور مَیں!

اندھا موڑ

عید کارڈوں پہ چھپے چہروں کی سی ہنسی
میری پتھرائی آنکھوں والے چہرے پہ نمود کیسے حاصل کرے
کہ یہاں خبروں میں بھی بے خبری کے دھوئیں کا ذائقہ ہے۔
دھوبی سے دُھل کے آنے والی قمیض پہ لگے
آدھے بٹن کو اُس کا دوسرا آدھا وجود کون دلائے گا۔
ہوا تو اتنی تلخ اور گرم ہے
کہ شام کے پرندے بھی آشیانوں کو پلٹنے سے گریز کر رہے ہیں۔
سُرخ سورج، بھوری ہوا
نارنجی اُفق اور کالے کوے
ان میں سے کسی نے اپنی وصیت نہیں لکھی۔
خاموشی اور پتھر کے درمیان چلتے ہوئے سُورج نے پوچھا
بارش کی خوشبو دینے والی ہوا
میرے پیار کا موسم کیوں نہیں!
مَیں اپنے بے حقیقت اعتماد کو پلٹ کے دیکھتی ہُوں
اور ناخن چباتے چباتے
میری زبان دانتوں تلے کٹ جاتی ہے
خاموشی اور پتھروں کے درمیان چلتے چلتے
اُس کے سینے میں سُورج غروب ہو چکا ہے
اور میرے ماتھے پہ سُورج مُکھی کا پھُول کمہلا رہا ہے۔

فراق کی ریت ساحلوں سے آنکھوں تک پہنچتی ہے
تو وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے
کہ وہ آنکھیں
صرف مجھے پہننے، جاننے اور پہچاننے کے لیے کھولتا ہے۔
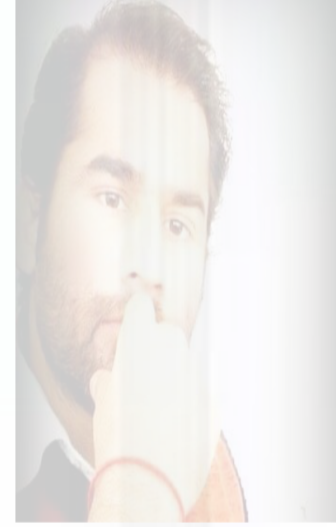
خاموش زمینوں کی شناخت

جیسے اُس نے مجھے پہنا، جانا اور پہچانا
کاش وہ مَیں لکھ سکتی
کاش مَیں بتا سکتی
کہ اُس نے مجھے روشنی سے جُدا ہوتے اندھیرے میں بھی دیکھا ہے
اور اندھیرے کو پی جانے والی روشنی میں بھی پہچانا ہے۔
اس کی انگلیاں، اندھیرے، نیند
اور تمام خاموش زمینوں کو پہچانتی ہیں
وہ سمندر اور زمین کے وصال کے فرق کو بھی پہچانتی ہیں۔
سمندر، جب حدِ وصال سے آگے بڑھتا ہے
تو زمین اُسے واپس بھیج دیتی ہے۔
اُس نے کبھی مجھے واپس نہیں بھیجا
حالانکہ وہ زمین ہے اور مَیں سمندر،

تلخیوں کا ثمر

کاغذ پہ بنی ہوئی مسکراہٹ
ہونٹوں پہ چپکانے سے
زندگی میں غروب آفتاب کا منظر نہیں بدلے گا۔
روز صبح چڑیوں کا گانا
مجھے بولنے پہ اُکساتا ہے
مگر میرے اندر کا سانپ میرے نطق کو ڈس لیتا ہے۔
میں نے آدھی رات کو
چاند کو دودھیا بادلوں کو حاملہ کرتے دیکھا
تو بادام کے درخت کی طرح تمھارا پیکر
میرے وجود کی کھڑکی پہ جھک گیا۔
دو لائنیں
دو محبت بھرے قدموں کی طرح
ساتھ ساتھ چلنا چاہتی ہیں
اندھیرا میرے اندر ہاتھ پھیلاتا ہے
کہ اب میری رگوں میں خون کی جگہ
اندھیرا سرسراتا ہے۔
اب کھڑے ہوتے سورج کو دیکھ کر
میرے وجود کی صبح آزاد ہونے سے انکار کرتی ہے۔
بارش بند ہونے کے بعد بھی درختوں پہ ٹھہری بوندیں گرتی رہتی ہیں
ایسی ہی ٹھہری بوند میرے ہونٹوں پہ گرے
تو میں اُسے چاہت کی بارش کیسے سمجھ لوں:
اس زمین پہ تاریخ اور یادداشتوں کو نابود کر دو
تو شاید زندگی میں غروب آفتاب کا منظر بدل جائے!

مینڈا عشق وی توں ....

میں ہوا کی طرح آزاد ہوتی
تو کتنی بار تمہیں چھوا ہوتا
تم روشنی کی طرح ناقابل گرفت نہ ہوتے
تو میں تم میں نہانے کے علاوہ
تمہارے پیکر میں جذب تو ہو سکتی۔
شام کے لمبے سائے کی طرح
تمہارا سایہ مجھ سے لمبا نہ ہوتا
تو زندگی کی دوپہر ہی میں سہی
ہمارے سائے یک جان تو ہو سکتے۔
میری آنکھیں آئینہ بنی دیکھ رہی ہیں
کبھی کبھی کوئی رات پوری رات نہیں لگتی ہے
کبھی کبھی کوئی دن پورا دن نہیں لگتا ہے۔

میں ایسا ہی دن
اور ایسی ہی رات پہنے
اندھیرے ڈھلوان پہ چڑھتی چلی جا رہی ہوں
میلے میں اکیلے رہ جانے والے بچے کی طرح،
خیالوں کی کلیاں جو تم نے میرے پلو میں باندھی تھیں
کھلنے کے لیے منہ کھول رہی ہیں۔
زندگی کی لہریں بھنور میں بدل جاتیں
تو ساحل مراد کیسے ملے!
بھنوروں جیسا گہرا درد مجھ سے پوچھتا ہے
سورج کے ڈوبنے سے پہلے میں نے دن کا چراغ کیوں بجھا دیا!

اے میرے الزام گرفتہ

ہم کہ جو ماں باپ کی لڑائی کو خفیہ رکھنے کے لیے
کمروں میں بند کر دیے جاتے تھے
ایک ہی کمرے کے اسیروں کی طرح بڑے ہُوئے۔
ایک ہی کمرے میں بند پرندے ہر چند محبتوں کے مزاج داں نہیں ہوتے
ہیں۔

پھر بھی آنکھ کو دیکھتے رہنے اور زبان کو گفتار دینے کے لیے
کچھ کیفیتوں کو تو پہنتے ہیں۔
قید اور جلا وطن لوگ بھی یونہی اکٹھے رہتے ہیں
اور ایک مقام پہ سانس لینا رفاقت مانا جاتا ہے۔
ہمارے گلے میں باتیں پھنسی رہتی ہیں
جب بولنا نہ ہو تو گلا بھی صاف نہیں کرنا پڑتا ہے
بچپن میں بڑوں کے جوتے پہن کے چلو

تو سبھی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں
بڑے ہو کر وہی جوتے پہنو تو بڑوں کا مقابلہ کرنے کی
بُری نیت کا الزام لگتا ہے
اے میرے الزام گرفتہ!
محبتوں کے مُردار ہونے پر، پُرانے خط، تحائف
تصویروں اور ملاقاتوں کی نشانیاں
ڈسٹ بن میں پھینک کر، مطمئن چہروں کو
آدابِ محبت سکھانے، تم بہت دیر سے پہنچے ہو!

کھوکھلے تنے جیسے رشتے

بے ساعت زندگی کو ساعتوں میں تلاش کرتے ہوئے
کبھی اگر پھول ہاتھ آ جائیں
تو وہ تمھارا حق نہیں ہوتے۔
خوشبو کسی سے پوچھ کے سفر نہیں کرتی ہے
اور زلزلے، آنگنوں اور ملکوں کی حدود میں
محدود نہیں ہوتے ہیں
یہ تو انسان ہی ہے جس کے لیے
اپنی آزادی کا استعمال مسئلہ بنا ہوتا ہے۔
راستوں سے آشنا تو اندھیرے میں بھی
بے دھڑک چلتے ہیں۔
دروازے کی گھنٹی صرف تم نہیں بجاتے
مگر کان صرف یہی اعتبار چاہتے ہیں

بے دھڑک اعتبار ——
راستوں کی نارسائی کے باوجود،
نفرت کی پتیاں میری شاخوں سے جھاڑنے کے بعد
بارش نے مجھے کیا دیا ہے!
تم ساری عمر اپنی شخصیت کی اُٹھتی لہروں کو
اپنی انگلیوں کے تناؤ میں منتقل کرتے رہے ہو
میں نے تو اعتبار کا چھالا اپنے اُوپر تانا تھا
مگر بارش نے مجھے کیا دیا ہے!

فوٹوفنش

ایک مسکراہٹ تم نے میری بچپن کی تصویر میں دیکھی تھی
جب میں نے انگوٹھا منہ میں لے رکھا تھا۔
ایک مسکراہٹ تم نے میری اُس تصویر میں دیکھی تھی
جب میں نے محبت کی جھریاں اپنے چہرے پہ اوڑھی ہوئی تھیں۔
ایک مسکراہٹ تم نے میری اُس تصویر میں دیکھی تھی
جب زندگی کے تالے میں میں نے موت کو چابی گھماتے دیکھا تھا۔
ایک مسکراہٹ مجھے اُدھار مانگنی پڑی تھی
تم سے بات کرنے کو
کہ شادی کے دن اُتاری ہوئی تصویر میں
ہم آج بھی مسکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔
روایت کو نبھانے کے لیے
ہمیں اُدھار مانگی ہوئی چیزوں پر گذارا کرنا پڑتا ہے۔

محلے سے مانگی ہوئی چینی سے شیرینی
اور آگ سے حرارت پیدا کرتے ہوئے
دیواروں کے بھی پلستر اُکھڑ گئے ہیں۔
ہمیں آپس میں بات کرنے کے لیے بھی
ایک تیسرا فرد اُدھار مانگنا پڑتا ہے۔
اب تم نے بات کرنے کا انداز بھی بدل دیا ہے
اب تصویر اُتارنا، تمہاری بات کا اسلوب ہے۔
لکڑی کے ڈبے میں بند ٹیلیفون کے ساتھ
تم نے میرا کلوز اپ بنایا تھا
مجھے اس بند ٹیلیفون کا ریسیور
اپنے سے معتبر معلوم ہوا
تم نے اس لمحے کی مسکراہٹ کی تصویر کیوں نہیں اُتاری؟

خوابوں کی البم

آنسو بننے کے بعد، مگر گرنے سے پہلے
روشنی کو بھی پتھر کر دیتے ہیں۔
مَیں تو تہوں سے ہنستی ہوئی اُبھری تھی
مَیں تو خود کو پا لینے اور فراموش کر دینے کی
ساری قوتیں اپنی مٹھی میں رکھتی تھی
مگر مجھے خواب میں بار بار سفر دکھائی دیتے تھے۔
آدھی رات کو گونجنے والی چیخ کی طرح
کہیں کسی نے ڈائنامائٹ سے پہاڑ میں
راستہ پیدا کیا ہے
اور مجھے بتایا ہے کہ پردہ اُٹھانے کے باوجود
اندھے کی طرح، روشنی میرا مقدر نہیں۔
اکیلے بیٹھے بیٹھے، تھک کر

مَیں نے چاند کو دعوت دی
کہ آؤ اور آ کر میرے ساتھ چائے پیو
اکیلے بیٹھے بیٹھے تھک کر
مَیں نے آئینے کو دعوت دی
کہ آؤ اور آ کر میرے ساتھ باتیں کرو
چاند اور آئینے نے مجھے بتایا
کہ خوشیاں کیسے آہستہ آہستہ مرتی ہیں
کہاں مرادوں کی فصل پکتی اور کہاں کاٹی جاتی ہے۔
شہروں اور دعوتوں کے جلے خرمن کا ڈھیر
اتنا اُونچا تھا کہ مَیں اُس پار نہیں دیکھ سکتی تھی۔
مجھے تو ہمیشہ گاڑی کی وہ سیٹ ملی
جہاں دھکّے بہت لگتے تھے۔

آئینہ — میرے اور تمھارے درمیاں

آئینہ، شکل دیکھنے سے پہلے ہی دھندلا ہوگیا ہے
پتے، بہار آنے سے پہلے ہی جھڑ گئے ہیں
آنکھیں، کچھ دیکھنے سے پہلے ہی پتھرا گئی ہیں
سفر، منزل سے پہلے ہی ختم ہوگیا ہے
آسمان کو یرقان ہوگیا ہے
اور زمین کو دُھندنے مکڑی کے جالے کی طرح
اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے
پیڑوں کی طرح، برف پہن کے کھڑے رہنے کا صبر
مجھ میں نہیں
گھاس کی طرح برف اوڑھ کے
پھول ارزاں کرنے کا حوصلہ
مجھ میں نہیں
خاموشی کے فرش پہ ننگے پیر رہنے کا جذبہ
مجھ میں نہیں
تمھیں گم گشتہ خوشیاں ڈھونڈ کے لانے کا
پیامبر سمجھا تھا
گم گشتہ غم نہیں۔
کہ میرے حوصلوں کی جھولی سے زیادہ
میرے اندوختے، میرے غم!
مجھے پہلے ہی تار تار کیے ہوتے ہیں۔

موت قبول کرنے کے بعد

گیس بھرے غباروں کی طرح
ہماری گاڑی کے شیشوں سے قہقہے نکلتے ہیں
کبھی کبھی چادر منہ پہ ڈال کے
میں قہقہوں کو قید کرنے کی کوشش کرتی ہوں
گٹر میں گرتے بچے کی آواز کی طرح۔

برسات میں چمکتے جگنوؤں کی طرح
ہماری آنکھوں کے باغوں میں رات کی رانی مہکتی ہے
میں دوپٹے کے پلو میں جگنوؤں کو پکڑتی ہوں
بہت سی قید چڑیاں
پنجرے میں پر پھڑپھڑاتی ہیں
رات کی رانی کی خوشبو
آئینے کی طرح مجھے دیکھتی ہے
دائرے میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر
ناچتی لڑکیوں کی طرح ہمارے سر چکراتے ہیں
میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔

آدھی رات کو شعر لکھنے
اور بھری دوپہر میں سونے کی عادت
آنکھوں میں زنجیریں۔ یہ آن دھمکتی ہے۔
آنکھوں میں لومڑیوں جیسی مکاری
مگر اوپر سے نیچے گرنے کا خوف،
سارے خوابوں میں ایک ہی کمرہ
اور ایک ہی جالا تھا
مگر انسان بدل رہے تھے
پھر مجھے گاڑی، برسات، رات اور خواب
گٹر میں گرتے بچے اور آئینے میں کھڑی دیواروں کی طرح نظر آئے۔

گونگے انسانوں کی ہلتی انگلیوں کی طرح
ہمارے پیکر گاڑی کی سیٹوں پر موج بن جاتے ہیں۔
وہ موج پایاب میری آنکھوں میں زعفران گھول رہی ہے۔

آؤ میرے ہاتھ میں ٹھہرے پانی کے دریا کو دیکھو
میری آنکھوں کے ڈوبتے چاند کی آخری لکیر
دو دھاری تلوار، پُل صراط!
ہَوا کو نگل کے مَیں کس سمت جاؤں
کہ میرے پاؤں میں
جگنوؤں کی جگہ بددُعا بندھی ہُوئی ہے!

خواب پہ جاگنے کا الزام

مجھے اپنی قبر پہ آپ رونے کے لیے پیدا کیا گیا ہے
کہ خودکشی قناعت کو جنم نہیں دیتی ہے۔
مَیں نے کسے جنم دیا تھا۔
کہ اس کی نشانیوں میں نہ عمارت ہے نہ کھنڈر۔
مَیں نے زندگی سے ملنے کا وعدہ کیا تھا
ملنے گئی تو سامنے بے بسی کا جزیرہ تھا۔
مَیں نے موت سے ملنے کا وعدہ کیا تھا
اور آنسوؤں نے نقاب پہن کر
میری میزبانی کی،
یہیں میرے قلم کو سوکھے کی بیماری لگی
اور انگلیوں نے باتیں لکھنا چھوڑ دیں۔
برستی بوندوں کو کون گن سکا ہے!

گنتی کس چیز کی
میں نے اپنے صحن میں آج کو کل ہوتے دیکھا ہے
اور میں ان لمحوں کو نہیں گن سکی
جو بچوں کی طرح آنکھ میچ کے چور پکڑنے کے
انتظار میں گزار رہے ہیں۔
میرے دل کا پچور میرے زخم ہیں
جو میری گردن تک پہنچ تو جاتے ہیں
مگر بے بسی کے جزیرے پہ چھوڑ کر
پھر ملنے کا وعدہ کر کے چلے جاتے ہیں۔

سفید پیالے میں سفید دودھ

سفید پیالے میں سفید دودھ!
رنگوں کا فرق تو اب بھی باقی ہے۔
چکنائی بھی تو چمکتے رنگ کو کھا جاتی ہے
جیسے چکراتے سر کے ساتھ کتاب پڑھو تو
تصویر بھی اُلٹے وجود کی طرح
سر چھت پہ لگے اور سطریں اوندھے منہ دکھائی دیتی ہیں۔
میں نے سمجھا تھا کہ نیم خوابی کے عالم میں اُٹھ کر پانی پینے اور بھول جانے کا عمل
اور جاگتے میں دوسروں کی پیاس بجھانے اور بھول جانے کا عمل
خیالوں سے بھرے دماغ اور خالی صفحے کے توازن کی طرح
یکساں ہوتا ہے۔
میں نے سمجھا تھا، اندھیرے میں رسی کو سانپ سمجھ کر
ڈر کر انگلی پکڑنا

اور ڈھلان سے اُترتے ہُوتے، سہارا لینے کا یقین دلا کر
انگلی پکڑتا
پناہ جیسا ہوتا ہے۔
مَیں بیٹھ جاتی ہُوں
کہ خالی پن میرا وجود بنتا جا رہا ہے۔

سنسر شپ

جن زمانوں میں کیمرہ ظُلم کو ہمیشہ کے لیے
مشتہر نہیں کر سکتا تھا
تمھیں اُن زمانوں تک ہی
ظلم کو بہادری کا نام دینے کی تاریخ لکھنی چاہیے تھی۔
آج سلولائیڈ پہ منتقل منظروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے
کہ پہاڑی ڈھلوانوں پہ جڑوں سے ٹوٹتے درختوں کی آواز اور
منظر نامہ کیسا ہوتا ہے۔
چاہے تم خوش ہو یا افسردہ
سانس تو لیتے ہو۔
آنکھیں کھولنے یا بند کرنے سے
ذہن پہ نقش، منظر نہیں بدلتا ہے۔
دریا میں کھڑے درخت کا تنا

اور ڈھلان سے اُترتے ہُوئے، سہارا لینے کا یقین دلا کر
انگلی پکڑنا
پناہ جیسا ہوتا ہے۔
مَیں بیٹھ جاتی ہُوں
کہ خالی پن میرا وجود بنتا جا رہا ہے۔

سنسر شپ

جن زمانوں میں کیمرہ ظُلم کو ہمیشہ کے لیے
ختم نہیں کر سکتا تھا
تمھیں اُن زمانوں تک ہی
ظلم کو بہادری کا نام دینے کی تاریخ لکھنی چاہیے تھی۔
آج سلولائیڈ پہ منتقل منظروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے
کہ پہاڑی ڈھلوانوں پہ جڑوں سے ٹوٹتے درختوں کی آواز اور
منظر نامہ کیسا ہوتا ہے۔
چاہے تم خوش ہو یا افسردہ
سانس تو لیتے ہو۔
آنکھیں کھولنے یا بند کرنے سے
ذہن پہ نقش، منظر نہیں بدلتا ہے۔
دریا میں کھڑے درخت کا تنا

اور ڈھلان سے اُترتے ہُوتے، سہارا لینے کا یقین دلا کر
انگلی پکڑتا
پناہ جیسا ہوتا ہے۔
مَیں بیٹھ جاتی ہُوں
کہ خالی پن میرا وجود بنتا جا رہا ہے۔

سنسر شپ

جن زمانوں میں کیمرہ ظُلم کو ہمیشہ کے لیے
ثابت نہیں کر سکتا تھا
تمھیں اُن زمانوں تک ہی
ظُلم کو بہادری کا نام دینے کی تاریخ لکھنی چاہیے تھی۔
آج سلولائیڈ پہ منتقل منظروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے
کہ پہاڑی ڈھلوانوں پہ جڑوں سے ٹوٹتے درختوں کی آواز اور
منظر نامہ کیسا ہوتا ہے۔
چاہے تم خوش ہو یا افسردہ
سانس تو لیتے ہو۔
آنکھیں کھولنے یا بند کرنے سے
ذہن پہ نقش، منظر نہیں بدلتا ہے۔
دریا میں کھڑے درخت کا تنا

اور ڈھلان سے اُترتے ہُوئے، سہارا لینے کا یقین دلا کر
انگلی پکڑتا
پناہ جیسا ہوتا ہے۔
مَیں بیٹھ جاتی ہُوں
کہ خالی پن میرا وجود بنتا جا رہا ہے۔

سنسر شپ

جن زمانوں میں کیمرہ ظلم کو ہمیشہ کے لیے
ختم نہیں کر سکتا تھا
تمھیں اُن زمانوں تک ہی
ظلم کو بہادری کا نام دینے کی تاریخ لکھنی چاہیے تھی۔
آج سلولائیڈ پہ منتقل منظروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے
کہ پہاڑی ڈھلوانوں پہ جڑوں سے ٹوٹتے درختوں کی آواز اور
منظر نامہ کیسا ہوتا ہے۔
چاہے تم خوش ہو یا افسردہ
سانس تو لیتے ہو۔
آنکھیں کھولنے یا بند کرنے سے
ذہن پہ نقش، منظر نہیں بدلتا ہے۔
دریا میں کھڑے درخت کا تنا

سُورج کو بارش سے بچاؤ

جس زمانے میں آنکھیں اپنی اور چہرہ کسی اور کا ہو
بوسہ، محبت کی گویائی نہیں رکھتا ہے۔
جن چیزوں کے بارے میں جانتے ہو
اُن کا پالینا ضروری تو نہیں ہوتا ہے
خیال بھی تو پیکر کا متلاشی رہتا ہے۔
خوشبُو، پیکر نہیں پاسکتی
شاید اسی لیے بکھری بکھری لگتی ہے۔
تم بھی تو شعلے کی طرح بھڑکتی
اور جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہو۔
بچّوں کے تتلیاں پکڑنے کے جذبے کی طرح
بے ساختہ۔
محبت کرنے سے پہلے

محبت کا خواب کتاب میں نہیں ملتا ہے۔
تمھیں پتہ نہیں چلتا کہ کب تمھارا دِل شفقت سے
اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں
شاید اُس وقت
جب تمھارے اپنے رازوں کی چیخوں سے
تمھارے کان پھٹ رہے ہوں۔
کانوں پہ تکیہ یا ہاتھ رکھ لینے سے
آوازوں کا شور ختم تو نہیں ہوتا
سوکھے پتے تو ادھ کھُلے دروازوں میں سے بھی
اندر آجاتے ہیں۔
کوئی چراغ ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ ہمیں کدھر جانا ہے۔
رات جانے کیوں
ساحلوں اور ریلوں پہ آکے گہری ہوتی ہے
اور سُورج کو بارش سے بچانے کے لیے
آسمان اُفق پہ اپنی آغوش وا کر دیتا ہے۔

نان کمیونیکیشن

ململ کے پیرہن سے جھانکتے بدن کی طرح
اب میرے دماغ کی ساری تنی شریانیں نظر آرہی [illegible]
جدائی کا پہلا دن، دوسرے سے سہل تھا
کہ پہلے دن کی پہلی رات
شہزاد کی طرح کہانیاں سناتے گزر گئی تھی۔
ایک ہزار ایک راتوں جیسی ایک رات
سفید، بے تحریر کاغذ جیسی،
یہ بے سلوٹ اُجلا پن
ہونٹوں پہ حرف آنے سے پہلے
دماغ میں بنتے تصور کی طرح ہوتا ہے۔
میرے دن رات کے پُرہجوم زمانے میں
تم

بالوں سے گزرتی کنگھی کی طرح
اپنے وجود کا اعلان کرتے رہتے ہو
مگر برافروختگی اور محبت
میرے کھچڑی بالوں کی طرح
میرے اندر جال بُنتی رہتی ہے۔
آسمان پہ ٹکڑے ٹکڑے، بکھرے بادلوں کی طرح
دیمک زدہ ورقِ زیست
ردی کے بھاؤ بھی نہ بک سکے گا۔
بادلوں کی طرح گرجتے تم
اور بارش کی طرح برستی میں،
دو بہرے گانے والوں کی طرح
ایک دوسرے کو گانا سنا رہے ہیں۔

قدغنِ شوق

کھڑکی سے آنے والی ہر ہوا چمن سے نہیں آتی ہے
جیسا کہ درخت کی کوکھ میں ہر کھوکھلا پن
آشیانہ نہیں ہوتا ہے۔
جیسے ڈائری میں لکھا ہر ٹیلیفون نمبر نہیں ہوتا ہے۔
جیسے رات اور اندھیرے کے ماتھے پہ
گناہ تحریر نہیں ہوتا ہے۔
جیسے پولیس مقابلے میں مارے جانے والا
ہر شخص مرا نہیں ہوتا ہے۔
جیسے پھانسی کے پھندے میں لٹکنے والے کی تصویر
پھانسی پانے کی ضمانت نہیں بنتی ہے۔
جیسے کلکاریاں مارتے بچوں کی ہنسی
جوان ہو کر چمنیوں سے نکلتے دھوئیں کی طرح

بہت بلند، بہت دودھیا، مگر بہت بے وزن ہوتی ہے۔
وال پیپر سے بنے آسمان پہ
ہم دوستی اور زندگی کے ستارے ٹانکتے ہیں
مگر موت، دھوکے اور جھوٹ کو اپنے سے دور رکھتی ہے
اور ہوا چھتوں کی بلندیاں بتاتی ہوئی چلتی ہے۔

موم محل

میرے بیاہ سے پہلے میری ماں
خواب میں ڈر جایا کرتی تھی
اُس کی خوفناک چیخوں سے میری آنکھ کھُل جاتی تھی
مَیں اُسے جگاتی، ماجرا پوچھتی
اور وہ خالی آنکھوں گھورتی رہتی
اُسے خواب یاد نہیں رہتے تھے۔

ایک رات خواب میں ڈر کر
اس نے چیخ نہیں ماری
خوف زدہ ہو کر مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا
مَیں نے ماجرا پوچھا
تو اس نے آنکھیں کھول کر شکرانہ ادا کرتے ہُوئے کہا،
"مَیں نے خواب میں دیکھا تھا
تم ڈوب رہی ہو اور مَیں نے تمھیں بچانے کو دریا میں چھلانگ لگائی ہے"
اور اُس رات بجلی گرنے سے
ہماری بھینس اور میرا منگیتر جل گئے تھے۔

ایک رات ماں سو رہی تھی اور مَیں جاگ رہی تھی،
ماں بار بار مٹھی بند کرتی اور کھولتی
اور یوں لگتا کہ جیسے کچھ پکڑنے کی کوشش میں تھک کر
مگر پھر ہمت باندھ کے مٹھی بند کرتی ہے
مَیں نے ماں کو جگایا
مگر ماں نے مجھے خواب بتانے سے انکار کر دیا۔
اُس دن سے میری نیند اُڑ گئی،
مَیں دوسرے صحن میں آ گئی،
اب مَیں اور میری ماں دونوں خواب میں چیخیں مارتے ہیں
اور جب کوئی پوچھے
تو کہہ دیتے ہیں
ہمیں خواب یاد نہیں رہتے۔

ماضی میرے کندھوں پر

کوئی دیکھتا ہو تو سوتے ہوئے بن جانا
بڑا مسحور کن لگتا ہے۔
واٹر کلر سے بنے ہوئے ایسے مناظر
بارش سے بچا کر رکھنے پڑتے ہیں۔
بالکل ایسے جیسے
گہری نیند کے نامعلوم وقفے میں جاگ کر
ہم پھر سو جاتے ہیں۔
قبروں پہ تازہ پھول چڑھانے والوں کو
آخر کوئی سکون تو ملتا ہوگا
کہ خالی ہاتھ لوٹتے ہوئے، اُن کی آنکھیں بھری ہوتی ہیں۔
لڑکی ہوتے ہوئے سوتے ہوئے بن جانا
مسحور کن،

اور عورت ہوتے ہوئے سوتے ہوئے بن جانا
عذاب سے محفوظ ہونے کا راستہ ہے
کہ ایسے لمحے میں سفر اور حضر دونوں کے لیے
نہ پیر ہوتے ہیں اور نہ حوصلہ۔
اُمید کے بغیر زندگی گزارنے کے عمل میں
رنگدار شیشوں میں سے جھانکو
تب بھی منظر نامہ بہار تحریر نہیں کرتا ہے۔

ٹرانسپرنسی

کالے کمروں میں سبز آگ
باہر خزاں زدہ پتّوں کے بیچ
پیلی دُھول میں ناچتی خواہشوں کے
پیروں تلے، ہوا کی ٹوٹتی انگڑائی
اور مختصر دُھوپ،
خاموشی اور تنہائی کے بھیگے رومال
کو خشک نہ کر سکی۔
کسی قسم کے خط یا شخص کے نہ آنے
کا منظر نامہ
سامنے والی کھڑکی سے صاف نظر آ رہا ہے۔

اور اُس کے بعد — ایک لمبی چُپ[1]

خزاں آلود سڑک پہ نہر کے کنارے
ہم اور تم فرستادۂ بہار لگ رہے تھے
کھیلتے ہُوئے بچّوں نے ہمیں دیکھا تھا
شاید ہماری مسکراہٹ بھی ان کی طرح معصوم تھی
بے صبری کی چھاؤں میں جھلستے ہُوئے، ہم نے
نہر کی ساری لہروں کا ارتعاش
اپنے بدن میں مجسّم ہوتا محسوس کیا تھا
اور ہماری سلامتی کی ساری جڑیں
ان درختوں کی کوکھ میں نظر آ رہی تھیں
جنھوں نے شاخوں کو برہنہ کر کے

---

[1] منیر نیازی

ہماری بانہوں کو وصال کی فراخی کا آئینہ دکھایا تھا
گیلی مٹی میں دھنستے قدم،
ہمیں یُوں لگا جیسے ہم اپنے تصور میں چل رہے ہوں
ہمیں اپنی پیاس کا پہلا دن یاد آگیا تھا ۔

بادل میرے کمرے میں

میرے اور تیرے بدن سے
حیات کا شجر مہک اُٹھتا ہے۔
میرے خون کی جلترنگ
اور تیری دید کا دریا
وصال کی کلیوں کی شگفتگی کو
مانوس نمی سے آشنا کرتا ہے۔
اُڑتے بادلوں جیسے ہلکے بدن
خواہشوں کے گھنے جنگلوں کی چھاؤں میں
پاؤں پسارے
صاف پانی سے صاف مُسکراہٹیں اوڑھے
سوجاتے ہیں

جب تُو نہیں ہوتا
تو بھی، تیرے فراق کا ہر لمحہ
تجھ جیسا ہوتا ہے۔

حاشیہ

تمھیں اُس سے ملنے کی عادت ہو گئی ہے
عادتیں، کہ جو بھوک پیاس کی طرح
اپنے وجود کا احساس دلاتی ہیں
تمھیں چوس کر
تمھارے باہر صرف معمولات کا چارٹ
ٹانگ دیتی ہیں
جیسے کُتا چابی والے خرگوش کے پیچھے بھاگتا ہے
بالکل ویسے ہی سارا دن
تم اپنے معمولات کے گرد بھاگتی ہو
اور اُس سے ملنے کو بھی . . . . . .

سرد ملکوں کے آقاؤں کے نام

میرا ملک گرم ہے
میرے ہاتھوں کی تپش کا سبب شاید یہی ہے۔
میرا ملک گرم ہے
میرے پیروں کے جلنے کا سبب شاید یہی ہے۔
میرا ملک گرم ہے
میرے بدن پہ آبلوں کا سبب شاید یہی ہے
میرا ملک گرم ہے
میرے گھر کی چھت پگھل کر گر جانے کا سبب شاید یہی ہے۔
میرا ملک گرم ہے
میری دیواروں کے جھلسا دینے کے رویے کا سبب شاید یہی ہے۔

میرا ملک گرم ہے
میرے بچوں کے پیاسے رکھے جانے کا سبب شاید یہی ہے۔
میرا ملک گرم ہے
میرے بے لباس رکھے جانے کا سبب شاید یہی ہے۔
میرا ملک گرم ہے
شاید اسی لیے نہ برستے بادلوں کے آنے کا پتہ چلتا ہے
اور نہ سیلابوں کے گزر جانے کا
کہ میری فصلوں کے اُجاڑنے کو
کبھی مہاجن کبھی جنگلی جانور کبھی آفتیں
اور کبھی خود ساختہ آقا آن دھمکتے ہیں۔
مجھے اپنے گرم ملک سے نفرت کرنا مت سکھاؤ
مجھے ان آنگنوں میں اپنے گیلے کپڑے سکھانے دو
مجھے اس کے کھلیانوں میں سونا اُگانے دو
مجھے اس کے دریاؤں سے پیاس بجھانے دو
مجھے اس کے درختوں کی چھاؤں میں سانس لینے دو
مجھے اس کی دھول کو پہننے اور مسافتوں کو اوڑھنے دو
مجھے لمبے ہوتے سایوں کی چھاؤں نہیں چاہیے
مجھے تو نکلتے سورج کی شعاعوں کی حمایت حاصل ہے
سورج اپنی توانائی میرے ملک میں ارزاں کرتا ہے

سورج اور ریت
سورج اور تم
ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے
سورج تو میرا ہم سفر ہے۔

بارش میرے اندر

تمھیں ہمیشہ میرا وجود کھڑکی کی طرح معلوم ہُوا
جب چاہا کھولا، نظارے کا لُطف لیا
ہَوا اور رنگ کو بدن لباس کیا
اور جب چاہا، طوفان سے بچنے کو
در بند کر کے، مجھے اوڑھ کے بیٹھ گئے۔
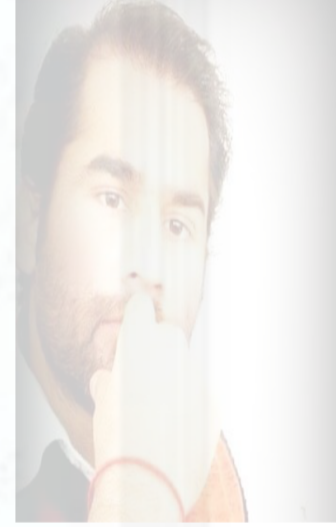
تمھیں ہمیشہ میرا وجود سرنگ کی طرح معلوم ہُوا
جب چاہا، پناہ لے لی
جب چاہا، سرنگ کو چھپا دیا
اور جب چاہا کہ زمین والے تمھارے نقشِ قدم نہ دیکھیں
تم نے میرے اندر چلتے رہنے کو زندگی سمجھا

تمھیں ہمیشہ میرا وجود خواب کی طرح معلوم ہوا
جب چاہا پانی دیکھ لیا
جب چاہا ریت
جب چاہا تعبیر ڈھونڈ لی
جب چاہا بدہضمی کا ذائقہ سمجھ کر فراموش کر دیا

تمھاری خواب میں باتیں
مجھے جاگ کر سننی پڑتی ہیں
میرے جاگنے کی باتیں
کوئی خواب بھی نہیں سنتا

دوسری فصل

مصیبتوں کے پتے خزاں میں بھی نہیں جھڑتے ہیں

کوئی تو تریاق گفتگو

مری آرزو کو بنا کے قندیلِ جاں
سپردِ ہوا کیا
مری گفتگو کو سمندروں کا غرور پہنا کے
شامِ دشتِ فنا کیا
مرے آنسوؤں کو شکیبِ تائیدِ خواب کر کے
سرابِ دشتِ بلا کیا
مجھے میرا چہرہ بھلا کے
قوسِ حدودِ احوال میں
زماں آشنا فصیلوں پہ
نارسائی کو
چاشِ وصل وا دا کیا۔
مرے زرد زرد سے خواب تھے

مرے برف برف گمان تھے
انھیں اعتبار کی انگلیوں کے نشاں دیے۔
مرے طاقچوں پہ عبارتوں کا نصاب ایسا لکھا
کہ شاخِ حواس!
اثبات کی بشارت کو گُل نصیبی سمجھ رہی تھی۔
مرے گیلے بال سکھا کے تُو نے
صبا کو پیغام کیسا بھیجا
کہ خوابِ طائر
حواس شاخوں سے اُڑ گئے تھے
پناہ کے سارے راستے
سیلِ ابتلا سے اُجڑ گئے تھے

(۲)

مرے ہُنر نے مجھے بتایا تھا
آگ پہ رقص کرنا ہوگا
تراشِ وحشت کی سنگ باری کو سہنا ہوگا
ملامتوں سے گزرنا ہوگا
وفا کی دیوار، روزنوں سے سجانی ہوگی
یقیں کو مختار تی محبت سکھانی ہوگی

(۳)

یہ شامِ مہتاب کیسی آئی
کہ ساری شمعیں بجھا رہی ہے
کہ میرے اظہار اور رسائی کے سارے رستوں کو
آستیں میں چھپا رہی ہے
وہ جسمِ خواہش جو زردگی کا کفن نہ پہنے
اُسے خزاں رنگ زہر پینا سکھا رہی ہے

(۴)

اندھیرے گھیرے اُفق سے پھوٹے
یہ مَیں نے دیکھا
تَپش محبت، فشارِ آزردگی بنی ہوئی تھی
یہ مَیں نے دیکھا
زباں جسے مَیں نے شہد دیکھا تھا
تلخیِ عزلتِ تعلّق بنی ہوئی تھی
نگاہ جو قاصدِ حلاوت تھی
زخمِ زنجیرِ شب بنی تھی
ادا جو طنازِ جستجو تھی

کلاہِ بے آبرو ہوئی تھی

(۵)

زمانہ کروٹ میں سائے رکھتا ہے
اور بگولوں کو وحشتوں کا فراز دیتا ہے
اور کتبوں کو سرفرازِ مزار کرتا ہے۔
اسی زمانے نے
میری چوکھٹ پہ پڑنے والے قدم کے سائے کو
اسودِ بے یقیں کیا ہے۔
مری گلیمِ وفا نصیبی کو
کُند مقراضِ نامرادی نے
دھجی دھجی نقابِ تیرہ جبیں کیا ہے۔
جو سو گئے روتے روتے
ان کی طرح سے منتظرِ صبر
میرے وجود میں آنکھ ڈھونڈتی ہے۔
زوالِ اقلیمِ آبرو کے
شتاب لمحوں سے پوچھتی ہے
کوئی تو تریاق گفتگو کا
کوئی تو تکمہ ملے رفو کا

کوئی تو لہجہ تسلیوں کا
کوئی تو رتبہ ہزیمتوں کا
کوئی تو کاٹے یہ فصل آ کے
کوئی تو دیکھے کہ گھر سے نکلے
تو دھوپ پوشاک بھی نہ پہنی
کوئی تو دیکھے کہ گھر سے نکلے
تو وحشتِ گمرہی میں سانسیں اکھڑ رہی تھیں

(۶)

بتا کہ فریاد کس کے آگے
کہاں منصف ترازو کرنے کو کون آتے
کسے خبر موجِ خوں گزرنی تھی
یوں گزر کے گئی کہ اب تو
دعا کی دہلیز بھی خجل ہے
ہوا بھی پتھر سنبھال کے راستے میں ٹھہرے
تو وحشتیں، خد و خال پہنے ہوئے تمھارے
دلوں کے کہرام کو تماشہ سمجھ کے دیکھیں
کوئی تو تریاق گفتگو کا
کوئی تو تکمہ ملے رفو کا!

ہم گنہگار عورتیں

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
جو اہلِ جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں
نہ ہاتھ جوڑیں۔

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ جن کے جسموں کی فصل بیچیں جو لوگ
وہ سرفراز ٹھہریں
نیابتِ امتیاز ٹھہریں
وہ داورِ اہلِ ساز ٹھہریں۔

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ سچ کا پرچم اٹھا کے نکلیں
تو جھوٹ سے شاہراہیں اٹی ملے ہیں،
ہر ایک دہلیز پہ سزاؤں کی داستانیں رکھی ملے ہیں،
جو بول سکتی تھیں، وہ زبانیں کٹی ملے ہیں۔

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ اب تعاقب میں رات بھی آئے
تو یہ آنکھیں نہیں بجھیں گی۔
کہ اب جو دیوار گر چکی ہے
اسے اٹھانے کی ضد نہ کرنا!

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
جو اہلِ جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں۔ نہ ہاتھ جوڑیں!

ہلتے ہونٹوں کا رزمیہ

کنول خیالوں نے آنکھ کھولی
تو کچی پگڈنڈیوں سے خوابیدہ راستوں پہ
دراز قامت جواں درختوں کے سانس بن کر ہوا کھڑی تھی۔
وہ وحشتوں کو محبتوں میں بدلتی رُت تھی
سبھی کا جی چاہتا تھا آنکھیں پلک نہ جھپکیں
سبھی کا جی چاہتا تھا رقصِ سحاب دیکھیں
سبھی کا جی چاہتا تھا لطفِ خطاب پہنیں۔

وہ منظرِ جاں
کہ جس میں وحشت، محبتوں میں بدل رہی تھی
وہ جشنِ خواہش کا مدعا تھا
وہ سادہ قرطاس پہ معانی کا سلسلہ تھا۔
مجھے بھی سادہ ورق کے ساحل پہ

لفظ کشتی میں بیٹھ کے
وہ مراد ریزے سمیٹنے ہیں
کہ جس میں صحرا
وفا کی تاریخ میں عمل کی چراغ آنکھوں کو
ریت آلودہ کر نہ پائے۔
یہ لفظ کشتی
وہ حرف املا لکھے
کہ خاموشیاں تکلم نشراد نکلیں۔
یہ لفظ کشتی
وہ مضطرب بادبان کھولے
کہ خواب لہروں پہ گھر بسانے کی خواہشیں
وہ جزیرہ دیکھیں
کہ جس میں دہشت محبتوں میں بدل رہی ہو۔

میں نے مانا

آنکھیں کیا دیکھیں
اس کا بتانا کونسا ایسا ضروری تھا
تم نے پتھر کی شہ رگ پہ ہاتھ رکھا
اور میں نے مانا
آنکھیں کیا دیکھیں۔

چہرے کیا سوچیں
اس کا سمجھنا کونسا ایسا مشکل تھا
تم نے چاند کی دوسری سمت کا زخم کریدا
اور میں نے مانا
چہرے کیا سوچیں۔

دروازے کیا کھولیں
اُجڑے شہر کا یہ ہی تو ایک قرینہ تھا
تم نے پٹارہ کھول کے سہمی چڑیوں کو آزاد کیا
اور میں نے مانا
دروازے کیا کھولیں

اندازے کیا نکلیں
سچ اور جھوٹ کی انگنائی میں یہ بھی ایک تماشا تھا
تم نے شمع کی روشنی میں تتلی کے رنگوں کو دیکھا
اور میں نے مانا
اندازے کیا نکلیں۔

THE SCREAM OF AN ILLIGITIMATE VOICE

ہوا نے پانی پہ جو بھی لکھا
وہ معتبر تھا
کہ وقت ایسا تھا
رات بھی دن کی روشنی سے حسین تر تھی
کہ وقت ایسا تھا
مسکراہٹ، اُداس ہونٹوں سے جھانکتی تھی

ہوا نے بانہوں میں جو بھی پہنا
وہ معتبر تھا
کہ وقت ایسا تھا
آنکھ کی پُتلیاں کسی بُلبلے کی صورت نہیں پھٹی تھیں
کہ وقت ایسا تھا
آبلوں میں بھی راحتوں کے سندیسے تصویر بن رہے تھے۔

ہوا نے قریوں میں جس کو بھیجا
وہ معتبر تھا
کہ وقت ایسا تھا
حروف، و[illegible]گی کا پیکر نہیں بنے تھے
کہ وقت ایسا تھا
ہاتھوں کو گمانِ منزل کا آسرا تھا۔

ہوا نے پھر سرکشی کا ایسا لبادہ پہنا
کہ ساری بیلیں، ہر اک نشیمن
ہر اک چراغِ رہِ تمنا
پناہ مانگے تھا، راہ ڈھونڈے تھا
اور ہر اک موڑ پہ یہ پوچھے تھا
کیا کوئی خواب، حرفِ تعویذ بھی بنے گا
ہوا کا وہ اعتبارِ رفتہ، مزاج دلپذیر بھی بنے گا
یہ کالے لفظوں کی سوئی تحریریں
ساحلوں پہ رُکے جہازوں کی صبح دستک نہیں
تو احساس کی امانت

مَیں محبت کا رزق ٹھہرے۔
ٹھہر کہ بارش ابھی تھمی ہے
ٹھہر کہ پھر وہ ہوا چلے گی
ٹھہر کہ شرطِ مدافعت کی کماں کڑی ہے۔

تیسری فصل

سامانِ سفر خواب سے ظاہر تو نہیں تھا

○

ہوا کچھ اپنے سوال تحریر دیکھتی ہے
کہ بادلوں کو بھی مثلِ زنجیر دیکھتی ہے

مجھے بلاتا ہے پھر وہی شہرِ نامرادی
کہ آرزو، آبلوں میں تصویر دیکھتی ہے

جو کشتیوں میں نہ بیٹھ پاتے، وہ گھر نہ پہنچے
سفر کی تائید، شامِ تقصیر دیکھتی ہے

بہت دنوں میں ستم کے دریا کا زور ٹوٹا
سرشتِ شب بھی برہنہ تعزیر دیکھتی ہے

سمندروں کا عروج پھر ریت بن گیا ہے
شہابِ ثاقب میں رات تفسیر دیکھتی ہے

ہوا چلی تھی پہ شہرِ جاں کے تھے در مقفل
یہ آنکھ اپنے ہی خواب تاخیر دیکھتی ہے

سبو پیے تشنگی کھڑی تھی، یہ جانتی تھی
کہ جاں فروشوں کو قوسِ شمشیر دیکھتی ہے

نیابتِ شہر اُن کے ہاتھوں میں اب ہو گی
کمانداروں کو شب کی زنجیر دیکھتی ہے

○

کچھ دن تو ملال اس کا حق تھا
بچھڑا تو خیال اس کا حق تھا

وہ رات بھی دن سی تازہ رکھتا
شبنم کا جمال اس کا حق تھا

وہ طرزِ بیاں میں چاندنی تھا
تاروں سے وصال اس کا حق تھا

تھا اس کا خرام، موجِ دریا
لہروں کا جلال، اس کا حق تھا

بارش کا بدن تھا اس کا ہنسنا
غنچے کا خصال، اس کا حق تھا

رکھتا تھا سنبھال شیشۂ جاں
تجسیم کمال، اس کا حق تھا

بادل کے مثال اس کی خو تھی
تعبیرِ ہلال، اس کا حق تھا

اُجلا تھا چنبیلیوں کے جیسا
یوسف سا جمال اس کا حق تھا

○

وہ میرا شریکِ غم ہوا تھا
یہ زعم مجھے اتم ہوا تھا

نکلے تھے کہ اُس کو دیکھ پائیں
آنکھوں میں دُھواں رقم ہوا تھا

سوچا تھا کہ بات بھی کریں گے
غنچے کا دہن قلم ہوا تھا

بیٹھے تھے تھکن پہن کے گھر میں
رستے میں یہ ذکر، کم ہوا تھا

ٹھہرے تھے کہ اُس کی چھاؤں پہنیں
وہ دشتِ سکوتِ یم ہوا تھا

کپڑوں پہ مہکتی سلوٹوں کو
پہنا تو حساب کم ہوا تھا

سوچا تھا اُسے کہ سوچنے کو
منظر بھی مثالِ نم ہوا تھا

کھُلتا تھا دریچہ جس گلی میں
واں شورِ خزاں قدم ہوا تھا

دیکھا تھا تجھے بھی دیر اُس نے
شائستۂ غم بھی کم ہوا تھا

تسبیح ملال تھی وظیفہ
آنکھوں کے قریب نم ہُوا تھا

خواہش کو یہ آسماں بھی کم تھا
کیا حشر خرام، دم ہُوا تھا

اے آگ! تجھے ہم تو خس برابر
جو کچھ بھی ہُوا، سو کم ہُوا تھا

○

دل کو بھی غم کا سلیقہ نہ تھا پہلے پہلے
اُس کو بھی بھولنا اچھا لگا پہلے پہلے

دل تھا شب زاد اُسے کس کی رفاقت ملتی
خواب تعبیر سے چھپتا رہا پہلے پہلے

پہلے پہلے وہی انداز تھا دریا جیسا
پاس آ آ کے پلٹتا رہا پہلے پہلے

آنکھ آئینوں کی حیرت نہیں جاتی اب تک
ہجر کا گھاؤ بھی اُس نے دیا پہلے پہلے

کھیل کرنے کو بہت تھے، دلِ خواہش دیدہ
کیوں ہوا دیکھ جلایا دیا پہلے پہلے

عمرِ آئندہ کے خوابوں نے پیاسا رکھا
فاصلہ پاؤں پکڑتا رہا پہلے پہلے

ناخنِ بے خبری زخم بناتا ہی رہا
کوئے وحشت میں تو رستہ نہ تھا پہلے پہلے

اب تو اُس شخص کا پیکر بھی گُلِ خواب نہیں
جو کبھی مجھ میں تھا، مجھ جیسا تھا پہلے پہلے

اب وہ پیاسا ہے تو ہر بوند بھی پوچھے نسبت
وہ جو دریاؤں پہ ہنستا رہا، پہلے پہلے

وہ ملاقات کا موسم نہیں آیا اب کے
جو سرِ خواب سنورتا رہا پہلے پہلے

غم کا دریا مری آنکھوں میں سمٹ کر پوچھے
کون رو رو کے بچھڑتا رہا پہلے پہلے

اب جو آنکھیں ہوئیں صحرا تو کھلا ہر منظر
دِل بھی وحشت کو ترستا رہا پہلے پہلے

مَیں تھی دیوار تو اب کس کا ہے سایہ تجھ پر
ایسا صحرہ زدہ چہرہ نہ تھا، پہلے پہلے

○

سلگتی ریت پہ آنکھیں بھی زیرِ پا رکھنا
نہیں ہے سہل، ہوا سے مقابلہ رکھنا

اُسے یہ زعم کہ آغوشِ گُل بھی اُس کی ہے
جو چاہتا ہے پرندوں کو بے نوا رکھنا

شک نہ ہو یہ نگہداریِ جنوں ہم سے
یہ دیکھنے کو اُسے سامنے بٹھا رکھنا

بکھر نہ جانا جراحت نوازیِ شب پر
مشامِ جاں کو ابھی خواب آشنا رکھنا

وہ فرصتیں کہ جنھیں آہٹوں کی خواہش ہو
انھیں جرس کی تمنّا سے ماسوا رکھنا

تمام منظرِ جاں اُس کی خواہشوں سے بنا
وہ خواب ہے تو اُسے خواب میں سجا رکھنا

اُداسیوں کو تو آنگن ہی چاہئیں خالی
چھتوں پہ چاندنی راتوں کا سلسلہ رکھنا

وہ جب بھی آیا بہت تیز بارشوں جیسا
وہ جس نے چاہا مجھے سرمئی گھٹا رکھنا

بس اِک چراغ، مسافت کا بوجھ سہے گا
سُخن کے بیچ، طلب گاریِ وفا رکھنا

○

اِس شہر میں دریا کو بھی رستہ نہیں ملتا
وہ قحطِ تعلق ہے کہ سایہ نہیں ملتا

اب کے تو ترے غم بھی بہت تازہ ادا ہیں
رونے کا بھی آنکھوں کو سلیقہ نہیں ملتا

دشمن کی طرح تو مرے دل میں ہے نقب زن
پہچان کے آنگن کو حوالہ نہیں ملتا

بستا ہے اسی شہر میں کیا ہے گواہی
اے افگنِ خواہش! ترا کوچہ نہیں ملتا

خواہش کو کسی رُت کا بدن راس نہ آیا
وحشت کو تماشائے مداوا نہیں ملتا

اے نیزۂ ہجراں یہ ستم میرے لیے تھا
ویرانی میں صحرا کو بھی مجھ سا نہیں ملتا

ممکن ہے کہ یہ دربدری، فردِ ہوا ہو
امروز کو میثاقِ گزشتہ نہیں ملتا

میں اپنے ہی خورشید بجھا کر کہاں نکلوں
بے ماجرا ہونٹوں کو تو نوحہ نہیں ملتا

میں ہی تھی کہ تیری ہدف ہمسفری تھی
مجھ کو ہی نشانِ خمِ دریا نہیں ملتا

○

خوشی یہ تھی کہ ترا خواب دیکھنے کو ملا
یہ وہم بھی کہ اُداسی سمیٹنے کو ملا

مثالِ آبِ رواں، تیرا وصل، تیرا وصال
کنارِ جاں میں مجھی کو بکھیرنے کو ملا

مجالِ آئینہ، حیرت زدہ سفر میں تھی
وہ منتظر مری آنکھوں میں بیٹھنے کو ملا

بُجھا کے شمعیں ترا انتظار کرتی رہوں
اُسے یہ تحفۂ احوال بھیجنے کو. ملا

اُداسیوں کی فصیلوں پہ خیمہ زن تھی حیات
نوا سے بے اثری، ہجر ٹھہرنے کو ملا

چراغ بن کے اُسے زندگی سکھاتی تھی
یہی لباس ہمیں پھر اُدھیڑنے کو ملا

خبر رکھو کہ اُداسی نہ اُس کے گھر جاتے
ہجومِ ہم سفری غم سمیٹنے کو ملا

قیاس تھا کہ ہوا رُخ بدل گئی ہو گی
نکل کے آتے تو خمیازہ دیکھنے کو ملا

شجر کٹے ہیں تو آنگن میں دھوپ آئے گی
یہ اک خیال بھی حسرت سمیٹنے کو ملا

○

متقابرِ خواب دان عجب انتظار میں ہیں
کہ اس کی بیگانگی کے قصے شمار میں ہیں

حساب کرتے ہُوئے مرے خواب پوچھتے ہیں
وہ مرحلے آرزو کے کس اعتبار میں ہیں

محیط رکھتا ہے میرے اشکوں کو میرا دامن
یہ وہ خزینے ہیں جو مرے اختیار میں ہیں

وہ خلعتِ اجتناب میں بھی قریب ہی تھا
یہ میری آنکھوں کے قوس بشہرِ مزار میں ہیں

مجھے درِ علم کی فضیلت بتا نہ پائی
کہ جینے والے بھی موت ہی کے مدار میں ہیں

جزیرہ باتوں کا خوب بستا تھا، لوگ خوش تھے
زمیں ہلی تو خبر ہُوئی کس شمار میں ہیں

قیامتیں مجھ کو ڈھونڈتی میرے گھر پہنچیں
یہ دیکھنے کہ سراب کس انتشار میں ہیں -

خوشا کہ زخموں کے خشک پیڑوں نے رنگ پہنا
خوشا کہ ماتم گسار لمحے قطار میں ہیں

ابھی تو اسے اخترِ ہزیمت چمک اُفق پر
ابھی تو ماتم گساریاں، اختیار میں ہیں

ابھی نہ کر رُخ پریشاں جانی، عدم روی کا
ابھی بہت ڈوبتے سفینے کنار میں ہیں

○

مجھے بھلا کے مجھے یاد بھی رکھا تُو نے
یہ کیسا دعوئ دشوار بھی کیا تُو نے

ہوا نے اپنے لیے نام کچھ رکھے ہوں گے
تھکن سے پوچھ لیا گھر کا راستہ تُو نے

حذر کہ اب مرے ہاتھوں میں مدعا بھی نہیں
کیا ہے لیلیٔ خواہش کو بے ادا تُو نے

یہ کون تیری طرح میری آنکھ میں چمکا
جلائی کیسی یہ قندیلِ بد دُعا تُو نے

نگاہِ شب ترے آنگن میں خواب ڈھونڈتی تھی
یہ اب کے زخم بھی کیسا دیا، نیا تُو نے

تجھے مرے لیے نیندوں کے پھول لانے تھے
یہ کیسا آنکھوں کو بخشا ہے رتجگا تُو نے

لباس بدلی ہُوئی رونقوں کے اچھے تھے
مگر یہ دل کہ رکھا حوصلہ قبا تُو نے

قدم اکھڑ سے گئے تھے سجاتے ہم سفری
ہوا کو اوڑھ کے دیکھا تھا بارہا تُو نے

رہی گریز کی تہ دامنی سے برگشتہ
مجھے دیا تھا وہ سودائے حوصلہ تُو نے

○

کبھی وہ آنکھ کبھی فیصلہ بدلتا ہے
فقیہہِ شہر، سفینہ بدست چلتا ہے

وہ میری آنکھیں جنھیں تم نے طاق پر رکھا
انھیں میں منزلِ جاں کا سراغ ملتا ہے

اب اگلے موڑ کی وحشت سے دل نہیں ہارو
زوالِ شام سے منظر نیا نکلتا ہے

مجھے سوال کی دہلیز پار کرنی تھی
یہ دیکھنے کہ ارادہ کہاں بدلتا ہے

شکستِ ساعتِ جاں، ورنہ زمین تو نہیں
بھنور کا پاؤں سوادِ سفر نکلتا ہے

ہزیمتوں کی صلیبوں کو شب چراغ کرو
کہ آندھیوں کا سفینہ یونہی سنبھلتا ہے

گلی گلی میں خموشی کواڑ پیٹے ہے
یہ کون ہے جو نئی کونپلیں مسلتا ہے

بس اب تو آنکھ بھی، آئینہ بھی، سبھی حیراں
کہ اس کا عکس دُھواں سا گھروں میں ملتا ہے

مری زباں پہ کوئی ذائقہ ٹھہر نہ سکا
کہ مجھ میں اور کوئی پیرہن بدلتا ہے

○

وداع کرتا ہے دل سطوتِ رگِ جاں کو
خبر کرو مرے خوابوں کے شبِ سلیماں کو

محیطِ جاں، نہ کوئی ذائقہ نہ سبزۂ شب
تلاش کرتی ہے خوشبو کسی گریباں کو

مجھے یہ فصلِ خزاں خواب کاٹ لینے دو
کہ پھر نہ نکلے کوئی دوسرا بیاباں کو

لہو کو آنکھ میں رہنے کا زعم تھا ورنہ
ٹپک بھی سکتا تھا بہلا کے دل کے طوفاں کو

مجھے تو غم بھی پناہ زاد ہی لگے اَب تو
کہ اُسے کھلتی ہے حسرت بھی سیرِ مژگاں کو

کسی عدو کی مروّت سے اب بھی تازہ ہیں
وہ زخمِ خواب کہ جو ڈھونڈتے ہیں پیکاں کو

حساب اُس کی محبّت کا حرف حرف کروں
جو آگیا تھا مری تشنگی کے ساماں کو

○

لگتا ہے اب تو شہر میں رہتا نہیں کوئی
زندانِ ستم میں یہ کہتا نہیں کوئی

رکھتے ہیں ریزہ ریزہ ملامت سمیٹ کر
غارت گری کا درد بھی سہتا نہیں کوئی

سوکھا سا پڑ گیا ہے زمیں، آسماں میں
دریا روانیوں میں تو بہتا نہیں کوئی

زنجیر، دل کے بیچ بھی ہلتی نہیں کوئی
دیوانہ سرکشیدہ بھی رہتا نہیں کوئی

اب تو بدن کے جلنے کی بو شہر بھر میں ہے
کہنا بھی ناروا ہے، سو کہتا نہیں کوئی

○

مآل یہ تھا کہ ساحل کنارا کر لیتے
جو کر لیا تھا وہی پھر دوبارہ کر لیتے

بلندیوں سے زمیں دیکھنے کی حسرت میں
حسابِ شہرِ تمنا گوارا کر لیتے

ہجومِ خواہشِ شب رزق مانگتا تو سہی
ہم اپنی آنکھ میں رہ کر گزارہ کر لیتے

خبر جو ہوتی کہ یہ شہرِ دل بھی صحرا ہے
نصیبِ شبِ تمنا دامن ستارا کر لیتے

وفا شناس ہوا کی اگر خبر ملتی
اطاقِ خواب سے حاصل اشارہ کر لیتے

ہمیں بہت تھا ترے نام ہی کا پہناوا
گلیمِ شوق کو تختِ نظارا کر لیتے

○

تلاشِ دریا کی تھی، بہ ظاہر سراب دیکھا
وہ کون آنکھیں تھیں جن کی خاطر یہ خواب دیکھا

جو رُت بھی آتے ہمیں سے گریہ کا رزق پاگئے
ہماری صورت کسے زمیں انتخاب دیکھا

ندامتیں بہتے آنسوؤں سے شرح نہ پائیں
سفینہ اپنی دُعا کا منتقل رکاب دیکھا

برستی آنکھوں سے سوکھے تالاب بھر نہ پائیں
یہ غم کا دریا، مثالِ قرضِ سحاب دیکھا

کبھی تو آنکھوں میں ان کی آبادیاں کھلیں گی
وہ بستیاں عمر بھر جنھیں زیرِ آب دیکھا

ابھی تو بخیہ گری کو سوزن ہی کام آوے
حنا کی دہلیز پہ طلوعِ حجاب دیکھا

یقیں کہ تشنہ لبی مقدر، رقم رہے گی
وفورِ دریا بھی مثلِ دریائے خواب دیکھا

جتا گیا ساری عادتیں بس گلے سے لگ کے
اُس ایک انجم کو چاندنی کے حساب دیکھا

خیال اُس کے بدن کی گلیوں کو ڈھونڈتا ہے
وہ جس کو دیکھا تو حیرتوں کو نقاب دیکھا

اے رہِ ہجرِ نو فروز، دیکھ، کہ ہم ٹھہر گئے
یہ بھی نہیں کہ زندہ ہیں، یہ بھی نہیں کہ مر گئے

خواب تلک رہائی تھی تیرے فراق و ہجر سے
آنکھ کھلی تو آئینے تہہ میں کہیں اُتر گئے

تو بھی مری طرح رہا، دھیان اُٹھاتے شہر کا
لوٹے تو چھاؤں سو گئی، قافلے کوچ کر گئے

تجھ کو بہت قریب سے دیکھ کے یوں لگا کہ اب
خیمۂ جاں اُکھڑ گیا، دشتِ طلب گزر گئے

دل کی گواہی کے لیے رسمِ دعا بڑی نہ تھی
رنج خمارِ بے ثمر ڈھونڈتے اُس کے گھر گئے
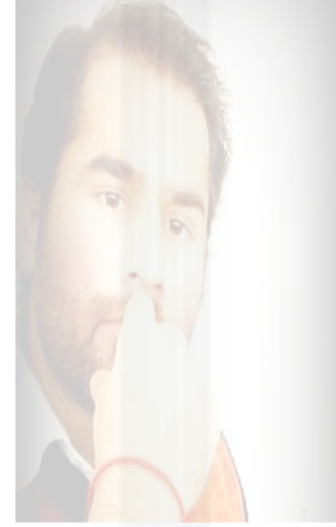
ہم ہی تھے وہ بلاکشاں، دار و رسن تھے جن کی جاں
ہم ہی تھے شب کے ہم سفر، ہم ہی نہ اپنے گھر گئے

دل کو ترے فراق کی آرزو یاد رہ گئی
دن وہ محبتوں کے بھی مثلِ رہِ سفر گئے

میرے لیے بھی خواب تھے اُس نے رکھے ہوئے کہیں
شہر میں اُن کو ڈھونڈنے قاصدِ بے ہنر گئے

○

بے اماں درختوں سے چھاؤں مانگنا کیسا
شب فروز لمحوں میں صُبحیں کاتنا کیسا

فاصلہ تھا خواہش میں اور اُس سے ملنے میں
کوچ کرتے طائر کا راز جاننا کیسا

اب کے بھی سفر کا رُخ، بادِ غم کی جانب ہے
ان بجھے چراغوں میں تیل ڈالنا کیسا

یُوں تو دل کی ویرانی اپنے دیس جیسی ہے
پھر بھی ان گلابوں کی شاخ کاٹنا کیسا

ہم سفر سحر جیسا، کیا سحر بھی لائے گا
لکڑیوں کے جالے سے در تراشنا کیسا

اب تو ہیں مُلاقاتیں سردیوں کے پُھولوں سی
بے مہک ارادوں سے گھر سنوارنا کیسا

فاصلہ محبت کا ایک جست سے طے تھا
حوصلوں کے صحرا میں گُل پکارنا کیسا

ناخنِ تمنا کو راس زخمِ فرقت تھا
اے جنوں تراشیدہ، پَر تراشنا کیسا

○

سفر کے بعد مرے ہاتھ میں دُعا بھی نہ تھی
ستم تو یہ تھا، تمنّا گریز پا بھی نہ تھی

قیامتیں کسی اِک روز پہ نہ تھیں موقوف
ہر ایک روز مگر خواہشِ خطا بھی نہ تھی

بہاؤ نے تو تراشا بہت تمنّا کو
مرادِ جاں، کسی ساحل سے آشنا بھی نہ تھی

ہوا کے ہاتھ نے دیوار کی طرح روکا
اس ایک آنکھ کو جو شوق میں خدا بھی نہ تھی

نہیں کھُلی کوئی رنگت کسی بھی چہرے کی
محبتوں کی یہ وحشت ملال سا بھی نہ تھی

بدل کے رکھ دیا خواہش نے آسمان کا رنگ
یہ تشنگی کسی صورت طلب نما بھی نہ تھی

بہت دِنوں میں سہی، دشت کو یقیں ٹھہرے تھے
یہ وہ سفر تھا کہ صورت سفر نما بھی نہ تھی

○

وہ خال و خد، جن کی آرزو شہرِ خواب لکھے
انہی کی چھاؤں، ملالِ شب کے نصاب لکھے

مجھے نئے خواب چھانٹنے کی بھی فرصتیں تھیں
مگر یہ آنکھیں کہ جن کے حصے سحاب لکھے

مجھے بہت دُور ساتھ لے کے ہوا گئی تھی
اسی رفاقت کو موجِ دریا، حباب لکھے

بہت محبت کو شوق تھا گل نصیبیوں کا
جدائیوں نے ببول، زیرِ نقاب لکھے

دلوں کو خواب ہمسری، راس آ گیا تھا
مگر مسیحائے جاں، نہ آنکھیں نہ خواب لکھے

دلوں نے دریا سے جا نکلی، پار کر کے دیکھا
محبتوں نے عداوتوں کے نصاب لکھے

یہ آنکھ بھی دُزدِ آرزو کی تلاش میں ہے
یہ دل بھی اندوہِ شب چشیدہ کے باب لکھے

خرامِ جاں، اُس کے آنگنوں میں کیا ہی کب ہے
فراق کے سارے باب ہم نے شتاب لکھے

یہ کشتیاں بادبان ہاتھوں نے غرق کی ہیں
شگافِ پندار، قامتِ انتساب لکھے

○

نہ فصلِ جاں پہ، نہ احساسِ جاں پہ زندہ ہیں
یہ لوگ ڈوبتے شہرِ اذاں پہ زندہ ہیں

نظامِ کوچۂ قاتل ہی ہار جائے گا
کہ اہلِ شوق، فصیلِ گماں پہ زندہ ہیں

یہ تیغِ شب ترے زندانیوں کو خوش آئے
کہ اہلِ شوق فصیلِ گماں پہ زندہ ہیں

بدن بدلنے چلا ہے خمارِ شب اب کے
مسافتیں گلِ خواہشِ بیاں پہ زندہ ہیں

وہ زخم جن پہ لہو زعمِ تازگی دیکھے
وہ آئینے ہیں جو آبِ رواں پہ زندہ ہیں

نہ آنسوؤں میں رکھی آنکھ ڈھونڈتی لپٹیں
جو لوگ اپنے لہو کے نشاں پہ زندہ ہیں

سفر سے پہلے سفر کی تھکن سے عاجز ہیں
وہ تیر جو ابھی خوابِ کماں میں زندہ ہیں

○

ہم نے بہت دن اے دلِ تیرے خواب سنبھالے
کون کہاں تک بیتی شب مہتاب سنبھالے

آہستہ آہستہ بوندیں تھم جاتی ہیں
کون رُکا دوراہے پہ اسباب سنبھالے

میرے گھر میں میری شکل نہ دیکھنا آ کے
پنچھی جیسے پروں میں ہو سیماب سنبھالے

اب تو زمیں کی ہر پہنائی حبابوں جیسی
اب تو بھنور بھی لگتے ہیں محراب سنبھالے

ضامن کون بنے گا بجھتے انگاروں کا
گردِ تمنا ہے پھولوں کے خواب سنبھالے

بینائی کو کھُرچ دیا تھا پھر بھی ظاہر
صندلِ خواہش، قوسِ وفا آداب سنبھالے

حرفِ بشارت میرے شہر میں اُترا کب ہے
دِل کے صحیفے میں بے نقط کتاب سنبھالے

○

یہ حوصلہ تجھے مہتابِ جاں ہُوا کیسے
کہ خود کو سامنے سے منہا کیا، بتا کیسے

نظر تو کیا کہ یہ مینائے دل بھی خالی ہے
لگے گا شہر میں بازارِ خوں بہا کیسے

مجھے خبر ہے کہ موسم نہیں یہ خواہش کا
مرے لبوں پہ یہ ٹھہرا ہے ذائقہ کیسے

خُدائی نوحہ کناں تھی کہ آج منبر پہ
یہ تجھ کو آیا نظر کیا، مرے سوا کیسے

تعلقات کے تعویذ بھی گلے میں نہیں
ملال دیکھنے آیا ہے راستہ کیسے

قفس بھی میری پناہوں کو دیکھ حیراں تھا
کہ میرے دل میں تھا مقتل کا زائچہ کیسے

ہَوا سے جیسے چراغوں کی لو بھڑکتی ہے
بہت دنوں میں تجھے دیکھ کے ہنسا کیسے

○

پھر بے سمت سفر کی رُت ہے، پھر وہی خندق خواہش ہے
اب کی بار نہ سنبھلے گا دل، اب کے جنوں کی بارش ہے

جن لمحوں کی عمر بلی ہے اس میں خواب کی فرصت کب
اُس کو آنکھیں کھول کے دیکھو جس کے لیے یہ کاوش ہے

آنکھوں سے دریا بہہ جائے گا، پھر بھی سخن کرنے تم سے
خوبیِ تن کو اوڑھ کے بیٹھی، خون اگلتی آتش ہے

رمز ترا، غم سکھلاتا ہے، وصل ترا، شب لاتا ہے
اے قدِ خواہش، آمدِ گُل بھی، تیرا شوقِ نمائش ہے

اُس سے ملتے، غم دہراتے، قسمتِ جاں کرتے گزری
شہرِ جنوں میں دربدری بھی خلعتِ اسمِ ستائش ہے

○

یہ بھی کیا شہر کو حیران کیے ہی رکھنا
جب بھی ہنسنا اُسے پہچان کیے ہی رکھنا

دیکھنا اُس کو کسی شخص کے پیکر میں سدا
ذائقہ اُس کا مگر دھیان کیے ہی رکھنا

پیڑ کی چھاؤں میں وزدیدہ سی چڑیوں کی طرح
درد کو حوصلہ سامان کیے ہی رکھنا

باندھنا اُس سے توقع کہ جسے ہو معلوم
یاد کو پرچمِ اعلان کیے ہی رکھنا

اُن کو ملتی ہے سرافرازی کہ جو جانتے ہیں
بولتے شہروں کو سنسان کیے ہی رکھنا

کس سے سیکھا ہے رہِ دشتِ تمنا کی طرح
دل کو یوں بے سروسامان کیے ہی رکھنا

○

طلسمِ شب ترے پہلو میں باریاب ہوا
شگفتِ گُل ترا موسم بھی انتخاب ہوا

عقیدتوں کے تصرّف سے گرہِ چشم کُھلی
یہ دل بھی درسِ محبت میں کم نصاب ہوا

رُتیں مہک کے، عَلم کھول کے نکل آئیں
یہ آئینہ تری صُورت سے مستجاب ہوا

معاملات بہت تھے مگر یہ صُورت تھی
کہ آئینہ بھی اُسے دیکھ کے حباب ہوا

وہ میرے قتل کے سرخاب کو کرے گا کیا
کہ میرا نام محبت میں انتخاب ہوا

ہوا بھی وحشتِ دل کو چھپاتے پھرتی ہے
بعید، حدِ تحیّر سے اب خطاب ہوا

وہ خواب میں بھی تو مضرابِ جاں کو چھیڑتا ہے
کہ اُس سے ملنا تو اب لوحِ بے حساب ہوا

وہ طاقِ جاں میں نمایاں چراغِ شب جیسا
کہ اس کا سایۂ دیوار اسمِ خواب ہوا

○

اشک پونچھو! چلو اب گھر اپنے
غم بہت ہیں ابھی اندر اپنے

ذائقہ ٹھہری ہُوئی شاموں کا
ساتھ لاتا ہے مقدر اپنے

تشنگی اپنی تمنائی ہُوئی
کون رکھتا بھی اُسے گھر اپنے

ہر ستم تارِ رگِ جاں نکلا
آسماں اب نہیں باہر اپنے

ایک مدت سے یہی سودا تھا
خواب پہنیں گے مقدر اپنے

راستہ اُس نے ہی روکا لیکن
آج بدلے ہُوئے تیور اپنے

شوق تھا خامۂ اُمیدِ خجل
خواب تھے خاک برابر اپنے

○

چشمِ افلاک کو دریا بھی رقیبانہ لگا
ٹوٹتے عکس کی موجوں کا صنم خانہ لگا

نیم آغوشی میں سرشاریِ جاناناں کہاں
یہ تو بچوں کا کھلونوں سے بہل جانا لگا

بات ، تائیدِ تحیّر سے رقم تو ہو گی
کاہشِ شوق [illegible] طرزِ شگوفانہ لگا

اس سے مل لینے کے امکان کا سودا سب کو
قسمتِ ناز ، کبھی محفلِ مژگانہ لگا

یہ بھی اچھا ہے گھٹاؤں کی طرح گھر آنا
بارشِ خواب تجھے شہر کیوں اسخبانہ لگا

شب نژادوں کو سحر سازی تو آتی ہی نہیں
تازیانہ کمرِ زیست پہ وترانہ لگا

خیالی شخص سے مُقابلہ

آنگ سان سو کی کے نام
نوبل امن انعام یافتہ
برمی حریت پسند خاتون رہنما
جو جولائی ۱۹۹۰ سے
گھر میں قید ہیں

بُت نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "ہم دونوں میں سے کون پتھر ہے"

بے انت یاترا

تمھارے ساتھ مجھے پت جھڑ کب لگا
جب خواب کی دیوار کے ساتھ میں لگ کے کھڑی ہوئی
تو سامنے پرانے ادھڑے کپڑوں کے بیچ میرا اپنا آپ دکھائی دیا۔

تمھارے ساتھ مجھے پت جھڑ کب لگا
جب بات کرنے کے لیے میں آگے بڑھی
تو تمھارے ہونٹ سوال سننے سے پہلے ہی جواب تلاش کر رہے تھے۔

تمھارے ساتھ مجھے پت جھڑ کب لگا
جب بارش نے قطرہ قطرہ گر کر میری آنکھوں سے مقابلہ کیا
اور ہار گئی
جب درختوں پہ چہکتی چڑیاں ہماری خامشی سے خوفزدہ ہو
بولنا بھول گئیں۔
اور جب
چھاج میں رکھے قہقہوں کو میں چھان پھٹک کر سنوارنے لگی
تو دیکھا سارے قہقہوں کو گھن کھا چکا ہے:
تمھارے ساتھ پت جھڑ مجھے تب لگا تھا!

✣

میرا گھر میری جنّت

تمھارے اندر ایک اور مرد ہے
جو میرے علاوہ ایک اور عورت کو چاہتا ہے
میرے اندر ایک اور عورت ہے
جو تمھارے علاوہ ایک اور مرد کو چاہتی ہے
ہم دونوں ایک دُوسرے سے نفرت کرتے ہیں
اور ایک دُوسرے کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہتے ہیں

ہم دونوں کسی اور کو چاہتے ہیں
مگر اس کے ساتھ رہنے کا نہ سوچتے ہیں

اور نہ اس بات کا ملال کرتے ہیں
ہم دو دشمنوں کی طرح ایک دُوسرے کے عیب
نکال کر خوش ہوتے ہیں
تم مجھے غیر حاضر پا کر میری ساری چیزوں کی
تلاشی لیتے ہو،
مَیں تمھاری غیر موجودگی میں
تمھاری ساری جیبیں ٹٹولتی ہُوں
پھر بھی گزشتہ ایک چوتھائی صدی سے
مَیں اور تم ایک بستر پر سوتے ہیں۔

مَیں جانتی ہوں تم نے ڈاکٹر کے پاس جا کر
بچّوں کے خون کا ٹسٹ کروایا تھا
کہ تمھیں ان کی پدریت پر شک تھا

بچّوں کو بھی ہماری طرح
اس سارے ڈرامے میں
اپنا اپنا کردار معلوم ہے

نفرت کی اس چار دیواری میں
کوئی کسی سے نہیں پوچھتا
تم کیسے ہو!

٭

وینا حیات اور آسیہ ایوب کی فردِ جرم

مجھے اپنے گھر میں برہنہ کس نے کیا
ان ہاتھوں نے
جن کی انگلیاں بندوق کی لبلبی پہ
اور مٹھیاں بیعتِ زر کے لیے
کھلی رہتی ہیں

مجھے اپنے گھر میں برہنہ کس نے کیا
ان آنکھوں نے
جنھوں نے ماں کے پیٹ سے نکل کر
کھلنا سیکھا تھا

اور جنھوں نے حرفِ دُعا لینا اور اپنا دُودھ بخشوانا بند کر کے
بے غیرتی کے سُرمے سے آنکھیں لال کر لی ہیں۔

مجھے اپنے گھر میں برہنہ کس نے کیا
ان چہروں نے
جن کو ماؤں نے غیرت کا شہد چٹا کے جنا تھا
مگر ان کے ہاتھوں میں عصائے عیسیٰ کے بجائے
دیمک زدہ شہوتوں کی وہ زنبیل تھی
جس میں رشتوں اور جذبوں کی ساری تحریروں کو
قلم زد کر دیا گیا تھا۔

مجھے اپنے گھر میں برہنہ کس نے کیا
ان چہروں نے
جن کے لعین خون کو دیکھ کر
خنزیر بھی نفرت سے مُنھ پھیر لیتے ہیں
جن کے شیطان ارادوں سے
طوفان پناہ مانگتے ہیں

جن کے ثبوتِ جرم کی گواہی دینے کے لیے
سپیدیٔ سحر کی جلوتوں سے لے کر
طلوعِ شب کی سیاہیوں کا ذرہ ذرہ
صف آرا ہے۔
اور تم!
ضعیفیٔ احساس کے مُردہ خوارو۔
لوحِ بدن کو مسخ کرنے والو
تم مجھ سے ہی پُوچھتے ہو
مجھے اپنے گھر میں برہنہ کس نے کیا ہے۔

٭

قوسِ قزح زرد ہے

بارش کے بعد جب شام واپس لوٹ رہی تھی
وہ مجھ سے ملا
ہاتھ کے لمس نے بجھے ہُوئے سگار کی خوشبو یاد دلائی
اس کی آنکھوں کو دیکھ کر تازہ گیلی مٹی بہت مانوس لگی
کبھی اس کی پہچان نیوی بلیو کوٹ
کبھی سُرخ ٹائی اور کبھی سفید برّاق کُرتہ تھا۔
مگر اب ملگجا، مَسلا ہوا دامن، اپنی پہچان بتانے سے قاصر تھا۔
بادل گرجنے اور بجلی چمکنے کا سارا شور
گلیوں میں کھڑے پانی میں نہاتے بچّوں کی ہنسی کی تہہ میں دب
چکا تھا۔
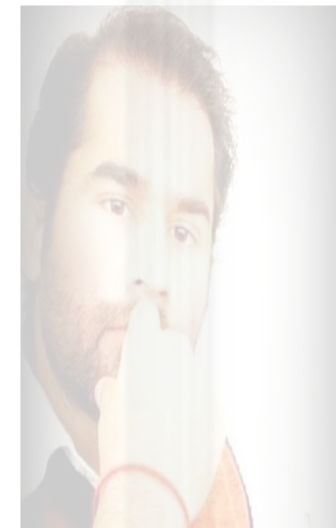
دروازے میں ہوا کی کروٹیں
بے اعتبار وعدوں کو ہتھیلی کی اوٹ میں رکھے۔
آنکھوں میں مایوسی کی سفیدی سے روشنی پھیلانے
کی کوشش کر رہی تھیں۔
نہیں جانتیں کہ
جب شام واپس لوٹ جائے
تو روشنی کسی اور سفر پر روانہ ہو جاتی ہے
مٹی اور کلیوں کے بدن کی تہذیب کرتی ہُوئی
وہ سمندر میں اپنا وجود ارزاں کرتی ہے
اور ہر روز سُورج کو اپنا بدن بنا کر واپس آتی ہے
ایسے وقت وہ مجھ سے کبھی نہیں ملا
اس وقت بھی نہیں جب پہچان کے دریچے
خود بخود کُھل جاتے تھے۔

بارش کے بعد جب وہ مجھ سے ملا
تو یادداشت کی چھڑی کے سہارے
کھڑے کھڑے، ہم دونوں تھکے تھے

تجربے اور جذبوں کے کسیلے پن سے
آنکھیں اور فضا دونوں دھندلا گئی تھیں
اجنبیت اور جھرّیوں کے بیسیوں سالوں بعد بھی
ہم دونوں کانپ رہے تھے
کہ کہیں کوئی بول کر
یادوں کے قبرستان کو مسمار نہ کر دے۔

❖
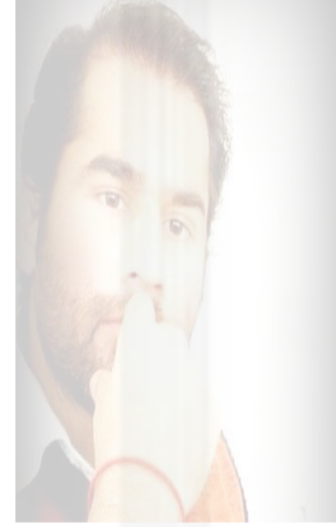
پرچھائیں اور میں مکالمہ کرتے ہیں

آؤ دیکھو باغ میں کرسیاں اکیلی ہیں
اور جن پودوں سے تم نے گفتگو نہیں کی ہے
وہ مرجھانے لگے ہیں۔
تم کیسا آئینہ ہو
اپنا ہنستا چہرہ دیکھنے کی تمنا لیے
بندے اور پرندے
تمھاری سمت کھنچے چلے آتے ہیں
مگر باغ کی خالی کرسیاں تمھیں
بلاتی رہتی ہیں۔
یادوں میں بھی تم خود کو ہی

دوبارہ دریافت کرتی ہو
کبھی اُن آنکھوں کے حوالے سے
جو تم سے ہم کلام ہوتی رہیں
کبھی ان باتوں کے حوالے سے
جو تم میں مہکتی رہیں
میں اپنی پرچھائیں کو
خود میں بدلتے دیکھ کر
باغ کی ساری خالی کرسیوں پہ
بیٹھ جاتی ہُوں!

✲

میرے ہاتھ میں پھول نہیں اور مَیں باغ میں ہُوں

ہماری مائیں، اپنے بڑھاپے کو
سوئٹر بُننے، بچے کھلانے
اور عبادت کرنے کے خالی پن سے
سجانے کی کوشش کرتی تھیں۔
وہ صحن میں بلا ارادہ آنے والے
پرندوں کے لیے بڑے اہتمام سے
دانہ ڈالتی تھیں
پالتو جانوروں کے لیے
کھانے کا اہتمام کرتی تھیں
وہ رشتوں کی چارپائیوں کو

کبھی ڈھیلا نہیں ہونے دیتی تھیں
پرانے بادشاہوں کے قصّوں کی طرح
اپنے پرکھوں کو یاد رکھتی تھیں۔

اتنی بڑی زمین پہ
اتنے رشتے رکھنے والیاں
پھر بھی اکیلی لگتی تھیں۔
کبھی نظر کی عینک کے شیشے صاف کرتی تھیں
کبھی آنکھیں صاف کرتی تھیں۔
ہمیشہ رہنے والا منظر تو ہمیشہ ہی رہتا ہے
نیند بھی تو بس باتیں ہی کرنے آتی ہے
کہ خوابوں کے شگوفے تو کب کے جھڑ چکے ہیں!

٭

انسومنیا

کبھی کبھی سمندر جھاگ بھی اچھا لگتا ہے،
لہروں کے بپھرنے کا عنوان
زندگی کے تموج کا اعلان
اور احساس کا ہیجان
جب میں اپنے گزرے ہوئے سالوں کو
قطرہ قطرہ اپنے تکیے میں جذب کرلیتی ہوں
تو کوئی نہیں بتا سکتا کہ میں نے کیا خرچ کیا ہے۔
اس وقت سمندر کی خشمگیں لہریں
میری کم ہمتی پہ سر پٹختی ہیں۔

اندھیری گلی میں رونے والی بلّی کی طرح
گھروں میں بلکتی عورتوں کی سی زندگی

مجھے پسند نہ تھی ۔
مجھے یہ بھی پسند نہ تھا کہ
اندر سے تو مَیں زردا جاؤں
اور باہر سے نکھری نکھری نظر آؤں ،
مَیں نے اندر کی عورت سے منہ موڑ کر
اکیلے سفر کرنے کا فیصلہ کیا
اور اپنے کمرے میں بے شمار تازہ پھول آراستہ کیے
ملک ملک کے ریکارڈز ، کٹ گلاس اور وائن
ملک ملک کے لوگوں کی طرح
میرے گھر میں آراستہ ہوئے ۔
سارا گھر چیزوں اور آوازوں سے بھر گیا ۔
صبح کی روشنی میں دیکھا
تو زرد عورت پھر موجود تھی ۔
سارے کمرے میں گلاب اور کارنیشن
پتی پتی بکھرے ہُوئے تھے
اور میری انگلیاں خزاں زدہ شاخوں کی طرح
بھوسلی بھوسلی تھیں ۔

اس وقت مجھے پھر
سمندر کی خشمگیں لہریں یاد آگئیں ۔
میں نے زرد عورت کو
موم بتی کے پگھلے موم کی طرح
نوچ کر باہر پھینکنے کی کوشش کی ،
تیز گرم پگھلے موم سے میری پوریں جل گئیں ۔
زرد عورت نے جلی انگلیوں پہ
مکڑی کا جالا رکھ دیا ۔

میرے وجود کے عجائب گھر میں
اب نہ بُت ہیں نہ پُرانی تصویریں ،
پُرانے زنگ آلود فوارے سے کبھی کبھی
نکلتے پانی کی طرح
میری آنکھوں سے بہتے پانی کو
سمندر جھاگ یاد آتا ہے !

☆

پُتلی تماشہ

میں نے موت کو نہاتے ہوئے دیکھا
اس کا بدن مجھ سے زیادہ گِھسا ہُوا
اور لٹکا ہُوا تھا

وہ نہ گھر میں تھی اور نہ کھیت میں
وہ کنویں کنارے پانی پیتی جاتی
اور اپنے بدن پہ پانی ڈالتی جاتی تھی۔
مرد اور طاقتور جانور بھی اُس سے ڈر رہے تھے
بچے لا پرواہ کھیل رہے تھے
اور عورتیں جانتی تھیں کہ پیدائش کے بعد
مردار مسکراہٹ ان کا استقبال تھا

مگر اس وقت موت کا بدن
پانی میں تیرتی مچھلی کی طرح
چمکدار لگا تھا۔

جل مچھلیوں کی ضعیف ہونے سے پہلے
مچھیرے اور جال سے مُلاقات ہو جاتی ہے
اور موت مچھلی اس مُلاقات کو مختصر کر دیتی ہے۔
قحبہ خانے سے تندور تک غائب ہوتے چہروں پر
موت مچھلی کا کوئی بس نہیں چلتا ہے
ایسے منظروں میں جب اس کی سانس اُکھڑنے لگے
تو کنویں کنارے بیٹھ کر پانی پیتی جاتی ہے
اور پانی اپنے بدن پہ ڈالتی جاتی ہے۔
پرچھائیوں کو کوئی کفن نہیں پہناتا ہے
وہ یونہی کنویں کنارے بیٹھی
پانی پیتی رہتی ہیں۔

٭

دستخط

اس نے مجھے پھول نہیں
خط بھیجا تھا
مہکتا ہُوا، اپنے بدن جیسا خط،
میرے گھر میں کیاری نہیں تھی
میں نے اپنے ذہن میں اس خط کی
چنبیلی کو چاندنی رات کے دوران لگایا،
خط کے آخر میں لکھا اس کا نام
اس کے دستخط
میں نے کاغذ پہ کاڑھے
پھر وہی دستخط مَیں نے اپنے بدن پہ کاڑھے
اپنی عمر کی جھرّیوں میں کاڑھے۔

عمر کی فصل کاٹ کے وہ بے تعلق سا ہو گیا
اور اس نے گھر کی چوکھٹ پہ کھڑے ہو کر
میرے دستخط مانگے۔
انکار کو شکست میں بدلتے دیکھ کر
وہ چلا گیا۔

اب کے بھی اس نے خط نہیں
پھول بھیجے تھے۔
اپنے تابوت پہ رکھے پھول،
مَیں کہ جس نے بے تعلقی کو مستند کرنے سے
گریز کرتے ہوئے دستخط نہیں کیے تھے،
میرے ہی دستخط اس کا تابوت وصول کر سکتے تھے۔
ہر اعلان نامہ کچھ دستخط چاہتا ہے!

سانس سمندر

جلنے کے بعد کیا ہوتا ہے!
زمین کے رنگ کی بھوبھل میں
کہیں کوئی چنگاری
کہیں دھواں،
نہ چٹخنے کی آواز
نہ سلگنے کا انداز
نہ بجھنے کا طریقہ
نہ بجھتے دیوں کے
آخری سانسوں کا منظر!

میں نے ایک ہتھیلی پہ
دوسری ہتھیلی کھڑی کر کے
دیوار بنا کر، گھر بنانے کی کوشش کی،
ایسے — جیسے ایک چڑیا
ایک پر کے بل پر اُڑنے کی کوشش کرے
جیسے پھٹے ہوئے کاغذ سے پتنگ بنائی جائے
جیسے سوکھے پتّے سے جنگل کا منظر بنایا جائے
بس اسی طرح میں نے گھر بنا لیا۔
اُداسی کا کوئی گھر نہ تھا
اُس کی بے گھری پہ مجھے ترس آگیا
میں نے اُسے اپنے گھر میں بسا لیا
اب بجھتے دیوں کے آخری سانسوں
کا منظر
میرے ہونٹوں پہ رقم ہے!

٭

اُمید کے بادبان

ہسپتال میں چادر کے ساتھ
مریض کا نام بدل جاتا ہے۔
کوئی کسی کو نہ جانتے ہوئے بھی
مسیحائی کے نام پر رشتہ باندھتا ہے
مسکراہٹ کی بے معنویت
وارڈ در وارڈ آویزاں رہتی ہے۔
آپریشن تھیٹروں میں یہ بے معنویت
نقاب پوش ہو جاتی ہے۔
اور بدن کے نقاب کا پردہ چاک کرتی ہے
بہار، خزاں، دُھوپ، چاندنی
یہاں کسی موسم کو داخلے کی اجازت نہیں ہے۔
یہاں صرف ایک موسم رہتا ہے
دوا کو گلے سے اُتارنے کے تلخ آمیزے کا موسم،
لفظ کو اُمید کے بادبان سے باندھنے کا موسم،
انتظار کو، نامعلوم قدموں کی آہٹ کو،
چہروں میں بدلنے کا موسم،
ان سارے موسموں کی دریوزگی
ناتمامی رکھتی ہے
تمام ہونے والا موسم بس ایک ہے۔
ہسپتال میں چادر کے ساتھ
مریض کا نام بدل جاتا ہے

٭

کبیرہ گناہوں کے بیچ

رات کو ہونے والی بارش کو
آوارہ کتّے اور شکار کی تلاش میں
پھرتے بھیڑیے ہی دیکھتے ہیں۔
تمھاری نیند میں تو اس بارش سے خلل
پڑتا ہے
اسی طرح جیسے میری گفتگو سے
تمھاری نیند خراب ہوتی ہے۔
بارش اور گفتگو ایک ہی طرح کے لہجے ہیں
پیاسی زمین بارش کو
اور جواب نہ دینے والے گفتگو کو جذب کر لیتے ہیں

پیاسی زمین اور بارش کا اتصال تو
جذبوں کے شعلوں کو ترازو کرتا ہے۔
بن جواب گفتگو
انگارہ ہاتھ پہ رکھنے کی طرح ہے۔
جو ہاتھ التجا کے لیے نہ اُٹھتے ہوں
ان پر انگارے ہی رکھے جاتے ہیں۔
رات کی بارش ان انگاروں پر ضرور ڈالو۔
یاد رکھنا
شکار کی تلاش میں بھیڑیے بھی ایسی بارش
ہی میں جاگتے ہیں۔

❖

جنگل میں ژالہ باری کا منظر

میں جس زبان میں خواب دیکھتی ہوں
اس زبان میں لکھتی نہیں ہوں
میں جس بدن کو محسوس کرتی ہوں
اس پر، ریپنگ پیپر کی طرح
ساڑی لپیٹ لیتی ہوں
مجھے کہا گیا شریف لڑکیاں
اونچی آواز میں قہقہے نہیں لگاتی ہیں
نامحرم سے ہاتھ نہیں ملاتی ہیں
اپنے نام کے ساتھ بیگم کا لقب لگا کر
شہادت دیتی ہیں
کہ وہ منکوحہ ہیں۔

میں جس زبان میں خواب دیکھتی ہوں
اس زبان میں یہ شہادتیں کام نہیں آتی ہیں
مجھے پہلے خدا سے ڈرایا گیا، پھر مرد سے،
کبھی کسی کو دوست سمجھنے کی تربیت نہیں دی گئی
خوف کا تعویذ میرے گلے میں اس وقت تک پڑا رہا
جب تک میں نے خواب دیکھنے شروع نہیں کیے تھے۔
میرے خوابوں کو بیان کرنے کے لیے لغت کہاں سے آئے گی
کبھی کبھی سورج غروب ہونے سے پہلے
اس کی تھالی میں خواب ڈال دیتی ہوں۔
شاید اگلی صبح وہ زبان مل جائے
جس میں میں اپنے خواب بیان کرسکوں۔
سورج میرے دیے ہوئے خوابوں سے

رات کی تنہائی تو دُور کر دیتا ہے۔
میری نہیں۔
مَیں اپنے بدن پہ ریپنگ پیپر
کی طرح
ساڑی لپیٹ لیتی ہوں۔

☆

قید میں رقص

سب کے لیے ناپسندیدہ اُڑتی مکھی
کتنی آزادی سے میرے منھ اور میرے ہاتھوں پر بیٹھتی ہے
اور اس روزمرّہ سے آزاد ہے جس میں مَیں قید ہُوں۔
مَیں تو صبح کو گھر بھر کی خاک سمیٹتی جاتی ہُوں
اور میرا چہرہ خاک پہنتا جاتا ہے۔
دوپہر کو دُھوپ اور چُولھے کی آگ
یہ دونوں مل کر وار کرتی ہیں۔
گردن پہ چھُری اور انگارہ آنکھیں
یہ میرا شام کا روزمرّہ ہے۔
رات بھر شوہر کی خواہشوں کی مشقت
میری نیند ہے۔

میرا اندر تمہارا زہر
ہر تین مہینے بعد نکال پھینکتا ہے
تم باپ نہیں بن سکے
میرا بھی جی نہیں کرتا کہ تم میرے بچّے کے باپ بنو،
میرا بدن میری خواہش کا احترام کرتا ہے
میں اپنے نیلو نیل بدن سے پیار کرتی ہوں
مگر مجھے مکھی جتنی آزادی بھی تم کہاں دے سکو گے
تم نے تو عورت کو مکھی بنا کر بوتل میں بند کرنا سیکھا ہے۔

٭

خیالی شخص سے مقابلہ

اے بے نام عورت
جس بچّے کو تم میری دہلیز پہ
پیدا ہونے کے تین گھنٹے کے بعد پھینک گئی تھیں
وہ بچہ فیصلہ کرنے کی عمر کو پہنچ چکا ہے

میری کوکھ میں جتنے بچّے پیدا کرنے کی طاقت تھی
وہ ساری اس کے کندھوں کو اُونچا کرنے میں صرف ہو گئی
ہر بار اس کے بال سنوارتے، اس کو سُلاتے اور
مُنہ چُومتے ہُوئے۔

اے بے نام عورت
ہر بار تم میرے سامنے آن کھڑی ہوتی ہو
مذاق اُڑاتی ہو مری دلداری کا
مشکوک کرتی ہو میری شناخت کو
اور سر اُونچا کر کے اعلان کرتی ہو
"یہ میرا بیٹا ہے"
یہاں خدا بھی تمھارا ساتھ دیتا ہے
کہتا ہے" پالنے والے سے پیدا کرنے والا
زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔"

مکان تبدیل کرتے ہُوئے
جس طرح سارے گھر کی چیزیں بکھری ہوتی ہیں
اے بے نام عورت
تمھارا یوں آ کے مجھے بکھیر جانا
مجھے تماشہ سمجھ کے دیکھنا
اور اپنے خون کی گواہی کو معتبر سمجھنا
میرے اعصاب کو رُوئی کی طرح دُھنکتا ہے

میں سب جانتی ہُوں
کہ تم کس روشنی کو پکڑ کر کھڑی ہو
تم سمجھتی ہو فیصلہ کرنے کی عمر
تمھارے حق میں وراثت کی مہر ثبت کر دے گی۔
میرا دل آسمان کی طرح کشادہ نہیں ہے۔
مگر اے بے نام عورت
میں نے تو رشتے کے خمیر کو
اپنے آنسوؤں سے لکھا ہے
میری عمر کے ہر سنگِ میل پر
اس بچے کا نام لکھا ہے
میں نے بے نشان زندگی نہیں گزاری ہے۔
اے بے نام عورت
میرا نام دعا کے ماتھے پہ لکھا ہے۔

٭٭

بے دہلیز در و دیوار
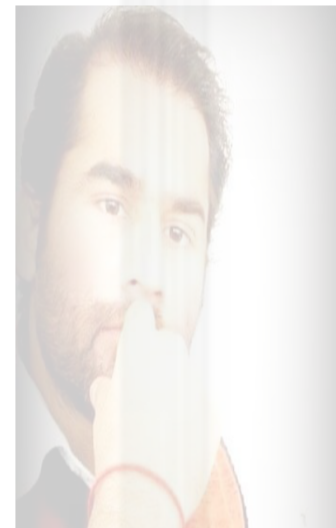
ایک ہاتھ جو آپ تک لقمہ پہنچاتا ہے
ایک ہاتھ جو آپ سے لقمہ چھینتا ہے
ایک ہاتھ جو آپ کے آنسو پونچھتا ہے
ایک ہاتھ جو آپ کو سہارا دیتا ہے
ایک ہاتھ جو آپ کو الوداع کرتا ہے
ایک ہاتھ جو آپ کا وجود محسوس کرتا ہے
ایک ہاتھ جو آپ کے گھر میں نقب لگاتا ہے
ایک ہاتھ جو آپ کے بدن پر نیل ڈالتا ہے
ایک ہاتھ جو آپ کے صحن کو آباد کرتا ہے۔
دُعا کے لیے اُٹھتا ہے
سروں پہ شفقت کی چھاؤں کرتا ہے
اپنی انگلیوں سے بدن کے مضراب کو چھیڑتا ہے۔
مَیں دست بریدہ
اُسی ہاتھ کی تلاش میں
اپنے ماتھے کے زخم کو دیکھ رہی ہوں

٭

رشتہ کائی بن گیا ہے

گنہ اور محبت
میرے تمہارے درمیان ٹھہرے پانی کی روانی ہیں
ہیں ورق ورق
تعلقات کی کائی اکھیڑتی ہوں
تو خشک بوسوں کے نشانات بھی ٹوٹ جاتے ہیں
خواب، پیدا ہونے سے پہلے مرنے والے بچے بن جاتے ہیں
اور اعتماد کے شامیانے اکھڑ جاتے ہیں

میں تمہارے ساتھ گنہ آلود زندگی گزارتی رہی
کہ میں تمہارے سامنے مصنوعی محبت کے لفظ بولتی رہی
نمائشی جذبوں کا اظہار کرتی رہی
کہ بس تمہارا اتنا ہی تقاضا تھا۔

وہ محبت جو میں تمہیں دے سکتی تھی
اور جو محبت تم مجھے دے سکتے تھے
خواہشوں اور امکانات کے یہ چاند
محض پانی میں نظر آتے رہے۔

میں نے کئی دفعہ صبح تک
تمہارے خواب سنبھالنے کی کوشش کی
میں نے کئی دفعہ تمہارے ہونٹوں پہ
آرزو کی لہر روکنے کی کوشش کی
یہ تو مجھے چٹیل چٹانوں کو دیکھ کر پتہ چلا
کہ تم اپنی منکوحہ کو ستانے کے لیے
میری محبت کے لالہ زار سے پھول چننے آتے تھے

بارش کا پانی بھی تو بن بلائے گھر میں آجاتا ہے

بدن پہ چھینٹا پڑے تو اچھا لگتا ہے
صحن بھر جائے تو بُرا لگتا ہے
آنکھوں کے دلدلی جنگلوں کے اس پار
چٹیل چٹانوں کے اُوپر
نظر آنے والا ستارہ
میری صبح کا استعارہ نہیں ہے

٭

خوابوں کی پیشی

میں نے سوچا تھا
اپنے خواب بھی کپڑوں کی طرح بدل لیا کروں گی
اور تر و تازہ ہو جاؤں گی
بند صندوق میں تہہ کیے خوابوں کو نکال کر سُونگھا
ان میں رکھے ہُوئے کی بُو آ رہی تھی۔ خواب ذرا نم بھی تھے
میں نے انھیں تازہ کرنے کو، سکھانے کو
دھوپ میں ڈالا۔
ہر خواب کا تہہ پر سے رنگ اُڑا ہُوا تھا
رنگت بھی ماند پڑ گئی تھی
مگر حلیے سے شناخت ہو سکتی تھی
محبت کے خوابوں کا رنگ

اب سُرخ انار سے بھوسلا بھوسلا
کلیجی جیسا ہو گیا تھا ،
رفاقت کے خوابوں کا رنگ
اب آسمانی سے
ملگجا ملگجا دُودھیا سا ہو گیا تھا
وعدوں کے خوابوں کا رنگ
دہکتے قرمزی سے
راکھ ہوتے کوئلے کے رنگ سا ہو گیا تھا
ممتا کے خوابوں کا رنگ
سبز پتاور سے
جھریوں جھریوں سُوکھا پیلا ہو گیا تھا ۔
میں نے ہر رنگ کے خواب کو دُھوپ میں ڈالا
تپش کے لمس نے خوابوں کو سوال بنا دیا تھا
میری مسکراہٹ ، میری آنکھیں ، میری بات
ہر چیز سوال بن گئی ۔
میں نے کتابوں سے سوال کا جواب مانگا
ایک ہاتھ لگانے سے ساری کتابیں

زمین پر آ رہیں ۔
قطار میں چیونٹیاں بھاگی جا رہی تھیں
میں بھی ان کی قطار میں کھڑی ہو گئی
انھوں نے مجھے کوئی اہمیت نہیں دی
اور اپنا سفر جاری رکھا ۔
میں اپنے سوال لیے کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی
سامنے ایک عدالت لگی تھی
پتہ چلا روز مقدمہ لگتا ہے ، روز فیصلہ ہوتا ہے
میں نے اپنے اثاثے اس عدالت میں پیش کیے
مجھے ناجائز خواب اور ناجائز سوال رکھنے کے جرم میں
چودہ سال قید کی سزا سُنا دی گئی
میں جیل جانے سے پہلے گھر کپڑے لینے آئی
تو دیکھا
دُھوپ میں کوئی خواب نہیں تھا
چند لال بیگ اُلٹے پڑے تڑپ رہے تھے ۔

✣

بارھویں ترمیم میں ترمیم

چاروں طرف پھیلے ننگے پن کے طاعون سے
نجات پانے کے لیے
مَیں نے اپنے زمانے کے فرعونوں سے التجا کی
کہ ہمارے پیدا ہوتے ہی
دفن کرنے کی رسم کو
شریعت بل کا حصّہ بنا دو۔

٭

نظریۂ ضرورت کے دوران پیدا ہونے والے بچّوں کا المیہ

آدھی صدی پہلے کا تابدار سبز رنگ
کھُلی ہوا اور زمین کی قوّت نہ ملنے پر
کائی جیسا ہو گیا ہے

آج سے آدھی صدی پہلے ہلال کو دیکھ کر
ہمارے سارے چھوٹے بڑوں نے ہاتھ اُٹھا کر
سلامتی اور خوشحالی کی دُعائیں مانگی تھیں
ہلال نے ان دعاؤں کے بانجھ پن کو اوڑھ لیا۔

دنیا کے نقشے پہ ملکوں کی لکیریں فتح یا شکست
کے بعد ہی بدلتی ہیں
میں اپنے بیٹے کو پڑھاتے ہوئے کیا سمجھاؤں
کہ ہمارے ملک کی لکیریں فتح کے بعد بدلی ہیں
کہ شکست کے بعد
اور وہ بھی کس کے ہاتھوں !

حفاظتی مورچوں پہ رہنے والوں نے کیا کیا
میں تاریخ پڑھاتے ہوئے
اپنے بیٹے کو کیا کیا بتاؤں ۔

کچھ لفظ میں نے اُسے نہیں پڑھائے
ٹیلی وژن نے اس کی روزمرہ میں داخل کر دیے ہیں
بچپن کی دہلیز پہ
اُسے جیل ، پھانسی اور کوڑوں کا مطلب آ گیا تھا
سڑکوں پہ گرے دوپٹوں اور بکھری ہوئی خالی جوتیوں کا
مطلب آ گیا تھا ۔

البتہ میرے دس سالہ بیٹے کو جلوس کا مطلب نہیں آتا تھا
وہ کچھ نہیں بولتا تھا
وہ تو ٹیلی وژن کو بولتا دیکھ کر بڑا ہوا تھا ۔

٭

سپیڈی ٹرائل

اب ہمارے شہر میں دن کو بھی بلیک آؤٹ ہوتا ہے
یہ بڑی انہونی بات ہے
مگر انہونی بھی تو زندگی ہی میں ہوتی ہے
ہماری زندگی کہ جس میں جمع کم اور تقسیم
زیادہ کیا گیا ہو
کہ جس میں فتح
زندگی سے زیادہ موت کا نام ہو
وہاں ارادوں کی بندوق کیا کرے گی
اب بندوق حفاظت کے لیے نہیں
عداوت کے لیے استعمال کی جاتی ہے

لوگوں — بہت سے لوگوں سے عداوت
احساس سے عداوت
میرے کتنے ہی ساتھیوں کو
حق کی دہلیز پہ کھڑے ہونے کے جرم پہ
گولی مار دی گئی۔
میں نے دہلیز، دروازے اور صحن کا
فرق مٹا دیا ہے
مجھے گولی مارنے کو انھیں صحن میں آنا پڑے گا
کھلے میدان میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ہوتی ہے
میں تو پہلے ہی چھپ نہیں سکتی تھی
اب تم بھی نہیں چھپ سکو گے
میرے پاس تو ارادے ہیں
تمھارے پاس کیا ہے
محض ایک آرڈیننس!

✤

بازگشت

تم نئی عورت ہو
فتح تمھارا مقدر نہیں
اور شکست کو تم تسلیم نہیں کرتی ہو
فیشن ایبل صابن کے ریپر کی طرح
شبِ عروسی تمھارا چمکدار لبادہ اُترتا ہے
اور پھر گھلتے رہنے کی زندگی کا دور شروع ہوتا ہے۔
جس طرح پیاز چھیلتے ہوئے
آنکھوں سے پانی بہتا ہے
اُسی طرح مرد کی شخصیت کے پرت اُتارتے ہوئے
تم آنکھیں پونچھتے پونچھتے

شکستہ جہاز کی طرح خود کو لنگر انداز کرنے کی کوشش میں
بے حال ہو جاتی ہو۔
تم کیسی نئی عورت ہو
نہ بھولتی ہو نہ معاف کرتی ہو
دن گزرنے سے پہلے اس کا اختتامی نوحہ اچھا نہیں

آواز پلٹ کر میرے پاس آتی ہے

میں نے زندگی میں جس چیز کی بھی خواہش نہیں کی
اُسی نے میرے ساتھ رہنے کا ارادہ کیا۔
مجھے غربت اور محنت کے خارزار نے
خواب اور محبت کی دہلیز سے پرے رکھا۔
میں نے ننگے سر اور ننگے پیر
زندگی کو خزاں دیدنی کیا
اور آنکھوں کو وحشت کے حوالے کیا۔
ابھی کوکھ سلامت تھی
میرے بدن کی سرسوں خوب پھولی
دو آنکھوں کی طرح، دو چنار جیسے فروزاں بدن

مجھے پھولوں کے ساتھ ہنستے نظر آئے
یہ دیکھ کر میں نے رات کے بھرے ٹھنڈے کٹورے سے
اپنی پیاس بجھائی
صبح کو روشنی کی طوطی بولی
"آشیانہ خالی ہے"
سارے پرندے، بہت اُونچے، بہت مسرور
اپنی اُڑان میں بدمست تھے

میں نے غم خوار ہواؤں کو تلاش کرنے کے لیے
دوستوں کے سفینے میں بیٹھ کر
شناسائی کے بادبان کھول ڈالے۔
پذیرائی کی خوشگوار لہریں
شادکامی کے جزیرے پہ لے آئیں
مسکراہٹوں کی چادر تلے
بے شمار ہاتھ، اَن گنت آنکھیں
اور لاتعداد ہونٹ
دوسروں کی محبت کی گواہی دے رہے تھے

سب دوسروں کا تعارف کروا رہے تھے
کسی کا اپنا آپ وہاں موجود نہ تھا۔
پلٹ کر دیکھا
تو سفینہ دُور جا چکا تھا
نارسائی کی ریت، دُھوپ میں چمک رہی تھی۔
دوستوں کی طرح ملنے والوں کی سرگوشیاں
میرے اندر مزاحمت پیدا کرتی چلی گئیں
انھیں یہ خبر نہیں تھی
کہ میری آنکھوں اور دماغ کے درمیان فاصلہ نہیں ہے۔
انھیں یہ بھی خبر نہیں تھی
کہ مجھے لفظوں سے ڈھکے چہروں کی تحریر پڑھنی آتی ہے۔

❖

مفاہمت کی زنبیل

کل رات میں نہیں سوئی
اس لیے نہیں کہ نیند اور میرا نباہ ناممکن ہے
اس لیے کہ میں کھلی آنکھوں تمھارے تصوّر کو سمیٹنا چاہتی تھی
اپنے ہی بنائے ہوئے پیکر سے اتنا پیار
عجب لطف دے رہا تھا
میں تمھارے تصوّر کے خلوتی ذائقوں میں ڈبو کر
چکھ رہی تھی
ہجر موج در موج میری جانب بڑھ رہا تھا
خواہشوں کو مدعا سمجھائے بغیر بھیجنے والوں کی طرح
غبار آلود، درد آگاہ کھلی آنکھیں

یہ سمجھنے سے قاصر تھیں
کہ غبار، خیاباں نہیں بنایا کرتے ہیں
آئینہ مجھے کہہ رہا تھا
طغیانیوں کو وصال کی پوشاک میں بدلنے کے لیے
نیند سے تباہ کرنا سیکھو!

٭

کس آنکھ نے تباہی کو سب سے پہلے رُونما ہوتے دیکھا تھا

بیسویں صدی کا اختتامی نوحہ

جیسے ہوا غصے میں آ کے
بادبان اکھیڑ دیتی ہے
گھروں کی چھتیں اُڑا دیتی ہے
پھولوں کی پتّیاں بکھیر دیتی ہے
بالکل ویسے بالکل ویسے ہی
تم نے قدِ آدم مجسّموں کو توڑ ڈالا ۔

جیسے پانی پیاس کے آنگن سے نکل کر
بپھرا ہوا طوفان بن کر
تمھارے میرے کھیتوں کھلیانوں کو اُجاڑتا
جانور، انسان اور پیڑ، سب کو بہا لے جاتا ہے
بالکل ویسے بالکل ویسے ہی
تم نے قدِ آدم مجسّموں کو توڑ ڈالا ۔

جیسے معصوم بچّے
کاغذ کی کشتیاں پانی میں ڈالتے ہیں
کاغذ کے جہاز اُڑاتے ہیں
صابن کے پانی سے رنگین بُلبُلے بناتے ہیں
لکڑی کے گھوڑے پہ بیٹھ کے خوش ہوتے ہیں
ڈنڈے کو بندوق سمجھ کے اُٹھاتے ہیں ۔
بالکل ویسے بالکل ویسے ہی
تم نے قدِ آدم مجسّموں کو توڑ ڈالا ۔

⁂

سکڈ میزائل کی تربت پر

سعودی ٹکسالوں میں
ریال کی جگہ ڈالر بنایا جا رہا ہے
اور سعودی ریت کی جگہ بارود بچھایا جا رہا ہے۔
خود کو اتحادی کہنے والے رخنہ ساز
اتنی دُور بیٹھے چاند سے بھی خوفزدہ ہیں
اور منتظر ہیں کب چاند چھُپے اور وہ شب خون ماریں۔
بڑی فوج بنانے والوں کو یہ یاد نہیں رہا تھا
کہ انھیں بڑے مُردہ خانے بھی بنانے چاہئیں
ساری دُنیا کو اپنا ماتحت سمجھنے والوں کے تابوت کو
کندھا دینے کے لیے چار اُجرتی قاتل ہی بچے ہیں

باقی دُنیا
معصوم بلکتے بچّوں کے لیے دُودھ تلاش کر رہی ہے
کہ خوف نے ماؤں کی چھاتیوں سے دُودھ
اور بچّوں کے چہروں سے ہنسی چھین لی ہے
کہ سیاست نے
ظالم کا ساتھ دینے کی صدیوں پُرانی روایت
کو برقرار رکھا ہے
حالانکہ، سارے ہلاکو، سارے ہٹلر
انسانیت کو پسپا نہیں کر سکے ہیں۔

✤

فیصلہ ۱۹۹۱

تم آسمان میں کسی عدالتی تحقیقات کے بغیر
مجرم قرار دیے جا چکے ہو
تمھارے جرم کے نقوش
سعودی ریت نے بھی سنبھال کر رکھے ہیں
تمھارے جرم ان آنکھوں میں لکھے ہیں
جو بموں کے زخموں سے پتھرا گئی ہیں
تم غارِ حرا کا سامنا کیسے کرو گے
کہ تم تو جھوٹ کے غاروں میں بیٹھے
سی ۔ این ۔ این اور امن مشن
بناتے رہتے ہو ۔
ہماری تاریخ تو پانی نہ ملنے کی آبدار داستان ہے
تم نے تو آبِ زم زم کو بھی داغدار کر دیا ہے
تم تو اس خاک کو بھی جس کا چپہ چپہ سجدہ گاہِ جہاں کہلاتا تھا
فرنگیوں کی توپوں اور بارُودی سرنگوں سے آلُودہ کر دیا ہے
صفا اور مروا کی سرزمیں !
تیل اور ڈالر کے خود ساختہ خداؤں کو بتا دے
کہ تیرے بدّو بیٹے
نجف و کربلا کی گلیوں میں رہنے والوں کے
دُودھ شریک بھائی ہیں
ان کی مٹھیوں کو کم قیمت ڈالروں سے مت آزماؤ
جاؤ اور سمجھو
کہ تم اوپر آسمان میں
کسی عدالتی تحقیقات کے بغیر
مجرم قرار دیے جا چکے ہو !

٭

جلتے دمشق و بصرہ کی بُجھتی آوازیں

اُٹھو امّاں!

بچّے بھُوک سے چیخ رہے ہیں

چُولھا کیسا

اب تو ہمارا سارا گھر ہی سُلگ اُٹھا ہے

دُھواں بھرا ہے

کوئی نہیں جو تجھے پُکارے، کوئی نہیں جو تجھے بُلائے

کوئی نہیں جو تجھے بچائے۔

اُٹھو امّاں

پُوچھو ان بچّوں کا حال کہ جو

خندق میں چھُپے تھے

پانی مانگتے مانگتے

جن کے ہونٹ ادھوری بات بنے تھے۔

اُٹھو امّاں!

آج ہماری بستی کی دیوار نہ در۔

نہ کوئی گھر ہے۔

نہ کوئی کھیت نہ چمنی باقی

نہ کوئی بال نہ بچی باقی

نہ کوئی دِیا نہ بتی باقی

نہ کوئی کھرپی، کنڈی باقی،

اُٹھو امّاں!

لاشوں کے ڈھیروں سے اُٹھو

اپنی گود کے پالوں کو دفنانے اُٹھو

خُون میں ڈُوبا سارا بصرہ کیا لگتا ہے

یہ تو بتاؤ!

اُٹھو امّاں یہ تو بتاؤ!

تم کو یہ کیوں یقیں نہیں تھا

سامراج کو ظلم کی پیاس بہت لگتی ہے
اپنی پیاس بجھا لینے کو
صحرا کیا اور سمندر کیسا
ہر چپے پہ اس کے پیلے دانت گڑے ہیں۔
سامراج کی آنکھیں نہیں ہیں
آگ کے دو گولے ہیں جن میں
ہوس کا ایندھن بھرا ہُوا ہے۔

اُٹھو امّاں!
میرے بجھتے ہونٹ، اٹکتے سانس کی
اس دہلیز پہ ٹھہرو اور دیکھو تو
ساری دشمن دُنیا
میرے ننگے بدن کو تصویروں میں ڈھال رہی ہے
تم شرمندہ مت ہو امّاں
اُٹھو امّاں!
اُٹھو امّاں!

گرتی ہوئی دیوارِ برلن گنٹر گراس اور مَیں

میں بہت قریب کھڑی تھی اس دیوار کے
جسے تم توڑ رہے تھے،
بے یقین لمحوں میں، یہ دیوار میری پناہ تھی
میرا ستر تھی، میری بے گھنی کی گواہ تھی
میرے حصّے کا ماضی تھی، میرا اعتبار تھی،
ان رشتوں اور اُداسیوں کے نام پہ
جنھیں مَیں نے حرزِ جاں اپنی مرضی سے بنایا تھا
آزادیاں حاصل کرنے والوں
اور آزاد ہونے کی خواہش رکھنے والوں نے
ریت کی دیوار کی طرح

اس دیوار کا آہن پگھلا دیا ہے
وہ خوش ہیں اور میں اُداس ہوں

میں پرندوں کی نسل سے ہوں
اور اُڑنا میری وراثت ہے
مگر یہ دیوار گرتے گرتے مجھ سے کہتی ہے
میرے نام پہ کیے گئے وعدوں کا ذائقہ
جب تک تمھاری زبان پہ رہے گا
تم بے ستر نہیں ہو سکتیں
اندھیرے میں چراغ لے کر چلنے والوں کے نام نہیں ہوتے ہیں
مگر لوگ ان کو کبھی نہیں بھولتے ہیں۔

❖

آسمان سیاہ ہے اور اُس نے رنگ پہننا بند کر دیا ہے

جس شہر میں ڈل جھیل ہمکتی تھی
اس شہر کی ایک کھڑکی کھُلی ہے
ایک عورت پھٹی پھٹی آنکھوں سے
اس سڑک کو دیکھ رہی ہے
جہاں بچّے کھیلتے تھے
وہاں اب موت کھیلتی ہے۔
کئی مہینے ہو گئے
قدموں کی چاپ نہیں
گولیوں کی آواز سُنائی دیتی ہے۔
یہ آوازیں سُن کر

ماؤں کی چھاتیوں میں دُودھ نہیں ہے
اور رونے والے بچّوں کی آواز نہیں ہے۔
ادھ جلی لاشیں، چھلنی ہُوئے بدن
یہ منظر ڈل جھیل کے کنارے بھی ہیں
اور ریشم گلی میں بھی
میری امرتا اور میرے منٹو کو
کتنا دُکھ تھا، اس وقت کے خون بہنے پہ
آج ہمارے سارے شہر خون لکھ رہے ہیں
اور بادشاہتوں کے زعم کے فصیل نشیں کہہ رہے ہیں
سُورج ہم سے پُوچھ کر غروب ہوتا ہے

٭

اپاہج ماں مٹی کی گولڈن جوبلی

میری سُنو !
میں تم سے مخاطب ہُوں
میں پاکستان ہُوں !
تمھاری ماں مٹی
میں نے ان لوگوں کی اُمیدوں کی
کوکھ سے جنم لیا تھا
جو اب ہم تم میں نہیں ہیں۔
وہ سچے لوگ
جنھوں نے ایک علیحدہ مملکت کا خواب دیکھا تھا
ایک ایسی مملکت کا خواب
کہ جس میں وہ اور ان کی آئندہ آنے والی نسلیں

آزادی اور فخر سے خود کو انسان کہہ سکیں
وہ سچے لوگ
جنھوں نے اس خواب کی تعبیر کے لیے
اپنی زندگیوں کا سودا کیا تھا۔
میں ان ہی سچے لوگوں کے
خوابوں کی تعبیر ہوں۔
میں چوبیس سال کی ہوئی
تو جھوٹ کے گماشتوں نے مجھے اپاہج کر دیا۔
میں ۴۳ سال کی ہو کے بھی
خوفزدہ اور غیر محفوظ ہوں
اُمیدیں مجھ سے چھپتی پھر رہی ہیں
میں کوئی بھولا ہوا سبق نہیں ہوں
میں کوئی ٹوٹی ہوئی شاخ نہیں ہوں
مگر یہ کیسا دھواں ہے
جو میری آزادی کی آنکھوں کو دھندلائے چلے جا رہا ہے
یہ کون سے شعلے ہیں
جو میرے اسلاف کی فتح مندیوں کو جھلسائے دے رہے ہیں

یہ کیسا خوف ہے
جو میری رگوں میں جوش مارتے خون کو شرمساری کی
برف میں دھنسے دے رہا ہے
میں نے تو ہوا کے پروں پر بھی
"لے کے رہیں گے پاکستان" لکھا تھا
میرے زمانے میں تو تتلیوں نے بھی
میرے پرچم کا رنگ پہنا تھا
میں نے اپنی دہلیز پر آزادی کا دیا
اِس لیے رکھا تھا
کہ غلام قومیں اس کی روشنی میں
آزاد ہونا سیکھیں گی
وہ کون تھا
جو میرے گونجتے نعرے لے کر
زہرناک سرگوشیاں چھوڑ گیا ہے۔
میرے بچو!
میرے سچے لوگوں کے بچو
تم اپنی وراثت کو بھول کر
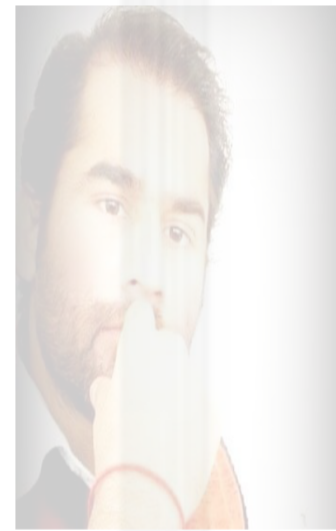
کب تک اپنے ضمیر کو جھٹلاتے
اور جھوٹے وعدوں کو پہنتے رہو گے
میرے بچّو !
مجھے تمھارے لفظ نہیں چاہئیں
پھٹی ہُوئی تصویر یا پھٹے ہوئے نقشے کی
تاریخ رقم کرنا، تمھارا مقدّر نہیں ہے۔
میری بنتی سُنو !
مجھے میرے سفید بالوں کا وقار واپس لوٹا دو
مجھے میری کوکھ میں پلنے والا امن واپس لوٹا دو
اُٹھو میرے بچّو ! میں تم سے مخاطب ہُوں
ماں ! بھلا اور کس سے بات کر سکتی ہے !

٭
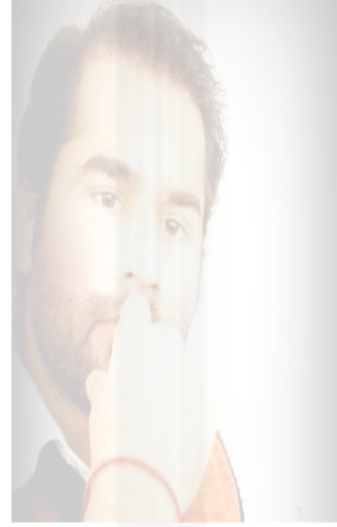
نیلسن منڈیلا — آزادی تیرا نام

وہ کہکشاں سے اُترا تھا کہ جیل سے باہر آیا تھا
وہ جب باہر آیا تو ہزاروں ستاروں جیسی
چمکتی آنکھوں نے اس کو چُوما تھا
ہوا اُس کی آزادی پہ رشک کر رہی تھی
اور سُورج کو اپنا جلال ماند نظر آ رہا تھا۔
وہ اندھیرا جو ظالموں نے اُس کی قوم پہ مسلط کیا تھا
وہ اندھیرا اب ان ظالموں کے حلق میں اُتر رہا تھا

اُسے ۲۷ برس اندھیرے میں بٹھایا گیا
مگر روشنی نے اُس کے آنے کا انتظار کیا۔
اُسے ایک عمر موت سے ڈرایا گیا
مگر زندگی نے اس کی دہلیز پہ بیٹھے رہنے کا عہد کیا۔
اپنے ہی وطن میں اُسے ان لوگوں نے قید کیا
جو چُوہے دانوں میں چھُپ کر، اس کے وطن کے لوگوں کے
حصّے کی روٹی کھا رہے تھے۔
خون ــــ جتنا بہہ سکتا تھا، بہا
رات ــــ جتنی ٹھہر سکتی تھی، ٹھہری
خوف ــــ جتنا اُبھر سکتا تھا ــــ اُبھرا
مگر اُس کے ہاتھ میں صبر کی تلوار تھی
جس کی دھار بہت تیز تھی۔
اُسے خبر تھی کہ زندگی نے
اس کی دہلیز پہ بیٹھے رہنے کا عہد کیا ہے۔

وہ جیل سے باہر آیا
تو اس کی عمر کے پہناوے پہ
ایک بھی شکن نہیں تھی
پرندوں کو اُڑنے سے روکنے والوں کے
دن لد چکے تھے
آزادی خوش تھی
کہ اب اس کو ایک نام مل گیا تھا۔

✤

ماتم کی آواز

(فیض صاحب کے لیے)

ماتم کی آواز نے میرا سارا وجود پہنا ہوا ہے
اور میرے اندر پرچھائیاں بھی معدوم ہونے لگی ہیں
میرے خوابوں نے طلوع ہونا
اور میری تعبیروں نے زندگی پانا چھوڑ دیا ہے
شام اور رات کے بیچ
اندھیرا لانے والی پرچھائیں کو کس نے دیکھا ہے
مگر وہ تو بھری دوپہر تھی!
سورج ہمارے وجود کو ننگا کر کے
ضرب لگا رہا تھا
ہم کہ جنھیں بہت مار کھانے

بہت ذلتیں سہنے
اور بہت ہزیمتیں برداشت کرنے کی عادت ہے۔
ہم اپنی تمام تر بزدلی کی وراثت کے باوجود
شہر کے دوسرے کنارے سے آنے والی
رونے کی آواز میں آواز ملا کر
رو رہے تھے۔
ہمارے بے آواز ہونٹ
بے شباہت چہرے
اور بے سماعت کان
بے بدن ہوا کی طرح
دشتوں کے کواڑ پیٹ رہے تھے۔
ہمارے سینوں کی آبائی بستیوں کا مکین
ہم سے رُخصت ہو رہا تھا
ہمارے لڑکپن کو اُس نے
خواب آشنا کیا تھا
اور ہمارے خوابوں کی مانگ میں
تعبیر کا سیندور بھی اس نے ہی لگایا تھا

اس زمین کی فصلوں کے قہقہوں سے
اس کی آنکھیں جاگتی تھیں
اور اس زمین کی کھلی ہوئی کھڑکیاں
اسی کے لیے روشنی تھیں
وہ نہ مانگتا تھا، نہ التجا کرتا تھا
وہ نہ وحشتیں پہنتا تھا
نہ جنوں بوتا تھا
اس کی صحراؤں سے بھی شناسائی تھی
اور دریاؤں سے بھی
اس کو سناٹوں سے بھی بات کرنی آتی تھی
اور طوفانوں سے بھی
ہمارے اعمال کی سیاہیاں دھونا
اور ہمارے بیمار امروز کی مسیحائی کرنا
اس کا شیوہ تھا۔
یہ زمین کہ جس نے نفرتیں پہنی ہوئی ہیں
اس کی محبت کی قبا کھینچ لی گئی ہے۔
یہ زمین کہ جس کی بنجر مٹی

سوکھی ہڈیوں کو جنم دیتی ہے
اس کی زندگی کی خواہش دفن کر دی گئی ہے۔
سمندروں کی گہرائیاں بھی،
اب ہماری آنکھوں میں آ جائیں
تب بھی ہم اُسے نہیں ڈھونڈ سکتے ہیں
ماتم کی آواز نے ہمارا سارا وجود پہنا ہوا ہے
اور ہمارے اندر پرچھائیاں بھی معدوم ہونے لگی ہیں

✣

فیض صاحب کے لیے

یہ طبلِ کوچ کا ہے

زخم نے پھر مرے ہاتھوں پہ حنا باندھی تھی
درد کے کاسنی پازیب بجاتی ہوئی
وحشت میں جنوں چھانکتی
ژولیدہ ہوا کہتی تھی ،
خواہشِ خواب
ہزیمت کا بدن پہنے ہے
سانس کے چھپتے چہرے کی ردا
کھینچے ہے
کوئے لاحاصلی
کھینچے ہے حصارِ فرقت

قافلہ دیکھے ہے سرمایۂ جاں لُٹتا ہے
کیسی ساعت ہے رفاقت کا دیا بجھتا ہے
یہ طبل کوچ کا ہے
یا کہ ٹھہر جانے کا
یا چراغِ شبِ اُمید کے بُجھ جانے کا

❖

چڑیاں بھول جاتی ہیں کہ اُن کو پکڑنے کے لیے جال لگایا جاتا ہے

اپنی جیسی عورت وزیراعظم سے مکالمہ

مَیں باغ کی راکھی ہوتی میّا
مجھے باغ پہ حق بھی دو میّا

مرے بازو نیلو نیل ہیں سب
مری آنکھوں میں سوئیاں ہیں چُھپی
مرے ہونٹوں پہ ہیں زخم سجے
مرے پاؤں میں چھالے ہیں بہت

مَیں کیسے بھولوں اے میّا
وہ کوڑے جو میری کمر پہ ہیں
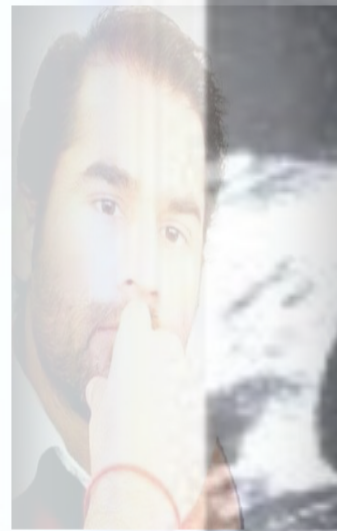
وہ قید جو میرے وجود پہ
سانپ سنپولے بن بیٹھی

وہ سارے فیصلے یاد مجھے
جو نام پہ مذہب کے آئے
جو میری گواہی پہ چھائے
جو نام شریعت کا پائے
جو حق و صداقت کہلائے
جو زخم لگے، الزام آئے

تمھیں یاد دلاؤں اے میّا
وہ ہاتھ سلامت ہیں اب تک
جن ہاتھوں نے سنگسار کیا
مرے ننھے پھول سے بچّوں کو
جن ہاتھوں نے چادر چھینی
مری بہنوں کو زد و کوب کیا
جو چاٹ گئے دیواریں بھی

جو بیچ گئے ذرّہ ذرّہ
جنھیں لاج نہ آئی مٹی کی۔

تمھیں یاد تو ہوگا اے میّا
کیا جیل بنے تھے گھر اپنے
کیا اُجلے تن دُھندلائے تھے
ہم اپنے دیس میں بے گھر تھے
ہم بے قیمت کہلائے تھے۔

تمھیں یاد تو ہوگا اے میّا
جو حشر اُٹھے جو گھر اُجڑے
جو مقتل میں جاں ہار گئے
خوں ان کا کم عظمت تو نہ تھا
جاں ان کی بے ہمّت تو نہ تھی
ان سب کی گواہی لے کے میں
ان سب کی دُھائی لے کے میں

یہ تم کو جتاؤں اے میّا
مت بھولنا تم پہ قرض ہے یہ
مت بھولنا تم پہ فرض ہے یہ
میں باغ کی راکھی ہوئی میّا
مجھے باغ پہ حق بھی دو میّا !

✣

کھیل سرائے

تم سوامی رام بنے میرے
تم مجنوں قیس بنے میرے
کبھی کھیل لیا، کبھی چھوڑ دیا
کبھی پچکارا، کبھی دھتکارا
کبھی پہنا، مَسلا، پھینک دیا
کبھی پچھواڑے میں داب دیا
کبھی ہاتھ پہ مہندی دکھلا کر
مرے چہرے پہ ہلدی ملدی
کبھی بیگم نام پہنوا کر
مری ذات کٹھولی گم کر دی

تم سوامی، مجنوں یاد کرو
جب صحرا صحرا دوڑایا
مری ایڑی سے چشمے پھوٹے
جب عیب لگا کر دھتکارا
مری کوکھ پیمبر بن دکھی
جب ویشیا کہہ کے پلٹے تھے
مرا بستر عمر تمھاری تھی

تم سوامی مجنوں پل بھر کے
دنیا کے تماشے میں تم نے
مجھے جائے نماز سی عزت دی
دنیا کے ترازو میں تم نے
مجھے ہیرے موتی قیمت دی
اس کھیل سرائے سے باہر
تم رشتوں کی ٹکسالوں میں
مجھے کھوٹا کہہ کے الگ کرو
تم شہوت کی دیواروں میں

مجھے عزت کہہ کے دفن کرو۔
مجھے چوکھٹ تھپڑ بپتا دو
مجھے مالک داسی رچنا دو۔
یہ کھیل سرائے بہت چلا
یہ سجدہ چوکھٹ بہت ہوا
وہ جل مرنا، چوٗلھے پھٹنا
یہ آگ تماشہ بہت چلا
یہ قیس قبا بے رنگ ہوئی
اس کھیل سرائے سے نکلو
تم میرے جیسے انسان ہو
مرے دوست بنو۔ مرے دوست بنو۔

ابھی موسم نہیں بدلا!

ابھی شادابیوں نے صبح کا آنگن نہیں دیکھا
ابھی دیوار و در سے خوف کے سائے نہیں سمٹے
ابھی حیلہ فروشی مکتبِ خواہش میں ٹھہری ہے
ابھی بھولی نہیں وہ داستاں جو ہم پہ گزری ہے
ابھی موسم نہیں بدلا۔

ابھی تو شہرِ جاناں میں طلسمِ رنگ پُوچھے ہے
زباں بندی کے صحرا سے نکل تو آئے ہو لیکن
سخن کے شعلۂ تائید کو ارزاں نہیں کرتے
نئے موسم کو حرفِ شوق کا عنواں نہیں کرتے
وہ موسم
جس میں تازہ کونپلیں ڈر کے نکلتی تھیں
ہر اِک گھر اور ہر اِک دہلیز پہ پہرا خزاں کا تھا
دُعا کے بادباں پہ نام بھی لکھا گماں کا تھا۔

وہ موسم
جس میں عفریتِ ہزیمت راج کرتا تھا
وہ کیا آسیب تھا جو اپنی گلیوں سے گزرتا تھا۔

نصیبہ ان پرندوں کا
کہ جو پردیس میں تھے اور یہ منظر نہیں دیکھا
پلٹ آئے ہیں صحنوں میں تو زخمِ در نہیں دیکھا۔

نئے منظر
گلابی کشتیوں کے قافلے کے
روشنی کی سیڑھیوں کے سلسلے کے
ان کو تائیدِ سفر دینے کو آئے ہیں

کہ ان کے ساتھ ہیں وہ شہر وہ رستے خیالوں کے
جہاں سُورج نہیں چھُپتا
جہاں دریا نہیں رُکتا،

مرے ترسے ہُوئے پیاسے، اُداسی آشنا چہرے
پرستانوں کے قصّوں کی طلب کرتے ہیں لیکن
یہ چاہتے ہیں
کہ اب، دیوار و در سے خوف کے سائے سمٹ جائیں
کہ اب، شادابیاں ٹھہریں
کہ اب، موسم بدل جائے۔

❖

HORSE TRADING

سنو اے بانوئے گُفت آشنا نیا قصّہ
سجا ہے اِک نیا بازار اِک نئی منڈی
طلب کرو تو کریں پیش جو بھی حاضر ہے
گھروں کے صحن سے لے کر وطن کی مٹّی تک
بنائے بیم و رجا کچھ نہیں فقط زر ہے
بنائے ہستیٔ بے مایہ ضربتِ زر ہے
طلب کرو تو کریں پیش جو بھی حاضر ہے،
ردائے لذّتِ شب، آرزو کی تہہ داری
کسی کی دلربا آغوش کی فسوں سازی
کسی کی خُوں میں نہاتی ہُوئی نگہداری،

طلب کرو نئے پیماں کی خوش خبر کے لیے
سلامِ نسبتِ فردائے منتظر کے لیے
خجل نہ ہو کہ سیاست کی شعلگی ہے یہی
قصیدہ خوانی کی قیمت ہُوا ہی کرتی ہے
عجب نہیں ہے کہ یہ قیمتِ فرومایہ
تمھارے چُھنتے خوابوں کو زندگی دے دے
زباں کا کیا ہے کہ اس کا کہا تو بدلا ہے
طلب کرو تو کریں پیش جو بھی حاضر ہے
گھروں کے صحن سے لے کر وطن کی مٹی تک۔

⁂

چارج شیٹ ۱۹۹۰

میرے دروازے پہ چڑھی کنڈی کھول دی گئی ہے
مگر دروازہ اب بھی بند ہے۔
مری آنکھوں پہ بندھی پٹی اُتار دی گئی ہے
مگر نظر کچھ نہیں آتا ہے۔
مرے ہونٹوں پہ سے مہریں ہٹالی گئی ہیں
مگر بولنے کا ہُنر مجھے بھول گیا ہے۔
مَیں آزاد ہُوں کہ قید
مَیں خوش ہُوں کہ آزردہ
میرے سر پہ چادر ہے اور بدن برہنہ ہے۔
میرے سر پہ تاج ہے اور پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔
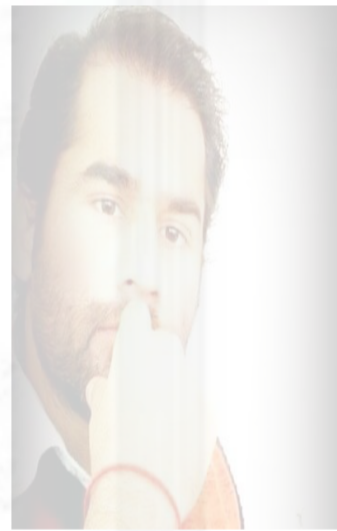
زنا سے لے کر آدھی گواہی تک
سب دشنام ، میرے نام
اور یہ انعام میرے نام
کہ میں شہر میں داخل ہونے والی پہلی عورت ہوں
کہ جس کے سر پہ تاج رکھا گیا ہے ۔
میں آزاد ہوں کہ قید
زنا سے لے کر آدھی گواہی تک !
میری چارج شیٹ بہت لمبی ہے ۔

٭

اکیسویں صدی کے دوراہے پہ پتھر شہزادی

کہانیوں کی شہزادی کی طرح
میں نے ۳۸ سال کی عمر میں آنکھ کھولی تھی ۔
پھول ، حرف ، محبت اور چراغ
میں نے اپنے چاروں پلوؤں میں باندھ لیے تھے ۔
قدم قدم بجھتی آنکھوں کے فرش نے زمین دھندلا دی تھی
اور آسمان پہ صرف میرے عروج کا ستارا دکھائی دیتا تھا ۔

میں سوچنے لگی تھی کہ ہوا مجھ سے پوچھ کر خرام کرتی ہے
آسمان پہ صرف میرے عروج کا ستارا دکھائی دیتا ہے
اور پانی میری رضا سے راستہ تلاش کرتا ہے ۔
کہانیوں کے طلسمی قصّہ گو ، میرے گرد تھے
وہ مجھے بار بار جادُو کی چھڑی کی طرح
ہاتھ ہلانے کو کہتے ۔
وہ سانس کی طرح میرے اندر خوشامد
داخل کرتے چلے گئے
مجھے اعتبار کی گلیوں سے دُور
کٹھ پتلیوں کے دیس میں لے گئے ۔

طلسمی قصّہ گو مجھے کہانیوں کی شہزادی بنا رہے تھے
مجھے ان نامانوس گلیوں کا سفر ذائقہ دینے لگا تھا
مجھے کسی دیوار پہ کوئی چھپکلی ، کسی زمین پہ کوئی سانپ
نظر نہیں آتا تھا
ہر طرف میرا عکس تھا اور مَیں تھی
ہر طرف میری آواز تھی اور مَیں تھی

مَیں سوال کی دہلیز پہ پہنچی تو قصّہ گو میرے ساتھ نہیں تھا ،
مَیں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو پھر مَیں نہیں تھی
کہانیوں کی شہزادی کی طرح
مَیں نے ۴۰ سال کی عمر میں آنکھ بند کر لی تھی
قصّہ گو ، جادُو کی چھڑی سے نیا جال بُن رہے تھے !

٭

۲۴ - اکتوبر ۱۹۹۰ [لہ]

میں کروٹ بدلتی ہوں
تو کلاشنکوف میری دائیں جانب پڑی ہے۔
میں ہڑبڑا کر اُٹھ جاتی ہوں
یہ کیسی سائنسی ترقی ہے جس نے
میرے بچے کو کلاشنکوف میں بدل دیا ہے۔
میرے ہاتھ بلا ارادہ اُسے اپنی گود میں لے لیتے ہیں
دروازے پہ بنا دستک دیے بہت سے سائے
داخل ہوتے ہیں
میں بولنے کی کوشش کرتی ہوں، آواز نہیں نکلتی ہے
وہ سب سائے کلاشنکوف کے ذریعہ بات کرتے ہیں۔
میری سمجھ میں ابھی یہ بات نہیں آتی ہے

لہ ۔ پاکستان میں عام انتخابات کا دن

میری آنکھیں چراغ ڈھونڈتی ہیں
بات ڈھونڈتی ہیں، زبان ڈھونڈتی ہیں۔
میری گود میں کلاشنکوف ہے
میں اُٹھ کر باہر جانا چاہتی ہوں
سائے پلٹ کر دروازے پہ تالا ڈال دیتے ہیں
اور کلاشنکوف کے ذریعہ بتاتے ہیں
بیلٹ بکس، سیاست اور آزادی
یہ تمھاری میراث نہیں۔
اپنی گود میں رکھی کلاشنکوف سے بھی مت ڈرو
کہ یہ خالی ہے۔
اس کی گولیاں ہم تمھارے حلق میں اُتار چکے ہیں
میں پھر ہڑبڑا کر اُٹھ جاتی ہوں
کلاشنکوف اب میری بائیں جانب بھی پڑی ہے۔

٭

خاموش آتش فشاں

ہماری تاریخ کا ہر ماضی حال بنتا جا رہا ہے
مارکوس کے ملک اور ہمارے ملک میں زمینی فاصلہ
چاہے جتنا ہو، گلیوں میں نکلے جانے والے
لوگوں کی تعداد ایک جیسی ہے۔
وفاداری کی شرط ایک جیسی ہے
سیاست ایک جیسی ہے۔

مارکوس کی سیاست پہ جنگل بھی رو دیے تھے
ہماری سیاست پہ، جنگل کے سارے درختوں کی
شاخوں پہ الٹی لٹکی چمگادڑیں بین کر رہی ہیں
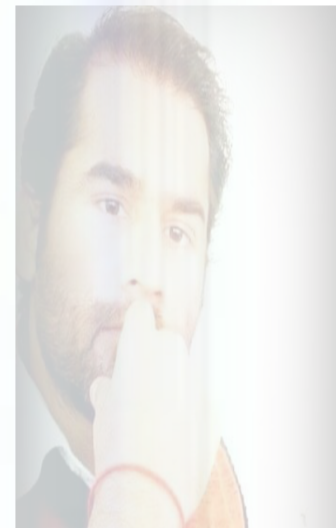
میرے ملک کی چھوٹی سی تاریخ
اس بڑے ماضی کا حصہ بن گئی ہے
جہاں ریت میں غلام دھنس جائیں
تو ان کی قبر نہیں بنانی پڑتی ہے۔

❖

میرے خواب بھی مجھے نہیں سمجھتے ہیں

مَیں تمھیں ہمیشہ اچھی خبر کی طرح مِلوں گی

تم ایک مرد ہو
ایک جوان مرد
تم بچپن اور الھڑپن کی
دہلیزوں سے گزر کر
اپنے ارادوں کی شاہراہ پر گامزن ہو،
تمھارے ہاتھ فیصلہ لکھنا جانتے ہیں
تمھیں معلوم ہے خواب دیکھنے کے لیے
کن آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے
تم جانتے ہو چمکتی آنکھوں کے نیچے
بہتی آنسوؤں کی لہر

مسکراہٹ بن کر کس طرح نقاب پوش ہوتی ہے۔

تم ایک مرد ہو

ایک جوان مرد

تم کہ بچپن اور الھڑپن کی دہلیزوں سے

گزر چکے ہو اور سمندر کو پہچانتے ہو،

تمھارے ہاتھ میرے ہاتھوں میں آکر

معصوم اور پاکیزہ پتیوں کی طرح

سمندر کی جانب سے آنے والی

بے رحم اور تیز ہوا سے

عافیت طلب کرتے ہیں۔

اب تم جھانکتے ہو مری آنکھوں میں

جانتے ہو کہ میری آنکھوں کی تحریر

تمھارے قدموں تلے، دعاؤں کے تعویذ

بچھاتی رہی ہے۔

پتیاں سوکھ جائیں تو ان کو ہرا کوئی نہیں کر سکتا ہے

میری آنکھوں کے نیچے

بہتی آنسوؤں کی لہریں

دعا کی پتیاں ہیں

انھیں سوکھنے مت دینا،

تم کہ جو بچپن اور الھڑپن کی

دہلیزوں سے گزر چکے ہو

اور سمندر کو پہچانتے ہو

یہ بھی پہچان لینا کہ جو آنکھیں سوکھ جائیں

ان صحراؤں میں دعا بھی اپنا گھر نہیں بناتی ہے۔

❖

حدِّ امروز گزشت

جوانی میں مائیں سوچتی ہیں
ان کا بچّہ، ان کی گود میں بوڑھا ہوگا۔
گود کہ جس کی آراستگی کا عمل
کھلونوں اور مٹھائیوں سے شروع ہوتا ہے۔
گود کہ جس کی برخاستگی کا عمل
بہنوپاز اور بیٹے کی مونچھوں سے شروع ہوتا ہے۔
تصوّف کی راہیں دکھانے والے
اور چلّہ کاٹنے والے
پیرِ حرم، پیرِ سنجر، پیرِ عجم
کسی نے بھی تو یہ منظر نہیں دیکھا،
کسی نے بھی تو ماں بن کے نہیں سوچا
بڑھاپے میں مائیں کیا سوچتی ہیں
زباں لرزد کہ معنی پیچدار است!

٭

مَیں تمھاری ماں ہُوں

ابھی کل تک
پگھلتی موم بتی کے ٹپکتے موم کی طرح
تم میرے بازوؤں سے پھسل پھسل جاتے تھے
اور آج
شمالی کوہساروں کے منظروں کی طرح
تم میری آنکھوں میں ٹھہرے ہُوئے ہو ۔
اُمیدوں کے چاند کے بڑھنے کے زمانے میں
تم پیدا ہُوئے
اور مرادوں کے چاند گھٹنے کے زمانے کو
تم اتنی جلدی قریب لے آئے کہ میں
تمھارا پورا نام ریت پہ لکھ بھی نہیں سکی تھی ۔
ریت پہ گھر بنانے کا مجھے کبھی شوق نہ تھا
مگر وہ نام کہ جن کے لکھنے کو جی چاہے
دل ان کو فراموش نہیں کرتا ہے
اور پھر تم !
میری کوکھ سے ، میرے بازوؤں اور پھر میرے قد سے
بہت اُونچی اُڑان پہ روانہ ہوئے
تو مجھے لگا
میری کوکھ پھر سے ہری ہو گئی ہے
اگلے جنم کے اس تصور کو بھی بھلا لوگ مانیں گے ۔

❖

بلا معاوضہ محنتوں کے معاوضے

بچوں کی پیدائش کے بعد
بچوں کو بڑا کرنے کی محنت
بچوں کو بڑا کرنے کے بعد
بچوں کی شادی کی محنت
بچوں کی شادی کے بعد
ان کے بچوں کو پالنے کی محنت
اور اس کے بعد
اور اس کے بعد!

٭

پہاڑ مسکراتے نہیں ہیں

پچاس سال سے زیادہ زندہ رہنے کی اذیت
پچاس سال سے کم زندہ رہنے کی اذیت جیسی نہیں ہوتی ہے۔
صرف اپنے بال، چہرہ اور بدن ہی
رنگ اور ہیئت بدلتے تو شاید محسوس نہ ہوتا،
نظر تو یہ آتا ہے کہ دوسروں کے چہرے
اور ان چہروں پہ لگی آنکھیں
جس طرح رنگ بدلتی ہیں
وہ شاید پچاس سال سے پہلے
ممکن نہ تھا۔

پچاس سال سے پہلے یہ بھی ممکن نہ تھا
کہ ماں باپ کی انشورنس اور پنشن کی

رقم ہاتھ لگنے کے انتظار میں جوان ہوتی
اولادوں کو ماں باپ بھی بُرے لگنے لگتے ۔
رُتبے کی اُڑانوں میں گرفتار بیٹوں کو
ماں باپ کو سرونٹ کوارٹر میں رکھنا پڑتا
اور خواہش کی دیوانگی میں آشفتہ اولاد کو
تعویذوں اور حکیموں کے ذریعے
ماں باپ کی زندگیوں کی گھڑیاں کم کرنے کے
طریقے تلاش کرنے پڑتے ۔

جن ملکوں میں بوڑھوں کے گھر نہ ہوں
وہاں بوڑھا ہونے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے ۔
بے جا قوانین کے اتنے طویل سلسلے میں
ایک قانون اور پاس کر دو ،
پچاس سال !
زندگی کی حدِ سفر ہوگی ۔

☆

میں "ہاں" کہہ کے سوئی تھی اور میری "نہ" نے مجھے جگا دیا تھا

○

مری آنکھوں میں دریا جھولتا ہے
یہ پانی اب کنارا ڈھونڈتا ہے

یہ پانی ریت کی تہہ سے گزر کر
تعلق ہے تو رستہ ڈھونڈتا ہے

سفر سے شاہزادے لوٹ آئے
دل ان کا نام لے کر پوچھتا ہے

ہتھیلی پہ لکھوں اور پھر مٹا دوں
وہ رشتہ جس میں ہنسنا گونجتا ہے

مرے ہی پاس تھا ٹھہرا ہوا وہ
مجھے ہی یہ حوالہ بھولتا ہے

وہ جس کے ساتھ تھے خیمے، سفینے
وہ راتوں کو اکیلے گھومتا ہے

تعلق کو نہ سمجھو جاودانی
یہ آئینہ ہوا سے ٹوٹتا ہے

ہماری پیاس رخصت چاہتی ہے
پیالہ ہاتھ سے اب چھوٹتا ہے

✤

○

دریا بھی تیز، خواہشِ دریا بھی تیز ہے
دامن کی لو خبر کہ زلیخا بھی تیز ہے

دریاؤں کو تو اپنے سفر کی خبر ہے بس
یہ جانتے نہیں کہ سفینہ بھی تیز ہے

آغوشِ خواب، دامنِ خواہش سے خوب ہے
گم گشتہ ساعتوں کا یہ نشّہ بھی تیز ہے

دامن بچے کہ جاں، یہ ذرا سوچنا نہیں
اس بار آگ تیز ہے، جلوہ بھی تیز ہے

مٹھی میں باندھ رکھو نجابت کے سلسلے
غارت گری کا قلزمِ خفتہ بھی تیز ہے

اس وقت میرے دیس کی عورت کے ہاتھ پہ
خاکستری ردائے بریدہ بھی تیز ہے

✣

○

وہی تصویر، نقشِ خواب میں ہے
کہ جس سے گفتگو مہتاب میں ہے

مَیں اپنے ہاتھ کاٹوں، اس کو دے دُوں
یہ دعوت، قیمتِ کمخواب میں ہے

رگوں سے پُوچھتی پھرتی ہے وحشت
یہ تائیدِ الم کس باب میں ہے

مری تصویر ہے میرا تحیّر
کہ خود سے گفتگو ایجاب میں ہے

مری وحشت تو آسودہ نہ ہُوگی
مری تمثال، میرے خواب میں ہے

بدل جائے کبھی رُت اور کبھی وہ
سخن کا ذائقہ اسباب میں ہے

مجھے ہی چھُو لنے والے بہت کیوں
گلابی آنکھ کی محراب میں ہے

مری حیرت مجھے زندہ رکھے گی
کہ دائم یہ تماشہ خواب میں ہے

بدل لو راستہ، وہ پھر وہیں ہے
یہ رشتہ پھر کسی گرداب میں ہے

..

○

اس موسم کی پہلی بارش ہی سیلاب ہوئی
صحرا سے ڈرنے والوں کی شام عذاب ہوئی

فاختہ بھی، وحشت پہنے تھی، بلبل بھی چپ تھی
کس بارود کی بو تھی جس سے بستی آب ہوئی

فرہادوں کو اوڑھنے والے چہرہ کھولیں کیا
یہ وہ آئینہ ہے جس میں شکل خراب ہوئی

سودا تھا جلدی چلنے کا، آنکھ بھی رکھنی تھی
ان نیزوں پہ جن کی کماں گردن محراب ہوئی

آنکھ کو خواب ملیں اور سائے کو انسان ملیں
ورنہ یہ ساری بستی تو محروم آب ہوئی

ہونٹوں پہ اندیشے رکھے، بول سکو گے کیا
پوچھ سکو گے دیس کی مٹی کیوں زہراب ہوئی

اس دیوار کی پچھلی جانب پھولوں کی خوشبو
پوچھ رہی ہے اس آہٹ کا جو سیماب ہوئی

○

دلوں میں لہجۂ غربت کی پیاس رکھی نہیں
بہت دنوں سے یہ وحشت بھی پاس رکھی نہیں

کسی کے حرفِ تر و تازہ کے جلو کے لیے
نصابِ خواب میں شامِ اداس رکھی نہیں

اُسی کے منظرِ جاں کو طلب شناسا کر
وہ زندگی کہ جو خواہش قیاس رکھی نہیں

رکھا ہے دل کو بھی بے مدعا تری خاطر
کہ تیرے سامنے رسمِ حواس رکھی نہیں

سکوں میں بھی تھے مثالِ نسیم بے پردہ
جنوں میں حیرتِ دریا لباس رکھی نہیں

کسی نے قلزمِ جاں پی کے آنکھ صحرا کی
کسی نے قطرۂ خواہش کی آس رکھی نہیں

❖

○

دشوار تھا اس در کو حذر کہہ کے گزرنا
اس منزلِ جاناں کو سفر کہہ کے گزرنا

دیکھے ہوئے منظر کو دکھاتا ہے وہ لیکن
ممکن ہی نہیں خوابِ دگر کہہ کے گزرنا

بوسے بھی نہ تھے اس کی محبت کی ادا میں
جی چاہے اُسے عشق اثر کہہ کے گزرنا

آنکھوں کو سکھاتا نہیں خاموشیٔ خواہش
بارش کو تمنا کا سفر کہہ کے گزرنا

یوں تو مِری ہوا کو بھی سند مان کے خوش تھی
یاد آیا ترے خواب کو گھر کہہ کے گزرنا

✻

○

اب وہی شہر نظر آتا ہے بدلا بدلا
جس نے اس قعرِ مذلّت کا تھا نقشہ بدلا

دشمنِ خواب بہت تھے سگِ اعدا بھی بہت
ایسے موسم میں تمنّا نے لبادہ بدلا

برف کے گھر میں چھُپے تھے پہ تپش تھی دل میں
اب کھُلے صحن میں دل کا بھی قرینہ بدلا

اذنِ گفتار نہ تھا جب تو سخن کرتے تھے
اب سخن کیجیے کیسے کہ ہے لہجہ بدلا

جو کماں دار کبھی خلق کے دشمن تھے بہت
فصلِ گل آئی تو صیاد نے چہرا بدلا

کچھ بھی بدلے پہ کبھی خلق کے دن بھی بدلیں
لوگ پوچھیں گے وگرنہ کہ بھلا کیا بدلا

٭

○

فراقِ یار بہت دیر کی منانے میں
کہ سارے حرف مٹے داستاں بنانے میں

کہو تپش سے کہ گزرے کہ اب نہیں تاخیر
ترے وصال کے موسم کے لوٹ آنے میں

یہ ہم کہ جن سے چلی اب روایتِ تازہ
سند تھی ہمتِ قاتل، کماں اُٹھانے میں

یہ دل گرفتگی کس نام سے رقم ہو گی
کہ یہ قیام کرے بھی تو آزمانے میں

تری ہی نسبتِ موہوم تھی کمندِ جنوں
ترے ہی ذکر سے رشتہ تھا شب سجانے میں

نسیمِ ناز تری جستجو قیامت ہے
پلٹ کے آ کہ یہ آنکھیں سنیں بہانے میں

٭

نہ کام آئی بساطِ سکندری اپنی
شنید و دید کے رستے ہی شب قدم بھی تھے

بدن میں اُترا تو تہذیبِ جاں ہوئی اپنی
وگرنہ دشتِ تماشہ کا رزق ہم بھی تھے

ملال اس کو بھی تھا اور اداس ہم بھی تھے
یہ کیسی پہلی ملاقات تھی کہ غم بھی تھے

گزشتنی کو ہواؤں نے بھی نہیں لکھا
لٹائے ہم نے تمناؤں کے حشم بھی تھے

سبھی کو پیاس بجھانے کا شوق رو کے تھا
وگرنہ شہر کے رستے نعیمِ غم بھی تھے

بں پہلے جنم میں رات تھی

مرتے ہوئے راج ہنس گایا نہیں کرتے

(نرودا)

نثری نظمیں

چلو کسی اور کانفرنس میں چلتے ہیں

میں نے اور تم نے یہ سلسلہ
یونہی وقت ٹالنے کے لیے شروع کیا تھا
تم بے رنگی کی منزل پہ تھے
اور میں بد ذائقی اور کثافتوں سے نالاں تھی
بے معنی مسکراہٹوں کا تبادلہ تو
کانفرنس میں بیٹھے دو بور لوگ بھی کر لیتے ہیں۔
یہ مسکراہٹ نہ تعارف کی علامت ہوتی ہے
نہ آگے جانے کی نوید۔
ہماری مسکراہٹوں کا اتصال اس جگہ ہوا
جہاں [illegible] پھیکے [illegible] موسم تھا
میرے ساتھ میری ادھڑی ہوئی [illegible] اور بوٹیاں تھیں۔
تمہارے ساتھ بے لفظ چاشنی کا موسم تھا۔
تم نے کبھی مجھے دیکھ کر ہاتھ نہیں ہلایا
کبھی بھاگ کے گلے نہیں لگایا
کبھی ایک ایک حرف کر کے

اپنا آپ میرے اندر نہیں اتارا
کہ تمہارے اندر، کبھی نہ بولنے والا شخص تھا۔
دوسروں کے آغاز کیے فقروں کو اپنا سمجھنے کی
تربیت لیے، تم اثبات میں سر ہلاتے رہتے تھے۔

ایک دن — جب میں نے کہا
"کل تم نہیں تھے، مگر ہر سایہ بے گمان
مجھے تمہاری آنچ دیتا لگ رہا تھا"
تم نے سر نہیں ہلایا
تم نے خود کو سائے سے وجود میں تبدیل کرتے ہوئے
آگ میں چٹختی لکڑیوں کا ذائقہ
میری زبان پہ رکھ دیا تھا۔
اور اس کے بعد — ہم نے ایک دوسرے کے تمام جنگل
تمام آسمان عبور کر لیے تھے۔
وقت گزاری کے ان ذائقوں میں
کہیں کہیں محبت شامل ہو گئی تھی
اس سوچ نے تمہیں پھر بے رنگی کی سمت
سفر کرنے پہ مائل کیا
اور مجھے بد ذائقی کی جانب۔
کچھ لوگ عید کارڈوں کی طرح

اچھے لگتے ہیں
مگر ان کے ساتھ رہا نہیں جا سکتا ہے۔
کچھ لوگ بستر، جسم، زبان اور
ذائقہ، سب ایک کر سکتے ہیں
مگر ان کو سمجھا نہیں جا سکتا ہے۔
اب جبکہ پھر برف پگھلنے کا موسم ہے۔
چلو کسی اور کانفرنس میں چلتے ہیں۔

دھوپ کی واپسی کا منظر

احتیاط کی دہلیز پر تم نے تعلقات کا دیا روشن کیا تھا۔
تمہیں تجسس تھا، زندگی سے بھرپور
عورت کے تجربے کا۔
تمہیں شوق تھا، خوابوں کو لفظ بنانے والے
جادوگروں میں بیٹھنے کا۔
تمہیں تلاش تھی ان چہروں کی،
جنہیں تصویروں میں دیکھ کر
کبھی رشتے جوڑ لیتے ہیں

احتیاط کی دہلیز پہ دیا روشن کرتے ہوئے
تم نے اس میں جذبے کا تیل نہیں ڈالا تھا۔
محبت کو یتیم بچے کی طرح
ذرا سا دلاسہ دیکر، چھوڑا نہیں جا سکتا ہے۔

فراموش کیا ہوا غم

ہر ملال آنسوؤں کی زکوٰۃ نہیں چاہتا ہے
وہ بھی زمانہ تھا کہ صرف ایک دفعہ
کسی کے مڑ کے نہ دیکھنے پہ
اداس ہو جاتے تھے، راتوں بھر جاگتے تھے
احوال لکھتے لکھتے صفحے بھیگ جاتے تھے
دیواروں سے درختوں تک
نام لکھتے لکھتے
ایک دم فاصلوں کی اوٹ نے عنابی بھر دی
ان فاصلوں میں زمین کے فاصلے شامل نہیں تھے
ذہن کے یہ سارے فاصلے ایسے پھیلے
کہ آنکھوں سے محبتوں کے لینس اتار کر
دنیا کو دیکھنا پڑا۔

آہٹیں تو اب بھی جگاتی تھیں
ہونٹوں کو بھولی مسکراہٹیں یاد کراتی تھیں
حرف کی ناؤ میں بیٹھ جانے کو اکساتی تھیں
اور دل بھی ٹھہر کر
آئینے میں دیکھے چہرے پہ اعتبار
کر لینا چاہتا تھا
آتی جاتی سانس کی طرح،

آتے جاتے چہروں کو
اپنی نامرادیاں سمجھ کر دفن کرتے کرتے
جب ہاتھ خاکستری ہوئے
تو ایک دفعہ خود کو آئینے میں دیکھا
اور اب نیا عہد نامہ تحریر کیا۔
"گفتگو کے رنگوں کو تو اڑ جانا ہوتا ہے
ان رنگوں کو اڑنے دو۔
جذبوں کے شعلوں کو خاک ہونا ہوتا ہے
ان کو خاک ہونے دو
دریا کی جس لہر کو تم نے چھوا تھا۔
وہ واپس نہیں آئے گی۔

خوف کی دستک

چھاتیوں سے لگے بچوں کو
لوریاں نہیں، گولیاں سن کر نیند آنے لگی ہے۔
گھروں اور گلیوں میں لاشے نہ دیکھیں
تو چیخ اٹھتے ہیں
بات کرنا بھولنے والے بچے، صرف چیخ سکتے ہیں۔

گھروں کے آنگنوں میں ہنسی نہیں
کبھی دھمکتے بوٹ ہیں،
کبھی نقاب پوش

انسان کیا ہوتا ہے
یہ بتانے کے لئے پچھلے زمانے کی تاریخ پڑھانی ہوگی
وحشتوں کے نگر میں تو نیند نہیں آتی ہے
بھلا خواب کیسے آئیں گے!
بے موت مرنے والوں کے نام تو
بے نام سپاہیوں کی فہرست میں بھی درج نہیں ہوتے ہیں۔

تلہ سے کراچی تک، کوکھ جنوں کو سنبھالتی مائیں
اپنی انگارہ آنکھوں کے علاوہ کیا دے سکتی ہیں
پوچھنے پر یہ بھی تو نہیں بتا سکتیں
مارنے والے دشمن کا نام کیا تھا۔

دیار غیر سے واپسی

جیسے کپڑے کا ایک تھان!
قمیضوں، سوٹوں اور رنگ برنگے
لباسوں میں تبدیل ہو جاتا ہے،
بالکل اس طرح ایک گھر کے پالے
سارے بچے، مختلف گھروں اور لہجوں میں
تبدیل ہو جاتے ہیں۔
اتنی خبروں اور انٹرنیٹ کے زمانے میں
وہ سب ایک دوسرے سے بے خبر رہنا چاہتے ہیں۔

کلرک کے بچے اور افسر کے بچے
ایک جیسے لباس نہیں پہن سکتے ہیں
ایک جیسی محبت نہیں کر سکتے ہیں۔
کبھی کبھی تو ایک دوسرے کو شناخت بھی
نہیں کر سکتے ہیں۔

میں جب دیکھتی ہوں
کلف لگے نیپکن کھولتے آج کے ہاتھوں کو
تو مجھے ٹاٹ پہ بیٹھا اس کا بچپن
یاد آجاتا ہے۔
میں محبت سے وہ دھندلا عکس
دھرانا چاہتی ہوں
وہ میری توجہ اپنی نئی ٹائی
اور تازہ ترین پروموشن کی جانب
موڑ دیتا ہے۔
میں کوری مٹی کے پیالے کی سوندھی خوشبو
کی بات کرتی ہوں
وہ وائن کا گلاس اٹھا کر
مجھے چیئرز کرتا ہے
وہ جانے پہچانے رشتوں اور زمین
کی سمت، لوٹنا نہیں چاہتا۔
ہاں وہ انجانے خدا کی سمت
لوٹنا ضرور چاہتا ہے۔
وہ پیشانی کے نیچے،
موجود آنکھوں کو،
کسی سے ملاتا نہیں ہے،

ہاں پیشانی کو زمین پہ جھکاتا ہے
اور پھر اسی تھان میں لپٹ کر
واپس وطن لوٹ جاتا ہے
جس پر، لباسوں میں تبدیل ہونے کا
موسم نہیں آیا ہے۔

اے میری قوم! میری بنتی سن!

میرا ملک ایک قانون کے ذریعہ وجود میں آیا تھا
انگریزوں کا قانون۔
انگریز، کہ اس نے جیسی لکیر کھینچی
اور انہیں دو ملکوں کا نام دیا
ہم نے اسے ویسا ہی قبول کر لیا۔

ہماری قوم، ہر بات اور ہر شخص کو قبول کر لیتی ہے
اس قوم نے آمروں کو قبول کیا
مجاوروں کو قبول کیا، نقالوں کو قبول کیا،
مگر قبول نہیں کیا
مولویوں کو قبول نہیں کیا۔
پگاڑوں اور بھیڑیوں کو قبول نہیں کیا۔
دعووں اور فتووں کو قبول نہیں کیا۔

اے میری قوم!
تیرے بزرگوں نے بھی انہیں قبول نہیں کیا تھا،
تیری عدالتوں نے بھی ان کا دفاع نہیں کیا تھا،

تیرے علم نے بھی ان کے تعویزوں کو نہیں پہنا تھا۔
اے میری قوم!
خبردار ان لوگوں سے
جو ان کو تسلیم کر رہے ہیں۔
ان کا دفاع کر رہے ہیں۔
ان کے تعویزوں کو پہن رہے ہیں۔

انہیں عورت سے نفرت ہے
گویا انہیں اپنی ماں اور اپنی بیٹی سے نفرت ہے۔
وہ عورت کی ہر شکل میں شہوت دیکھتے ہیں
اور یوں اپنے خوابوں کو آراستہ کرتے ہیں۔
دنیا پہ کوئی مصیبت آجائے
وہ نہیں بولیں گے
سارے ملک کے سارے افسر
راشی، شرابی اور بدکردار ہو جائیں
وہ نہیں بولیں گے۔
ہر ہر قدم پہ گلے کاٹے جائیں
لوگ خریدے اور بیچے جائیں
وہ نہیں بولیں گے۔
ہاں کوئی عورت، ہاتھ میں علم لے کے نکلے
فوراً بولیں گے۔
فوراً خارج کر دیں گے دائرہ اسلام سے۔
زندگی کے ہر انعام سے۔

اے میری قوم!
تو اسلام کے ان سودے بازوں سے پناہ مانگ
ورنہ شیخوں اور وڈیروں کے زنان خانے میں
ہمارے مستقبل پرورش پائیں گے۔
یہ لوگ ان کے خلاف فتویٰ نہیں دیں گے۔
اور ہمارے مستقبل کے بچے،
جب اپنے باپ کا نام نہیں بتا سکیں گے
تو ابابیلیں بھی ان کی مدد کو نہیں آئیں گی۔

یورپ میں نہ پکھلنے والی نظم

میں کبھی غم تھی، مجسم غم
بوسنیا میں روتی بلکتی عورتوں کو
دیکھنے سے پہلے

میں کبھی عورت تھی
مسلسل رونے سے پاگل ہوئی، بے لباس
بے پرواہ، بے حواس، پتھرائی ہوئی عورتوں کو
دیکھنے سے پہلے!

میں کبھی بھوک تھی
روانڈا میں اپنا ہی بول و براز کھاتی
صومالیہ میں اونٹوں کی کھال بھنبھوڑتی انسانیت کو
دیکھنے سے پہلے!

میں کبھی آواز تھی
قوموں کی برادری کو چمگادڑوں کی طرح
آنکھیں بند کیے
اور فنا کو بھی یہ منظر لرزتے ہوئے
دیکھنے سے پہلے!
اندھیرے، بے بسی اور بربریت کی اپنی اپنی بو ہوتی ہے
یہ بو ان قوموں کے لئے نہیں ہے
جو حق مانگنے والے آخری آدمی کے ختم ہونے کا
انتظار کر رہی ہیں۔

فاصلوں کا اتصال
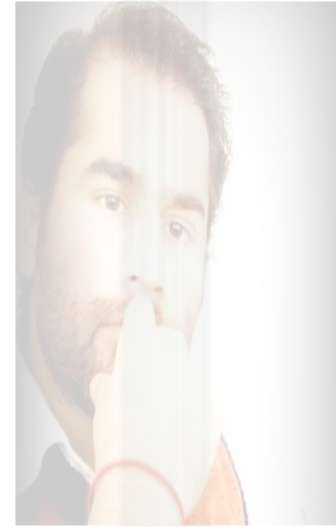
کبھی میں نے بوندوں کو آپس میں
لڑتے نہیں دیکھا۔
وہ ایک دوسرے کے پیچھے آتی ہیں۔
اور زمین کی پیاس کو نابود کر دیتی ہیں۔
میں نے دیکھا ہے، ہوا جب لڑتی ہے۔
طوفان بپا کر دیتی ہے۔
موجیں، جب ایک دوسرے پہ بھرتی ہیں۔
سیلاب کی طرح بہہ نکلتی ہیں۔
بادل تک اپنی مملکت چاہتے ہیں۔
وہ گرج کی طرح غراتے ہیں۔
اور بجلی بن کر ایک دوسرے کو ڈراتے ہیں۔
چاند اور سورج بھی ایک دوسرے کے مقابل
ہونے سے کتراتے ہیں۔
بس ستارے جو اپنے فاصلوں اور
دائروں سے نڈھال ہو کر، گر جاتے ہیں۔
یا پھر بوندیں ہیں۔
جو کبھی نہیں لڑتیں۔
ایک دوسرے میں تحلیل ہو جانا ہی
ان کی زندگی ہے۔

مراجعت

زندگی کا اگلا ورق پلٹتے ہوئے۔
تم نے میری آنکھوں میں صحرا بو دیے۔
میری پلکوں کو دیواروں کی طرح ساکت کر دیا۔
میری پتلیاں، ہتھیلی کے چھاؤں کی طرح
پانی سے بھر گئیں۔

سامنے نئے در و بام بے شمار لئے۔
تم کھڑے تھے۔
جہاں جہاں میری آنکھوں، میری پلکوں
اور میرے ہاتھوں کے نشان تھے۔
تم وہاں وہاں کیلیں ٹھونک رہے تھے۔
نئے چہروں اور نئی تصویروں کو آویزاں کرتے ہوئے۔
تم کتنے شاداب لگ رہے تھے۔

میں پہلے جنم میں رات تھی

جب تم میری سمت آتے تھے
تو میں تمہیں خوفزدہ کر کے، بھگا دیتی تھی
اور بستر میں لیٹ کر تمہارے بارے میں
سوچتی رہتی تھی۔
رات نے یہ دیکھ لیا تھا
اس نے مجھے روکا تو نہیں
ہاں اس ٹوہ میں لگ گئی
کہ میں اپنے تصور کے پیکر سے وصال چاہتی ہوں
کہ تم سے!

رات جب بھی آتی
میری نیند کو سوچ میں بدل جاتی۔
رات بھی ہوشیار ہو گئی تھی
اسے جیسے ضد ہو گئی تھی
میرے خود آراستہ طلسم کو توڑنے کی۔
رات نے وہم اور طلب کو میرے اندر آسیب کی طرح اتار دیا۔
اور مجھے، تصور کی آبادیوں سے بھی دور لے گئی۔

ماں کی ساری دعائیں ساری پھونکیں
ساری آیت الکرسیاں، میرے اندر کے ویرانے کو
نیند کی آغوش میں نہیں بدل سکیں
شاید میں پہلے جنم میں رات تھی!

مگر اس جنم میں تو
باتوں کے کٹورے بھرے بھرے رہتے تھے۔
جسموں کے صنوبر، ہلکورے کھاتے ہوئے
بے اماں نہیں لگتے تھے۔
وصال کی دہلیز پہ
تمہاری خواہش میں
کہیں بھی حکم کا پہناوا نہیں ہوتا تھا۔
رات بھی موتیے کی خوشبو
پہن کر آتی تھی۔
کبھی بستر بے تعلقی کا صحرا
نہیں لگا تھا۔
اُس جنم میں رات میری سہیلی تھی
اور اس جنم میں رات
میرے مقابل کھڑی ہے!

صفحہ پلٹتے ہوئے

ایک عمر کے بعد
ہماری مائیں اور ہمارے باپ
الگ الگ صحنوں اور الگ الگ کمروں میں
بنا کسی تلاطم کے منتقل ہو جاتے تھے۔
زندگی کے ذائقے میں کچھ اور جھلکنے لگتا تھا۔
کبھی نمازیں، کبھی کراس پزل،
کبھی اخباروں کے نام خطوں کا سلسلہ

اب ڈبل بیڈ والے کمروں میں
آتمائیں، ٹی وی سیٹ کے سامنے
بانٹنے لگتی ہیں
اور بچے، دوسرے ٹی وی پہ
زندگی کے گیت سن کر، قہقہے لگاتے ہیں۔

غیر متوقع ترازو

میں نے دیکھا
نہ لکڑی تھی اور نہ کوئی ساز و سامان
پھر بھی مفاہمت کی کشتیوں پہ ایک پل تعمیر ہو چکا تھا۔
گزرنے والے گزر گئے تھے
اور گرنے والے گر بھی گئے تھے۔

میں نے دیکھا
نہ کوئی ہاتھ تھا اور نہ کوئی عصا
پھر بھی چند لمحوں میں ترازو، بے وزن ہو گیا تھا
صرف دیواریں رہ گئی تھیں
عمامہ بے توقیر ہو گیا تھا۔

میں نے دیکھا
نہ کوئی لبلبی دبانے والا تھا اور نہ بندوق
پھر بھی مچانوں اور خندقوں میں

طبل و علم کی دھمک کی جگہ
کھنک سنائی دے رہی تھی۔
کھلونا بندوقوں سے بھی
سنہرے روپہلے ورق نکل رہے تھے۔

میں نے دیکھا
حرف بے لباس ہو کر بھی، ملول نہیں تھے
کفن بھی نہیں مانگتے تھے
صرف ایک سوئی کے طالب گار تھے
تاکہ حرف اور ہونٹ کا رشتہ مٹا سکیں۔

تعلق کی بے سمتی

میں بجھا ہوا چراغ ہاتھ میں لیے۔
تمہارا خط پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔
ماچس جلاتی ہوں۔
چراغ کے بجائے، انگلی جل جاتی ہے۔
ٹہنی سے پھول توڑتی ہوں۔
پھول پتیاں، پتیاں، بکھر جاتا ہے۔

آنکھ بند کرتی ہوں۔
خواب دیکھنے کو
مجھے اپنا آپ، خالی سوٹ کیس میں رکھا نظر آتا ہے۔
سوٹ کیس کی نچلی سطح پہ
بہت سے پنجوں کے نشان ہیں۔
کہیں بھی پورا پیر نہیں، پورا قدم نہیں۔
میں ایک نشان پر انگلی رکھتی ہوں۔
میری کھال ادھڑ جاتی ہے۔

اوپر دیکھتی ہوں۔
بادل سرخ نظر آتے ہیں۔

اوپر سرخ بادل
سامنے بکھرتے، سرخ گلاب
پیچھے سے آتی خون کی لہر
اور بندوق کی آواز
میں اداس ہو کر بھی، گھر پہنچ جاتی ہوں۔
دروازہ خود کھولنا ہو تو انتظار کی خواہش
فنا ہو جاتی ہے۔

خداؤں سے کہدو

جس دن مجھے موت آئے
اس دن بارش کی وہ جھڑی لگے
جسے تھمنا نہ آتا ہو
لوگ بارش اور آنسوؤں میں
تمیز نہ کر سکیں۔

○

جس دن مجھے موت آئے
اتنے پھول زمین پر کھلیں
کہ کسی اور چیز پر نظر نہ ٹھہر سکے۔
چراغوں کی لویں، دیے چھوڑ کر
میرے ساتھ ساتھ چلیں
باتیں کرتی ہوئی
مسکراتی ہوئی۔

○

جس دن مجھے موت آئے
اس دن سارے گھونسلوں میں
سارے پرندوں کے بچوں کے پر نکل آئیں
ساری سرگوشیاں جلترنگ لگیں
اور ساری سسکیاں نقرئی زمزمے بن جائیں

○

جس دن مجھے موت آئے
موت میری اک شرط مان کر آئے۔
پہلے جیتے جی مجھ سے ملاقات کرے
مرے گھر آنگن میں میرے ساتھ کھیلے
جینے کا مطلب جانے
پھر اپنی من مانی کرے

○

جس دن مجھے موت آئے
اس دن سورج غروب ہونا بھول جائے
کہ روشنی کو میرے ساتھ دفن نہیں ہونا چاہیے۔

ازل سنیاس

بادلوں سے اوپر جا کر بھی
تم میرے ماتھے پہ قدم جما کر رکھنا چاہتے ہو
آسمان میں اڑتے کبوتروں کو
میری آزادی کا آئینہ سمجھ کر
ہاتھ میں بندوق اٹھا لیتے ہو۔
رات کے آخری پہر میں
ڈوبتے ستاروں کو دیکھ کر
تمہاری تمنا ہوتی ہے کہ
میرا وجود بھی یونہی کہیں چھپ جائے۔
حالانکہ تم جانتے ہو۔
زمیں کی سمت تمہیں واپس آنا ہے
اور میرے ساتھ اس زمین پر
اس وقت تک رہنا ہے
جب تک ہم دونوں کے وجود
کہیں اور چھپ نہیں جاتے۔
مت کڑکو بجلیوں کی طرح
بارش ہو
زمین پیاسی ہے!

باداموں کے درختوں کے سفید روئیں

آزاد نظمیں

حاکم زادی — تو مجھ جیسی

مجھے آگ لگے
مرا مست جوبن جل راکھ ہووے،
ترا کیا جاوے
ترا کیا رہوے
تجھے کیا اس سے
ترا گھر آنگن
ترا تاج سلامت
تجھ کو کیا
کس گھر کے سارے پوت
اجاڑوں کے راکھی
مجھ بخت جلی کے آنگن میں
خوں کھیت ہوئے۔

میں کیسی ابھاگن رکھوالی
میں نے سونپا
ان خون جزیرہ بدنوں کو

اس مٹی میں
جس مٹی نے
مجھے عزت اور حفاظت کی آوازوں سے
نہلایا تھا

ترا تاج سلامت
تجھ کو کیا
ترا کیا جاوے!
مجھے آگ لگے،
مرا تن اگنی، مرا من اگنی
مجھے آگ لگے، تب سینے کی مری آگ بجھے۔
دنیا کے تماشے کے منصف خاموش رہیں
مجھے آگ لگے
باتوں کے ہرن آزاد رہیں
مجھے آگ لگے
ترا تاج سلامت
تجھ کو کیا!

کتھئی شام سے پہلے

بہت بھیس بدلے،
کبھی آنکھ چشمے کی صورت میں پہنی
کبھی خواب کو رت جگوں کا تماشہ کیا۔
کبھی پاؤں دیکھے تو ایسا لگا،
جیسے کب سے مسافت کی آندھی
اڑائے پھری ہے۔

وہ کیا بھیس تھا
جب محبت چنبیلی کی تھالی اٹھائے
بے تکاں چلتے چلتے،
کبھی آہٹوں پہ رکی تھی۔
ہر اک طاقچے میں کہیں پھول رکھتی
کہیں بس ہتھیلی کا مس بانٹتی،
کچی دیوار تھامے ہوئے
تاج پوشی کی آسودگی کو سنبھالے

انا کا تصور پہن کر
بہت مطمئن تھی۔

وہ کیا بھیس تھا
جب مصاحب نے ہر بادشاہ کی قبا
خود پہن کر کہا
"بے زمیں حکمرانوں کی بے شرمیوں کو
چھپاتے چھپاتے
بدن بے قبا ہو گئے ہیں۔

سیم و زر نے بہت قمقموں کو سجایا
مگر آنکھ میں ہر کرن بجھ گئی
ایسی کائی جمی کہ حیا بجھ گئی
بے لباسی سے وحشت زدہ ہو کے
گھر کی چھتیں اڑ گئیں
ہم بے زمیں، بے اماں
بادشاہ کی قبا میں بھی عریاں رہے۔

وہ بھی کیا بھیس تھا
عشق کہہ کے لکھا نام دیوار پہ،
چھت کی نیچی منڈیروں کی پرواہ نہ کی۔

ہاں وہی نیم سرگوشیاں
ٹیلی فونوں میں گھلتی رہیں۔
گاڑیاں تھیں کہ چلتی رہیں۔
ائرپورٹ پہ صرف آنکھوں کا ملنا
بہت وصل پیکر بنا
کبھی خوشبوئیں ہاتھ میں تھیں،
مگر وہ طلوعِ بدن، لوحِ محفوظ میں
بے بدن ہی رہا۔

ہر اک بھیس نے چپکے چپکے
مرے خواب
آتش زدہ کاغذوں پہ رکھے اور کہا،
"اب بہاروں میں نکلو
تو شادابیوں کو بتانا
وہ کس بھیس میں تم سے آ کر ملیں
کہ تم جانتی ہو ہر اک رنگ کی پردگی کو!"

عدل، عدالت، رات اندھیری

رنگ ہمارے آنگن میں بس رنگ نہیں تھے
خواہش اور تمنا کے پیکر بنتے تھے۔
اجلی اور گلابی رنگت
میرے تمہارے جسموں جیسی
دھوپ مہکتی لگتی تھی۔
نیلی تیرتی رنگت کی دہلیز پہ
آ کر تھکے کبوتر
ہنس پڑتے تھے۔
لال اور پیلے رنگوں نے تو
مہندی اور گلال مہکتے
وصل گھڑوں کا کورا پنڈا پہنا تھا۔

کالے سیاہ رنگوں کو ہم نے
خواب قبا پہنائی تھی۔
ہم نے گھور اندھیروں کو بھی
صبح قرینہ سمجھا تھا۔
ہم نے سمجھا سیاہ عمامہ،
قرضِ عبادت اور صداقت کا منبع ہے۔

ہم نے کچہری کے دالان میں
لہراتے سب کالے چغوں کو
زہرِ عداوت کے تریاق کی شرط کہا تھا۔
ہم نے چہروں پہ ٹھہرے کالے رنگوں کو،
حضرت بلال کے صدقے کا تعویذ سمجھ رکھا تھا۔

سارے خواہش اور تمنا کے پیکر،
سارے لہجے، سارے تحیر
سارے لپکتے جذبے، خاکستر لگتے ہیں
منبر اور عدالت بھی عنقا لگتے ہیں۔

کس رنگت سے خواب زکوٰۃ کی بارش مانگیں
سُرسی چُپی کالی رنگت،
وحشت پہنے،
قاتل لہجے میں گویا ہے۔

نوحہ گنگ شہزادی کا

ترے بخت میں تخت لکھا ہوتا
تجھے بن خوشبو کے پھول ملے
ترے گھر آنگن آکاس کی بیل
تری دل دیوار پہ کائی ہے۔

تو کس آنگن کی پالی تھی
کہ لالچ تیری گود بنی
کہ مکر ترا پہناوا ہوا
کہ نخوت ہی محبوب رہی
ترے ہونٹوں کو
تری آنکھوں کو

تو صحن وراثت کی پالی
جاگیر سمجھ، دنیا دیکھی
تو میرے وطن کے لوگوں سے
ہاں ربڑ کھلونا سا کھیلی

بندر کے تماشے کی طرح
تری، ڈور، نکیل نہ تھی بس میں
بے فیض ریاست کا قصہ
ترے نام لکھا، ترے نام رہا۔

قصے تو بہت مغروری کے
تھے عام بہت تاریخوں میں
ہاں ایسی خجالت کا لمحہ
مرقوم نہ تھا، موجود نہ تھا۔

کس قوم کو زخم دیئے تو نے
جو تجھ سے محبت کرتی تھی
جو پھانسی کوڑے کھاتی تھی
وہ کب یہ پرواہ کرتی تھی
محلوں میں رہیں
ریشم پہنیں
گلیاں بیچیں
مخمل پہنیں۔

تو نے تو تپتے جذبوں کو
طغیانی سمجھ کے چھوڑ دیا۔

تری بانجھ خیالی کم نہ ہوئی
تری زردیوالی کم نہ ہوئی
اب رونا کیا، افسوس بھی کیا
اب نیند میں ات کو چلنا کیا!

احمد ندیم قاسمی کے نام!

تم عیسیٰ ہو
کہ بدھا ہو کہ خسرو ہو۔
میری عمر کے سنگی ساتھی جیسے ہو
مجھ سے چھوٹی عمر کے ہم سخنوں
کے جیسے ہو۔

تم پارس ہو
ہم نے تم سے سیکھی
ہیرے جیسی سچائی۔
تم گوہر ہو
تم ہی سیپی
ہم نے چاہا
ہم تم جیسے ہو جائیں۔

تم دریا ہو
گہرا دریا

جس کو چھو کے ہم نے پیاس کو پہنا۔
تم خوشبو ہو
ہم سب کلیاں، دامن بھر کے
اس لیے یہ چاہیں
تم جیسے بن جائیں

ہمارے زمانے کے اہل قبور! اس کو پڑھ لیں

(اسلام آباد کے حوالے سے)

وہ جو حد امکاں سے باہر کھڑے تھے،
زمانے کی تاریخ میں مقبرے، ان کے ناموں سے
موسوم، موجود تھے
طلسمات عقل و خرد سے ورا
ماسوا کے تحیر گرفتہ
وہ جو لامکاں کو مکاں جانتے تھے
زمانے کی تاریخ میں ان کے حجرے
مقامات وارفتگی و محبت نشاں ٹھہرتے ہیں۔

زمانہ محبت کی جتنی دستاویز اٹھائے ہوئے ہے
وہ سب کی سب،
ایسے حجروں کی دہلیز پہ جاگتی ہیں۔
مگر اس زمیں پر، بہت اونچے اونچے
پرانے زمانے کے محلوں سے بھی خوبصورت

نئے سنگ مرمر کے پیکر بنے مقبرے ہیں
جہاں جانے والے
محبت نہیں، فائلوں کی ضعیفی کے لاشے اٹھائے ہوئے
مردہ قدموں سے اندر کی جانب تو جاتے ہیں
پر، لوٹتے ہی نہیں
لوگ ایسے مقابر محض دیکھنے کو بھی جاتے نہیں
کہ ان مقبروں میں نہ سچ ہے، نہ تاریخ
اور نہ محبت۔
منافق زمانے کی سازش
ستونوں سے لپٹی کھڑی ہے۔
یہاں سچ کہیں ہے تو بس
چوبداروں کی آنکھوں میں ہے
کہ دیکھیں جنھوں نے حکمران جوتوں پہ
لٹکی زبانیں
کہیں گردنوں کا ستونوں سے
لپٹا ہوا واہمہ بھی نہ تھا
حرف تھے!
جو کہ میّت زدہ کاغذوں پر برہنہ پڑے تھے۔

20 اکتوبر (مرتضیٰ کے قتل پر)

آج کی رات صحن میں
سرخ گلاب کھِل اٹھے۔
موسمِ گل بھی دور تھا، ابرِ بہار بھی نہ تھا
شامِ شفق کے نطق پہ زہرِ عذاب بھی نہ تھا
آئی کہاں سے رنگ کو چھیدتی سرخ رو ہوا
آئی کہاں سے موت کو تولتی کشتی گھٹا۔

سب ہے خبر تو ذکر کیوں
اشک کی سروری بھی کیوں
کیوں ہیں حواس لب کشا
کاسہ نم نمی بھی کیوں

کہدو کہ یونہی مارنا
رسم ہے شہرِ شاہ میں

کہدو کہ جھوٹ بولنا
رسم ہے شہر شاہ میں
سب کو کہو کہ اب کفن
عام رکھو کہ کیا خبر
کون گلی میں نامہ بر
سرخ گلاب لیکے پھر
آن کھڑا ہو راہ میں!

بوری میں بند لاش میری تھی

میری آنکھ کھلی جس گھر میں
اس کی اونچی طاق پہ رکھی رحل میں تھا
جزدان میں لپٹا وہ قرآن شریف۔
کہ جس کو صبح سویرے
گھر کے سارے جی اور سارے بچے
خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔
پھر انگریزی پڑھنے، سکولوں کو
بستے لے کے جاتے،
کہیں نہ پاتے
کفر کے فتوے
کہیں نہ پاتے ایسی خبریں۔
پولیس تمہارے گھروں میں گھس کے
تم کو پکڑنے آجائے گی
میّا روتی رہ جائے گی

میری آنکھ کھلی جس گھر میں
اس کی گلی میں سارے بچے
ایک ہی ماں کے جائے لگتے
ایک ہی آنگن سب گھر لگتے
سب بانہیں عزت بنتی تھیں
سب آنکھیں غیرت بنتی تھیں۔
یہ بھی خبر تھی

انگریزوں کے جاسوسوں نے
بلوہ کرانے کی کوشش میں
خود کو گھائل کر کے
خود ہی شور مچانا عام کیا ہے۔

میری آنکھ کھلی جس گھر میں
اس کے صحن میں صبح سویرے
چڑیوں اور بچوں کی آوازیں
گونجا کرتی تھیں
پھولوں اور باتوں کی خوشبو سے
آنگن مہکے ہوتے تھے۔

میری آنکھ بجھی جس گھر میں

اس میں وقت تعلق
رشتہ، جذبہ کچھ بھی نہ تھا
کوئی دیا اور کوئی دعا
آنچل میں نہ تھی
کوئی ردا اور کوئی صدا
آنگن میں نہ تھی
بس بوری تھی اور میں تھی۔

بے تعلقی کے زلزلے کے بعد

تمہیں یوسف سی رنگت کے جزیرے میں
تمنا آئینہ، کوئی محبت آشنا
چہرہ نہیں ملتا
کوئی بازار بھی ایسا نہیں
جس میں تمہارے جسم کی مہکار سے
لپٹی زلیخا
چاشنی مانگے محبت کی،
رفاقت کی۔

مجھے معلوم ہے اس جھیل میں
اپنے ہی سائے سے تمہیں
باتوں کی عادت ہے۔
انہی باتوں کو خوشبو آشنا کرتے
کسی چہرے کو دعوت دو!

پریس فوٹوگرافرز اور ڈیانہ

اس دیس پھرو، اس دیس پھرو،
ہر دیس میں ایک سی خلقت ہے۔
وہ لمحے ڈھونڈتی پھرتی ہے
جن لمحوں کو تم سب سے الگ
سب سے چھپ کر
بس اپنے ہاتھ پہ رکھی ہوئی
اک بوند محبت کے
پاکیزہ نم کو پہنے
اتراتے ہو، خوش ہوتے ہو۔

ہر دیس میں ایک سی خلقت ہے
یہ خلقت اتھری خلقت ہے،
یہ چاہے ہے
ترا خواب کٹورہ، دنیا کے کونے کونے میں
رنگ لکھے

اور پیاس لکھے ترے آنگن میں۔
ترے ہاتھ میں پھول بھی دیکھیں تو
اس شوہ میں رہیں
یہ کس کی عنایت،
کس کی توجہ،
کس کی خواہش،
کس کے خواب زکوٰۃ کی بارش ہے۔

ہر دیس کی خلقت خود ڈھونڈے
تحقیر تماشہ تصویریں اور تحریریں
ہاں عورت ہونا جرم سوا
لذت بھی سوا، تحقیر سوا
وہ شاہزادی، ... حاکم زادی [1]
سب ایک صفت ہی کہلائیں۔
سب خلق تماشہ بن جائیں
وہ ڈیانہ ہوں کہ ہوں پروین [2]

۱۔ لیڈی ڈیانہ ۲۔ نغزہ بھاول کیس ۳۔ پروین شاکر

مرنے پہ بھی
اس خون ہلاکت کا قصہ
لذت کے کفن میں لپٹا رہے
ہاں عورت ہونا جرم سوا
اس جرم کی تعزیریں ہیں بہت
اس جرم کی تفسیریں ہیں بہت
ہر دیس میں ایک سی خلقت ہے۔

عبوری شہوار

تم کو کہنا تھا
کوئی تازہ کہانی کہتے
رسم دنیا سے وراء حالِ زمانی کہتے
یہ بھی کیا ہے، وہی فرعون عمل
تم بھی بنے
تم بھی تو جبر کی تائید لیے
ہم سے تسلیم تماشہ کا حوالہ چاہو
کچھ نہ چاہو تو بھی برداشت کا رشتہ چاہو۔

ہم نگوں سار، پشیمان تھے
پھر بھی چپ تھے
سوچتے تھے مسیحا نفسی ختم نہیں
پھر کسی بام سے نکلے گا وہ خورشید کہ پھر
فیلِ بے چہرہ کو چھپنے کا نہ موقع دے گا
ہم سزاوارِ تمنا کو بھی مژدہ دے گا

تم زمیں زاد ہو
کہتے ہو کہانی لیکن
قرضِ وحشت بھی وہی
حرفِ ملامت بھی وہی
کاسۂ خواب میں تعبیر کا مژدہ بھی وہی
چھپ کے راتوں کو چلے آنے کا قصہ بھی وہی
سارے بہلاوے وہی
ساری ادائیں بھی وہی
تم کو کہنا تھا
کوئی تازہ کہانی کہتے۔

عدلیہ دری

زمانہ وہ آیا
کہ بالشتیوں نے
تماشہ گروں کو بھی حیراں کیا۔
شاہ سواروں کو نعلوں کی میخوں میں ٹھونکا
وظیفہ بدستوں کو تعویذ خواہش کی میزان میں
حسبِ منصب فروزاں کیا۔
سولیاں گاڑ دیں صرف ان کے لئے
جن کی گردن کو جھکنے کی تحقیر کی
سنگ زاوی کا ملکہ نہ تھا۔

زمانہ وہ آیا
کہ افعی نے ناموس کی خشت رکھی۔
بدلتے رہے فیصلے
جیسے رنگِ طبق

مناجات ہوتی رہیں
صرف ان کے لئے
جو اطاعت کی دہلیز پہ
صف بہ صف، دست بستہ
نمازِ تمنا ادا کرتے کرتے
[illegible] میں کھڑے تھے۔

فروکش ہے عدالت

مری بستی میں باداموں کے پودے تھے
مگر میں نے کبھی پھولوں کی رنگت کو نہیں دیکھا
مری بستی میں جھیلیں تھیں
مگر میں نے کبھی بھوری چٹانوں کے
جھلکتے سائے کی مانویت کو
اپنی آنکھوں میں نہیں پہنا

مجھے کچھ دوست کہتے تھے
اجڈ لگتے ہو
وحشت پیر میں پہنے
کبھی پتھر پہ ٹھہری کائی
بہ کے تھام لیتے ہو

اسی وحشت میں اک کالا عمامہ
میرے کندھوں پہ ٹھہر کے
مجھ سے کہتا ہے۔
"سزا، تسبیح کی صورت
تمہارے ہاتھ میں ہر وقت رہتی ہے۔
تمہیں زردائے چہروں پہ لکھی خواہش کو
پڑھنے کی کبھی فرصت نہیں ملتی
پناہیں مانگتے چہروں کو تکتے ہو۔
تو ہنستے ہو، اجڈ لگتے ہو۔"

تمہیں کیا علم
میرے اس عمامے کے تہور میں،
ہر اک تحریر میں،
صندل سی خوشبو کے زروزیور
چمکتے ہیں۔
کوئی گل رو، عمامہ زیب تن کر کے
صدف ہونٹوں سے کچھ بولے۔
وہ میرے سامنے ٹھہرے
تو میں پوچھوں
"تمہیں کس نے کہا تھا۔
یوں وکالت پڑھ کے میرے سامنے آؤ۔

بحث کے نام پہ
اپنے لبِ لعلیں کو مہکاؤ
کھڑی ہو سامنے ایسے
کہ وہ محراب پہ
ٹھہری ترازو بھی لرز جائے
میری نیت بدل جائے۔"
کہ میں "وحشت میں
پتھر پہ جمی کائی بھی جا کے
نوچ لیتا ہوں۔"

تجھے وداع کیا

دل و نگہ کے آسماں پہ
میں نے اپنے ہاتھ سے لکھا
تجھے وداع کیا۔
نمازِ دل ادا ہوئی
عروسِ حرف، رخصتی کے بوجھ سے گزر گئی
قیام کے تمام خواب
ریت بن کے مٹھیوں سے گر گئے
چراغ تھے وہ بجھ گئے
جو نام تھے وہ مٹ گئے۔

تجھے وداع کیا
سمجھ لیا کہ اب تو حرف بے زبان ہو گئے
سمجھ لیا کہ آئینے بھی بے نشان ہو گئے
سمجھ لیا کہ اب کے رنگ پیرہن بدل گیا
سمجھ لیا کہ رو کے جو غبار تھا نکل گیا

سمجھ کے بھی تو کیا ہوا!
جو داغ تھا وہ تارِ اشک سے نہ دھل سکا۔
جو نام تھا وہ ڈائری میں کاٹ کے بھی
سامنے دھرا رہا
نظر اُسی طرح سے بام پر جمی رہی۔
تپش، لہو کو روند کے بھی، جاگتی بنی رہی
یہیں کہیں خیال، اُپنے آپ سے کلام کے
سبھی ہنر سمیٹ کے
چاہتا ہے یہ کہے
تجھے وداع کیا۔

تعلق کی سیماب زمانی

تم اگر اچھے لگے تو
کیا ہوا رک جائے گی!
حرف کی سیڑھی پہ ٹھہرے
نام گل ہو جائیں گے!
چلمنوں سے جھانکتے تعویز بھی
گر جائیں گے!
وہ خزاں آلود پتے
جو تعلق کا گماں تھے
وہ زمیں ہو جائیں گے!
وہ سلیٹی رنگ کے ملبوس
تہہ ہو جائیں گے!
انگلیوں کے زمزموں سے
بے قراری ذائقہ پا جائے گی
چاندنی گھر آئے گی۔
تم اگر اچھے لگے تو!

کیا ستاروں سے وہ رستہ پوچھنے والے
کسی منزل پہ پہنچیں گے!
چراغوں کو سفر مل جائے گا!
آنکھ کو ناموس
حدت کو ردا مل جائے گی!
ناتراشیدہ حوالوں کو
سپر مل جائے گی۔
آسماں ڈھل جائے گا۔
خود کلامی کا ترازو۔
گفتگو بن جائے گا۔

تم اگر اچھے لگے تو
دوسراہٹ کا یہ موقع
کیا چراغوں کی طرح سے
رات بھر رہ پائے گا
یا ہوا کے دوش پر
اک یاد سا رہ جائے گا۔

یوں ہوا تو زخم بھی معدوم ہو گا
اور مکدّر زخم
تھوڑی دیر میں بھر جائے گا

سامنے ہی سامنے
بیٹھے ہوئے، سب نئے وعدے
نئے انکار
بن جذبات و وحشت
بن کہے ہی
اجنبی بن جائیں گے۔

تم اگر اچھے لگے تو
یہ نیا فقرہ
مسافت کی نئی پوشاک پہنے
سب چلے خیموں سے آگے
خلعت خواہش پہ
امیدوں کو ٹانکے
پھر وہی سودا لیے
چاند سے کہتا ہوا
تم اگر اچھے لگے تو!

خواب میں سفر

زمیں بدلی، فضا کا ذائقہ بدلا
مگر چہرہ نہیں بدلا
یہ عورت میرا چہرہ ہے۔
یہ عورت، دھوپ سے جلتے ہوئے
آنگن میں میرے ساتھ کھیلی ہے۔
یہ عورت، غم کی بارش میں نہائی
عمر کی ساری لکیریں پہن کے بھی مسکراتی
اور اپنے دکھ ہواؤں کو سناتی
سب میں خوشیاں بانٹتی
شبنم سی لگتی ہے۔

مجھے معلوم ہے اس کی سہیلی
اس کے گھر کی ایک کھڑکی ہے
جہاں وہ اپنی گزری عمر کی
ساری مہک، ساری ملاقاتیں سنبھالے ہے۔

وہ ساری سلوٹیں جو عمر نے چہرے پہ لکھی ہیں
وہ اس کھڑکی میں جا کے، سب کی سب تحلیل ہوتی ہیں۔
نکھر آتی ہے وہ لڑکی
کہ جس نے آرزو کے موتیوں کا ہار پہنا ہے۔

آئینے سے مکالمہ

اچھا تو یہ ہوتا کہ تجھے عشق نہ ہوتا
رہتا اسی بے پروا صبا کی طرح بے رنگ
معلوم کو بے وجہ تغافل میں پروتا
پھرتا یونہی چلمن کے تحیر میں گرفتہ
اس دیس یا پردیس
یا صحرا یا گلی میں۔

اس عشق نے تجھ کو تو نمائش سے اٹھا کر
دہلیز کی گردش میں مقید سا کیا ہے
دل میں کسی تعویذ کے کھلنے کی صدا نے
آواز کو پیکر میں مجسم سا کیا ہے
جن آنکھوں نے گفتار روایت ہی نہ کی تھی
ان آنکھوں میں اب شہر سا آباد کیا ہے۔

پھر بھی تجھے وارفتہ ادائی نہیں آئی
اب بھی تری پلکوں پہ چمکتا نہیں گوہر
بے چینیٔ جاں، رقصِ بگولہ نہیں کرتی
شب آگے گزر جاتی ہے، تجھ کو نہیں معلوم
اس دیس یا پردیس میں آنکھیں ہیں کہ جن کو
سونے سے سوا تیرے تصور کی طلب ہے۔

(بحر تبدیل)

یہ بھی خوش ہوتا
اگر عشق نہ کرتیں تم بھی
کچھ تو تنہائی جاں آکے دلاسے دیتی
کچھ وہی پیاس لیے چلتی تمہیں بانہوں میں
کچھ تو آنکھوں کو وضو کرنے کی خواہش رہتی
گھر کسی خواب کی خوشبو سے مہکتا رہتا
طاق میں رکھے دیے روز گواہی دیتے
بزم آراستہ ہونے کی گھڑی آتی ہے۔

مرہم عشق یہ کیسا ہے کہ ہر پہلو سے
آنچ آتی ہے کہ وہی جاں بلبی رزق رہے
شام کے نطق پہ وہ زہر نمی رزق رہے
بس رہے تو وہی زنجیر زنی دل میں رہے۔
ہاں مگر
عشق کرنے کی مسافت کی تھکن یاد رہے۔

سیلاب کے بعد

پانی کے ریلے پہ بہتا ایک ادھورا ہاتھ
مجھے بلاتا ہے اور کہتا ہے،
تم نے میرے کھیت سے پھوٹی بھوک سے
اپنے بدن کا لوچ سنوارا ہے۔
تم نے میری شاخ شاخ پہ رنگ چھڑکتے پتوں کی
انجیل پہ اپنے نام کا چہرہ دیکھا ہے۔
تم نے میری کوکھ کے انگاروں سے
اپنی شام سنہری لکھی ہے

وہ اک پیاس کہ جس کے قصے
ایڑی سے پھوٹے چشمے کی لوح بنے تھے۔
اب وہ پانی پیاس کی ہر سرحد کے
کروڑوں سالوں کی دہلیز سے آگے،
پھونس کے چھپر پہ بیٹھے،

کنچوں سے کھیلتے بچوں کو
یوں لپکے گیا ہے۔
جیسے اس کو یقیں ہے۔
مجھ کو تو بہتے پانی میں بھی
قبروں کا پتہ لگانا آتا ہے

تمہیں اب یہ تماشہ بھی بہت حیران کرتا ہے

تمہیں اڑتے ہوئے بادل کی صورت
دودھیا رشتے
کبھی بے چین کرتے تھے
کبھی یوں بھی کیا تم نے
کہ اپنے آپ کو دعوت پہ بلوایا
مقابل خالی کرسی کو
گلابی پتیاں باتوں کی دیکر
خود ہنسے اور کھڑکیوں میں آئینہ رکھ کر
تروتازہ چلے آئے۔

کبھی ضد تھی تمہیں
کہ نسبتِ الفت
کوئی تہمت نہیں ہوتی۔
کہ اس لمحے
تمہیں ضد تھی

سمندر بھی کٹورے میں ٹھہر سکتا ہے
اور یہ آسماں
دہلیز کی تائید میں
قدموں کے نیچے ٹھہر جائیگا

زمیں اور آسماں
تعبیر اور تحریر میں ویسے ہی تھے
لیکن تمہاری ضد نے
تعبیرِ معانی کو بدل ڈالا
دلوں کی آرزو مندی، ہوا ٹھہری
مقابل خالی کرسی کے قریں
کوئی نہیں گزرا
محبت، تہمتوں کے پھول پہنے
آئینے کو دیکھتی اور مسکراتی ہے
تمہیں اب یہ تماشہ بھی
بہت حیران کرتا ہے۔

دو اینٹ کا حجرہ

مجھے پڑھنے کو بیٹھے ہو تو آنکھیں ہاتھ پر رکھ لو
کہو ہنستا ہوا تم نے کبھی بادل کو دیکھا ہے
کبھی بجلی کے دامن سے مہک پھوٹی ہے آنگن میں
سمندر ڈوب جانے کو کبھی دامن میں اترا ہے۔

مجھے پڑھنے اگر بیٹھو
تو پرچھائیں کو مت دیکھو
نہ دیکھو بجھتے انگاروں کی بھوبھل کو
کہ ان ہاتھوں سے شعلوں کی تمازت
حرف بنتی ہے۔
مرے ہونٹوں سے مردہ منظروں کو
لفظ ملتے ہیں۔
مری آہٹ کو سن کے
بادباں خواہش، سفر پہنے
مگر میں کون ہوں

آنکھیں
کہ صحرا، باد بے رونق
بدن پہ آبرو کی کہنگی کا زنگ ٹھہرا ہے۔
قدم، شوریدگی کی دلدلوں میں،
زخم خنداں ہیں۔
مجھے پڑھتے ہوئے
ہاتھوں پہ رکھی آنکھ بہہ نکلے
تو ہنس دینا۔

سچ آنگن کی مینا بولے!

ہے ری میّا!
تو نے مجھ کو برسوں پہلے
خواب دکھا کے
ہنس کے کہا تھا
اب ترے نام کی عزت ہو گی
اب ترے خواب گلاب بنیں گے
اب دنیا وہ ذہن بنے گی
جس میں عورت داسی بن کے
جھوٹا کھا کے
کسی بھی گھر اور کسی گلی میں
خوار نہ ہو گی

○

ہے ری میّا
آج بہت دروازوں پہ لٹکی تختی پہ
میرا نام لکھا ہے
میری بڑائی، میرے منصب، میری خاطر
سب کے ہاتھ میں پھول، علم ہیں
یہ کہوے ہیں اور لکھے ہیں
میری بڑائی، میرے منصب، میری خاطر
صف آرا ہیں
دروازوں کی تختی والے
ملکوں ملکوں جاوے ہیں
اور کہوے ہیں
جگ کی آدھی آبادی کو
کل یگ دیکھے، پیچھے چھوڑ کے
کہاں رہو گے
سب کہوے ہیں۔
سب سن لے ہیں۔

○

ہے ری میّا
اتنے برسوں بعد بھی
لاکھوں اور کروڑوں
پیاسے چہروں نے دیکھا ہے
وہی سڑک ہے، وہی ہے گھونگھٹ
اور سڑک پہ روڑے کوٹتی
وہی ہے عورت!

O

ہے ری متیا
میری کوکھ
یہ میری چتا
کس تختی پہ لکھے
کس دہلیز سے مانگے
کون عدالت جائے
انگوٹھے کی مہر پہ رخصت ہونے والی
بے نامی کے موت کنویں کی
چیختی عورت
کس کو حال بتائے

O

ہے ری متیا!
اتنے برسوں بعد بھی
میری چادر!
دھجی بن کے لٹک رہی ہے۔
تیر وہی ہیں
اور وہی دشنام تماشے
دھیرج بولوں تو بھی
میری ہونٹ کی پپڑی
ہاتھ کی ادھڑی کھال پکارے۔

O

ہے ری متیا!
سب سچے ہیں۔
سارے سیانے، سچ لکھے ہیں۔
پر متیا!
میں کاغذ کا پھول نہیں ہوں۔
میں کاغذ کی ناؤ نہیں ہوں
میرے سچ کو
کاغذ کی دنیا سے باہر لاؤ
ورنہ برسوں بعد بھی بیٹھی
یہی کہوں گی
وہی سڑک ہے، وہی ہے گھونگھٹ
اور سڑک پر روڑے کوٹتی
وہی ہے عورت!

طالبان سے قبلہ رو گفتگو

وہ جو بچیوں سے بھی ڈر گئے
وہ جو علم سے بھی گریز پا
کریں ذکر ربِ کریم کا
وہ جو حکم دیتا ہے علم کا
کریں اس کے حکم سے ماورا
یہ منادیاں

نہ کتاب ہو کسی ہاتھ میں
نہ ہی انگلیوں میں قلم رہے
کوئی نام لکھنے کی جا نہ ہو
نہ ہو رسمِ اسمِ زنان کوئی

وہ جو بچیوں سے بھی ڈر گئے
کریں شہر شہر منادیاں
کہ ہر ایک قدِ حیا نما کو
نقاب دو

کہ ہر ایک دل کے سوال کو
یہ جواب دو
نہیں چاہیے
کہ یہ لڑکیاں
اڑیں طائروں کی طرح بلند
نہیں چاہیے
کہ یہ لڑکیاں
کہیں مدرسوں، کہیں دفتروں کا بھی رخ کریں
کوئی شعلہ رو، کوئی باصفا
ہے کوئی تو صحنِ حرم ہی
اس کا مقام ہے۔
یہی حکم ہے
یہ کلام ہے

وہ جو بچیوں سے بھی ڈر گئے
وہ یہیں کہیں ہیں قریب میں
انہیں دیکھ لو، انہیں جان لو
نہیں ان سے کچھ بھی بعید
شہرِ زوال میں
رکھو حوصلہ، رکھو یہ یقین

کہ جو بچیوں سے بھی ڈر گئے
وہ ہیں کتنے چھوٹے وجود میں۔
کرو شہر شہر منادیاں
رکھو حوصلہ، رکھو یہ یقیں
کہ جو بچیوں سے بھی ڈر گئے
وہ ہی کتنے چھوٹے وجود ہیں۔
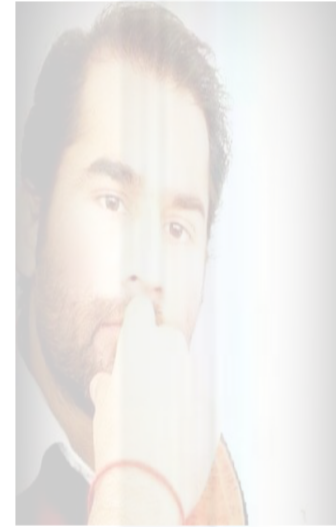
احتساب

پھر بگل بجا کے اب
قتل گاہ سجتی ہے
نام لے کے اک اک کا
سامنے بلاتی ہے
صفحۂ جرم سادہ ہے
ہاں سیاہی تازہ ہے
لو قلم لکھو اس پر
تم غلط، یہ ثابت ہے

O

شہر میں منادی ہے
جو زمیں کے بیٹے ہیں
وہ کلاہ غیرت کو
کج کریں، اماں پائیں
عدل کو گرو رکھیں
قرضِ منصبی پائیں

○

سولیاں یہ پوچھتے ہیں
ہم کہاں دکھائی دیں
ہم کسے گواہ کہویں
ہم سے گردنیں لپٹیں
جن کا خون ناحق تھا
ان کے لب سلے کیونکر
ہم پہ یہ بھی ظاہر تھا

○

پھر بہار آتی ہے
قتل گاہ سجتی ہے
آہٹیں کہ بڑھتی ہے
صفحۂ جرم سادہ کی
رنگتیں بدلتی ہیں
منصفوں کی آنکھوں کا
رنگ بھی بدلتا ہے
لو قلم لکھو اب تو
تم غلط، یہ ثابت ہے!

غزلیں

وہ جس سے گفتگو اچھی لگی تھی
اسی پہ چاندنی ٹھہری ہوئی تھی
بہت آسان تھا رستہ بدلنا
گرفت آرزو مشکل گھڑی تھی
سنبھل اے نامرادی زندگی تو
سخن آغوش لمحوں کی نمی تھی
مجھے پانی پہ چلنا آ گیا تھا
ہوا بانہوں میں لے کر چل رہی تھی
سفر بھی کیا قیامت کا سفر تھا
ارادوں کی کماں ٹوٹی ہوئی تھی
بظاہر آشنا لگتا نہیں تھا
میں جس کی آنکھ میں ٹھہری ہوئی تھی
ہوا تھا دربدر رہنا مقدر
میں رستہ بھول کے گھر آ گئی تھی

محبت خواب ہوتی جا رہی ہے
یہ شے کمیاب ہوتی جا رہی ہے
بہت شاداب تھا آغاز لیکن
سخن سیماب ہوتی جا رہی ہے
جو سوچا، وہ ہوا پہ لکھ دیا تھا
یہ خو بے آب ہوتی جا رہی ہے
شفق کو دیکھ کر، دل سوچتا ہے
یہ حد، ایجاب ہوتی جا رہی ہے
پہنے کو بدن کافی نہیں تھا
طلب، سیلاب ہوتی جا رہی ہے
وہ جگنو سے تقاضے اور بلاوے
حکایت، خواب ہوتی جا رہی ہے
وہ خوش قامت، خزاں قسمت ہوا ہے
تھکن، القاب ہوتی جا رہی ہے

رات کے پرندوں کے گیت

تراجم

مجھے اس آگ میں منڈیلا نظر آرہا ہے

شاعر: جان مشکزئی جنوبی افریقہ

آپ کو اب انتظار نہیں کرنا پڑے گا اس وقت تک
جب تک کہ آسمان کی نیلاہٹیں ہویدا ہوں۔
آپ مڑ کر دیکھیں
اوپر اور نیچے، نئی روشنیاں جگمگا رہی ہیں۔
آسمان نے وحشتوں کے رنگ بہت دفعہ پہنے ہیں
بہت صدیوں تک زمین، اذیتوں میں مبتلا رہی ہے
اور اب، امن سرزمین پر
سچ کی صدیاں اتر رہی ہیں
یہ سچ، یہ صدیاں
نئی روشنی کی بہار دکھائینگی
یہاں پر ارد گرد آگ ہے
یہ جگہ گرم ہے
میں گرم ہوں
اور میں بہت آرام سے ہوں

یہ اس شخص کی زندگی کے باعث ہے
کہ جو آسمان میں نئی روشنیاں تحریر کرنے آیا ہے
وہ سارے زمانے جب نفرتیں شعلہ زن تھیں
ان اندھیروں نے تو آسمان کی نیلاہٹوں کو بھی
نقاب پوش کر دیا تھا۔
اور اب آنے والے زمانوں میں بھی
جہاں ابھی بھی کالا دھواں چمنیوں سے اٹھ رہا ہے۔
یہ شخص آسمان میں اپنے کارنامے تحریر کرنا چاہتا ہے۔

یہاں پہ اردگرد آگ ہے
یہ جگہ گرم ہے
میں شعلہ زن ہوں
اور میں پُر جوش ہوں

یہ خاموشی کے تحفظ کے لئے نہیں ہے
کہ اس شخص نے اپنے ہاتھ رہنمائی کے لئے آگے بڑھائے ہیں
اس شخص کے حرفوں کی قوت فضا میں لہراتی ہے
اس شخص کی آنکھوں کی قوت سے آسمان جگمگاتا ہے۔
بے صبری سے انتظار میں گزرنے والے ساون کی پیاس بجھ رہی ہے

آنگنوں میں ٹھہرے دھوئیں کو صاف کرنے کا عزم لئے آگے بڑھا ہے۔

یہاں پہ اردگرد آگ ہے
کوئی قید خانہ اس آگ کو
اس شخص کو اندر سے بھسم نہیں کر سکا ہے۔
مجھے یہ آگ منڈیلا نظر آ رہی ہے

دیوار کی بخیہ گری

شاعر: رابرٹ فراسٹ

یہاں کچھ ایسا ہے
کہ جو دیوار کو پیار نہیں کرتا ہے
کہ جو زمین پہ جمی برف کی باطنی تہہ کو زمیں دوز کرتا ہے
اور چمکتی شفافیت کو سورج سے ہمکلام کراتا ہے
اور ایسا خلا قائم رکھتا ہے
کہ دونوں حلاوتیں، آمیز ہو سکیں۔

شکاریوں کا کام کچھ اور چیز ہے
میرا کام ان کے بعد شروع ہوتا ہے۔
انہوں نے محض ایک پتھر پہ دوسرا پتھر نہیں جمایا۔
بلکہ شکاری کتوں کے لپکنے کے لئے
خرگوشوں کو ڈربوں سے نکال کر چھوڑ دیا ہے۔
یہ ایک ایسا خلا ہے کہ جس کے بارےمیں
نہ کبھی دیکھا، نہ سنا
مگر بہار کی استراحت کے زمانے میں

ہم اسے موجود پاتے ہیں
میں اپنے ہمسایوں کو کہساروں سے آگے کی باتیں بتاتا ہوں
اور ایک دن ہم ملتے ہیں
حدِ فاصل کے خط کو کشید کرنے
اور دیوار کو اٹھانے کے لئے۔
ہم رستے کے دونوں کناروں پر دیوار قائم رکھتے ہیں
تاکہ ان ستونوں کو تھاما جا سکے جو ایک دوسرے پر گر رہے ہیں
ان میں سے کچھ روئی کے پیڑوں جیسے ہیں اور کچھ گیند نما
ہمیں انہیں متوازن رکھنے کے لئے ایک مچان بنانی پڑتی ہے
"وہیں ٹھہرو! جہاں کہ تم ہو، جب تک ہم اپنی کمر موڑیں۔"
ان کو سنبھالتے ہوئے ہماری انگلیاں دکھ جاتی ہیں۔
یہ ایک اور قسم کا کھیل ہے
جو کبھی ایک طرف کو حد سے بڑھ سکتا ہے
اس جگہ ہمیں دیوار کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔
وہ ایک مکمل صنوبر ہے۔
اور میں — سیبوں سے بھرا باغ!
میں اسے بتاتا ہوں۔
میرے سیب کے درخت کبھی چل کر نہیں جائیں گے
کہ اس کے صنوبر کے ثمر کو چکھ سکیں۔
وہ صرف اتنا کہتا ہے

اچھی باڑیں اچھی ہمسائیگی نبھاتی ہیں۔
میرے اندر بہار، شرارت کی طرح سر اٹھاتی ہے۔
اور مجھے حیرت ہوتی ہے۔
کیا میں اس کے دماغ میں ایک نکتہ ڈال سکتا ہوں!
وہ اچھے ہمسائے آخر کیوں نہیں! آخر کیوں
کیا یہ نہیں ہوتا کہ کہیں یہ گائیں ہوتی ہیں
اور کہیں یہ گائیں نہیں ہوتی ہیں۔
میں دیوار بنانے سے پہلے یہ جاننا چاہوں گا۔
کہ دیوار کے اندر کیا ہے۔
میں آخر کس کو پناہ دینے والا ہوں۔
یہاں کچھ ایسا ہے
کہ جو دیوار کو پیار نہیں کرتا ہے۔
وہ دیوار کو منہدم دیکھنا چاہتا ہے۔
میں اسے شرارت کہہ سکتا ہوں
مگر یہ واقعی شرارت نہیں ہے۔
میں یہ باور بھی نہیں کرتا
یہ خود کلامی بھی ہو سکتی ہے۔
میں اسے وہاں دیکھتا ہوں۔
جہاں
اچھی باڑیں، اچھی ہمسائیگی نبھاتی ہیں۔

خاموشی

شاعر: چانگ سو کو۔ جنوبی کوریا

(۱)
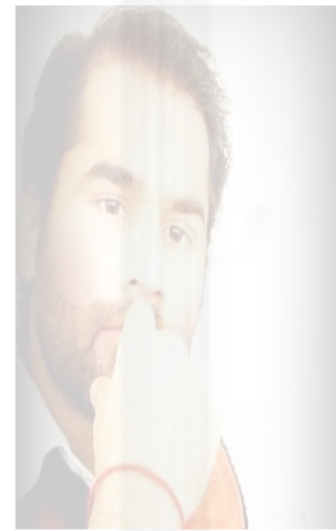
ہم ہر رات خاموشی کاشت کرتے ہیں۔
جب کچھ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں
اور چاندنی کی کچھ تاریں، انسانی آواز کا
پیچھا کرتی ہیں
تو ان کی بازگشت گونجتی ہے۔
ہماری نیم شب تاریکی میں۔
تب خاموشی اپنے ان گنت کان کھولتی ہے۔
جب ہم گہری نیند میں ہوتے ہیں۔
اور دنیا سے بے بہرہ ہوتے ہیں
تو خاموشی کسی کی دبی دبی چیخیں ہمیں سنواتی ہے۔
یہ چیخیں وہ آوازیں ہوتی ہیں جنہیں عام شخص
نہیں سن سکتا ہے
خاموشی ہمارے غموں کی پرورش کرتی ہے

کبھی کبھی خاموشی نامختتم سیمیں لکیر کی طرح ابھرتی ہے
جو افق کے ساتھ ساتھ ہلال کو آویزاں کیے
چلتی رہتی ہے

(2)

خاموشی اکثر اپنا وجود سروں میں تحلیل کرتی ہے
جو بے آواز ذہانت کے ساتھ دھڑکتی ہے۔
خاموشی کے ہالے کے گرد
وقت اور موسیقی بے چارگی کے ساتھ گھومتے ہیں۔
وہ خاموشی کا ہالہ
جس کے مرکز میں ناقابل بیان تصورات ہوتے ہیں
ہماری آہیں اس کی مملکت میں
بے آواز ہو جاتی ہیں۔
ہمارے الفاظ اکثر مستند آوازوں کو بھروسہ دینے کے
متحمل نہیں ہوتے ہیں
خاموشی ہی ہمیں کبھی کبھی بتاتی ہے
کہ کب، بس ایک دفعہ
انسان خدا کے قریب کھڑا ہوا تھا۔
ہر چند موسیقی ابد سے متعلق
ہمارے تمام تصورات کو ختم کر دیتی ہے
خاموشی بلا جھجک انگشت نما ہوتی ہے

اس مقام کی جانب
جو ہماری ستارہ شناس دنیا میں
موجودہ نہیں ہوتا ہے۔
مگر خاموشی کی مٹھی میں ابھی اس خون کے قطرے ہیں
جو اڑے تھے
ہجرت کرنے والے پرندوں کی ناواقف اڑان سے
یا اکیلی چڑیا کے بدن سے
جس نے اپنے ہی سائے کو مقابل وجود جانا
اور دیوار سے ٹکرا کر ڈھیر ہو گئی تھی۔

طلسم آئینہ

شاعر: چانگ سوکو۔ جنوبی کوریا

میرے قریں اک ایسی دنیا ہے
جسے میری شاعری تحریر نہیں کر سکتی ہے
جہاں فنکاروں کی اداکاری اور
شکاریوں کی نشانہ بازی تحلیل ہو جاتی ہے۔
یہ آئینہ ہے جو آواز اور تصویر
مسکراہٹ اور مکالمہ — سب کچھ ہی
خاموشی سے محفوظ کر لیتا ہے۔
کبھی کبھی میں ساری رات آئینے کے مقابل
بیٹھتا ہوں
تیز ہوا میں پتنگ اڑاتے ہوئے
میں ڈور کو بڑی مضبوطی سے پکڑتا ہوں
آدھی مگر گہری رات کے بیچ
میرے گھر میں موجود فرنیچر اور دوسری اشیا
کبھی الگ اور کبھی جھرمٹ میں
محو پرواز ہوتی ہیں۔
میں صبح کی سپیدی نمودار ہونے تک
جاگتا ہوں اور انتظار کرتا ہوں
اس جھرمٹ کی واپسی کا،
بالکل اس طرح جیسے میرے بچپن کے آسیب
مجھے ستاتے تھے تو لگتا تھا
ستاروں بھرا آسمان گھومتا ہوا
دور چلا جاتا ہے؟
جیسے کہ بچے اور منظر
دونوں وقت کی حدود سے باہر نکل جاتے ہیں۔
مجھے جھولے پہ ایک مسکراتی ہوئی لڑکی کی
جھلک نظر آتی ہے۔
مجھے نظر آتے ہیں پتوں پہ گرتی چمکتی
پھوار کے قطرے جو بہتے چشمے کی
قربتوں کا عکس ہیں۔
مجھے نظر آتے ہیں
وحشی درندے جو ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے ہیں
وہ نیلگیں سمندر جس نے بچپن میں
مجھے حیران کیا تھا
وہ چاندنی رات میں اپنی رعنائیاں ارزاں کرتا ہے

اور کسی اندھیری دشا سے ایک چیخ سنائی دیتی ہے۔
مگر کوئی ہے جو دونوں دنیاؤں کے درمیان
سفر میں رہتا ہے
جو میرے کانوں میں تسلیاں سرگوشیوں کے انداز میں
پہناتا ہے
جو دیکھتا ہے کہ
مخملیں باوں والے ہاتھ
پردے گراتے ہیں
اور دونوں جہانوں کے درمیان
پڑنے والی دراڑوں کو بھرتے ہیں۔
یوں تو ہماری غنودگی ہی کاری
زخم بھرنے کو کافی ہوتی ہے
میں جیسے ہی آنکھیں وا کرتا ہوں
تین چڑیلیں معدوم سمت کی جانب
جاتی نظر آتی ہیں
اور دکھاتی ہیں اپنے جیسے ہیولے
جو نامعلوم زبان میں محو عبادت ہیں،
ایسے عالم میں، آئینہ میری پناہ بنتا ہے
کہ دیوانہ فنکار اپنے آسیب میں محو ہو جائے
پھر یہ دنیا میری خود فراموشی کو لمحہ بھر کے لئے

لنگر انداز کرے
آئینہ میرے اور میرے دن کے درمیان
اس طرح حائل ہوتا ہے
جیسے وہ دنیا ہو جس میں ہم پیار تو
کرتے ہیں، مگر ایک دوسرے کو
پیار کرنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں
یہی وہ مقام ہے جہاں مجھے
وہ لوگ ملتے ہیں
جن کی آنکھیں تشکر سے بھیگی ہوتی ہیں۔

آج شام —— میرا ذہن

شاعر: چانگ سوکو- جنوبی کوریا

آج کی شام
میرے ذہن میں بہت سے گمشدہ نام ابھرتے ہیں
وہ نام جو میری زندگی میں آئے
مگر ڈوبتے ستاروں کی طرح معدوم ہو گئے
آج کی شام
میرے ذہن میں بہت سریلے گیت ابھرتے ہیں
وہ گیت جو مضراب سے پھوٹتے تھے
وہ مضراب جنہیں میری انگلیاں
توڑ سکتی تھیں۔

لفظوں کی طلسم بہاری

شاعر: چانگ سوکو- جنوبی کوریا

(I)

جس طرح ہوا سوکھے ہوئے پتوں کے ڈھیر پہ
اپنا جلوہ دکھاتی ہے
اس طرح لفظ ہماری ذہنیت کے عکاس ہوتے ہیں
وہی عکس جو کسی قسم کی پھڑپھڑاہٹ سے
مٹ نہیں سکتے۔
کچھ لفظ تو چمگادڑوں کے نہ مٹنے والے
سایوں کی طرح چپک جاتے ہیں
ہم نے کئی دفعہ ان لفظوں کے چہروں پہ
خون کے چھینٹے دیکھے ہیں۔
جو ہمارے دریچوں کے اندر جھانک رہے ہوتے ہیں۔
کچھ لفظ اس طرح تکلیف دیتے ہیں۔
جیسے شفق رنگ میں نہلایا ہوا چشمہ
تکلیف دہ لگتا ہے۔
وقت کے زخمائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر
اپنے لفظ یاد آتے ہیں۔

کبھی کبھی تو لفظوں سے
وقت کی آواز نکلتی سنائی دیتی ہے۔
اور کبھی کبھی لفظ، وقت کی تپش سے
جھلس جاتے ہیں۔
وقت ہمارے لفظوں سے گریزاں ہو کر
ان کے حوالوں کو اس قدر مسخ کرتا ہے
کہ وہ کسی سجاوٹ یا روشنی کے دائرے میں
نہیں آتے ہیں۔
لفظ ہمارے چہروں کو مسخ کر دیتے ہیں۔
انہیں وقت کی حدود کے نیم دائروں سے
باہر کر دیتے ہیں۔
لفظ گہری مایوسیوں میں لپٹی کراہیں
ہماری سمت بھیجتے ہیں
جو وادیوں میں بے تعلق بستے لوگوں
جانوروں اور گھروں کو
اندھیرے اور دھوئیں سے بھر دیتی ہیں۔
اور تمام رات
ہم آنکھوں، سینے اور ذہن پہ چپکے
لفظوں کو کھرچتے رہتے ہیں
کچھ لفظ ہماری روح ہیں
زخم کی طرح دہکتے رہتے ہیں۔

(11)

لفظوں میں مصدقہ آوازیں نہیں ہوتی ہیں
لفظ جن کی جانب اشارہ کناں ہوتے ہیں
وہ طائر بھی ہماری سمت محو پرواز نہیں ہوتے ہیں۔
کبھی کبھی خاموشی ہمیں اس سمت لے جاتی ہے
جہاں انسان، خدا کے قریب ترین ایستادہ ہوتا ہے
جب خاموشی قیام کرتی ہے
تو روشنی کے جلو میں ایک آواز ابھرتی ہے۔
لفظ ہماری لا محدود تمناؤں کے
نہ جھاگ بنا سکتے ہیں نہ بیان کر سکتے ہیں۔
لفظ یہ بھی بیان نہیں کر سکتے ہیں کہ
ہمارے زوال کی کہانی ختم ہونے والی نہیں ہے۔
یہ اڑتے پرندوں کی کہانی بھی نہیں ہے
کہ جو کہیں ختم تو ہوتی ہے۔
تکلیف دہ الفاظ!
میری نیند سے بوجھل اور جاگتی آنکھوں میں بھی
چبھتے ہیں۔
ہم وضاحتوں اور تعریفوں کی کلیت اور اہمیت
پر زور دیتے رہتے ہیں
مگر جب یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے
تب ہماری اپنی آواز کے لئے

کوئی مقام نہیں رہتا ہے۔

(III)

کچھ لفظ ہمارے دکھوں کو
ہم سے زیادہ خوش سلیقگی سے
سنبھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔
ہر چند کہ لفظ ہماری عصری ہزیمت کے تواتر کو
نہیں روک سکتے ہیں۔
ہاں وہ ہمیں ایک حد تک محصور کر سکتے ہیں۔
جیسے ہماری نمازیں، ہمارے روحانی سفر کو
تصوراتی سنہری چڑیوں کی پرواز میں تحلیل
کر سکتی ہیں۔
ہر چند کہ لفظ ہماری لا محدود ہزیمت کو روک
نہیں سکتے ہیں
لفظ پھر بھی محفوظ کر سکتے ہیں
ان خون کے قطروں کو
جو چمن بدلتے پرندوں نے کھیتوں پر سے گزرتے ہوئے
وار دیے تھے
یا اس اکیلی اڑتی چڑیا کے سائے کو
جو دیوار سے ٹکرا کے مر گئی تھی۔
پانی میں بہتا چاند تمہاری روحانیت
کی تطہیر کرتا ہے۔

تمہاری طلسماتی روحانی تطہیر کے باعث
چڑیوں کی چہکار اور حشرات الارض
کے گیت بھی زمانی عصر سے اس طرح آزاد ہوتے ہیں
جیسے ڈوبتے سورج کے پاس
بہتے چشمے کا پانی!
تمہاری روحانی تطہیر!
ہمارے تخیلی استعاروں تک پہنچ جاتی ہے
اور ہمیں انسانی وسعتوں سے ماورا
تصوراتی پہنائیوں میں پہنچا دیتی ہے۔
بالکل اس طرح جیسے پرندے کے اندرون سینے کو
سرشاری کی صدا منور کر دیتی ہے۔
یہ سرشاری ہمیں تھوڑی دیر کے لئے
ابدیت کی حدوں تک لے جاتی ہے
تمہارا طلسم ہماری شاعری کو
اس پھول کی طرح بنا دیتا ہے
جو اپنے ہی شعلوں میں امر ہو جاتا ہے
تمہارا طلسم ہمیں اپنی حدوں سے
ماسوا کر دیتا ہے۔
اور قبل از وجود کے دھندلے تصورات کو
ماہیت بخشتا ہے۔
تمہارے طلسم کے باعث
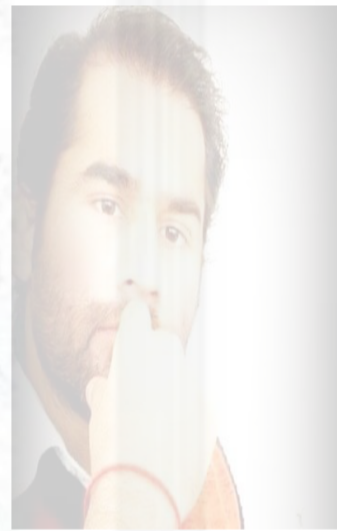
ہم کبھی اندرونی قید سے رہا ہوتے ہیں
کہ جو ہمارے قبائلی خطوط نے مسلط کر رکھی ہے۔
ہم روزمرہ زندگی کے لمحات کو
اس منظر نامے کی پوشیدگی کے حصار میں
دیکھتے ہیں
جو ڈوبتے فرد کی آنکھوں کے گرد گھومتا ہے۔
ہمارا مبہم سا خیال ہے کہ ہمارے بہترین لمحات
وہ ہوتے ہیں جن کی جانب ہم بہت کم
دھیان دیتے ہیں
جیسے گرمی میں ٹھنڈی ہوا
جیسے صبح سویرے کان میں پڑنے والی آواز
جس کو ہم نہیں جانتے۔
کہیں نہ کہیں کسی مرکزی خیال
یا زبان کے دائرے میں
ہم کئی منظروں کی تفہیم نہیں کر سکتے ہیں۔
یہ ہمارے ذہن کا دباؤ ہے جو معصوم
تسلسل کے باوجود
لفظ در لفظ تعلق کو سمجھنے سے منکر ہے۔
ہمارا ذہن، نامعلوم قوتوں کی کارکردگی کو
دیکھنے سے، اس وقت انکار کرتا ہے۔
جب تمہارے لفظ میرے چہرے پہ روشن ہوتے ہیں۔

ہرچند ہمارے الفاظ، اپنی ہی تسخیر کو
بیان نہیں کر سکتے ہیں۔
ان الفاظ میں کہیں وہ آوازیں شامل
ہوتی ہیں جن کو گئے عمریں بیت گئیں
اور وہ بھی کہ جن کو ابھی آنا ہے۔

(۶۷)
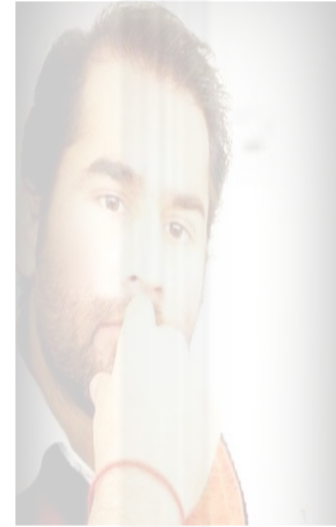
آؤ لفظوں کو کاشت کریں
اسی بے چینی اور دل فگاری کے ساتھ
جو اندھیاتے آسمان میں
چند بے چین اڑانوں کے بعد
غائب ہو جاتی ہے۔
اسی دل فگاری کے ساتھ
جیسے مچھیرا اپنا جال
اپنی حدوں کی انتہا تک پھینکتا ہے۔
ہمیں قطعی مایوس نہیں ہونا چاہیے
ابھی تو دنیا میں خاصی تجریدیت ہے
جو ہمارے وجدان کو جگا سکتی ہے
ابھی دنیا میں تتلیوں کے پروں کی
وہ پھڑپھڑاہٹ زندہ ہے
جو آسمانوں میں تحریر کڑواہٹوں کو
مندمل کرتی ہے۔

یہ سارے الفاظ
یہ سارے تصورات
نئے دلپذیر معانی کے ساتھ
ہمیں اب بھی رلا سکتے ہیں۔
ہمارا ذہنی افق
مبہم تمناؤں کا مسکن رہتا ہے۔
ہم ذرا سا اپنا رویہ تبدیل کریں تو
جاتے لمحے بھی لوٹ آتے لمحے لگتے ہیں۔
کاش ایسا ہو کہ کوئی سُر آ کر جگمگا دے
ہمارے درختوں پہ لٹکے لفظوں کو
کوئی سُر آ کر جگمگا دے
ان لفظوں کو جن تک ہمارے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے ہیں۔
اور یوں ہو کہ یہ سارے لفظ
ہماری ناسمجھی کی آغوش میں آن گریں
اس طرح جیسے سرشاری ہماری روح کو مسرور کرتی ہے
یہ بھی ہو کہ کوئی نغمہ یا کوئی خامشی
ہمارے اندرونی تصورات کو گھٹن سے آزاد کرائے
اور ایک آزاد، زندگی سے بھرپور، دھڑکتا ہوا
منظر نامہ تخلیق ہو جائے۔
تاکہ ہمارے لفظ پھول کی طرح کھل جائیں
اور اپنی بے معنویت سے باہر آ جائیں۔

ترتیب

لبِ گویا

بے نام مسافت

نظمیں

گلیاں، دھوپ، دروازے

ملامتوں کے درمیاں

غزلیں

شب زندانی ہوں

طویل نظم

دو نظمیں

نثری نظمیں

سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ

خیالی شخص سے مقابلہ

باداموں کے درختوں کے سفید رومال

(آزاد نظمیں)

غزلیں

رات کے پرندوں کے گیت

(تراجم)

۱۔ سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ
۵۔ خواتین افسانہ نگار (1930-1990)
۶۔ عورت خواب اور خاک کے درمیان
۸۔ آجاؤ افریقہ
۹۔ بُری عورت کی کتھا
۱۱۔ عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک
۱۳۔ میں پہلے جنم میں رات تھی
۱۴۔ Women Myth & Realities
۱۵۔ The Scream of An Illegitimate Voice
(Selection of Poems)

Rs. 900.00
www.sang-e-meel.com